اُردو

انجمن ترقی اُردو کا سہ ماہی رسالہ

ایڈیٹر

عبدالحق بی۔اے (علیگ)

آنریری سکریٹری

انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (دکن)

اردو

۱ - یہ انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ جنوری ، اپریل ، جولائی اور اکتوبر میں شایع ہوا کرتا ہے —

۲ - یہ خالص ادبی رسالہ ہے جس میں زبان اور ادب کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر بحث ہوتی ہے - حجم کم از کم ڈیڑھ سو صفحے ہوتا ہے —

۳ - قیمت سالانہ محصول ڈاک وغیرہ ملاکر سات روپے سکۂ انگریزی (مع محصول ڈاک وغیرہ آٹھ روپے سکۂ عثمانیہ) —

۴ - تمام خط و کتابت مولوی عبدالحق صاحب بی اے ، آنریری سکریٹری انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (دکن) سے ہونی چاہیے —

(باہتمام محمد صدیق حسن منیجر انجمن اردو پریس ' اردو باغ اورنگ آباد دکن میں چھپا اور دفتر انجمن ترقی اُردو سے شایع ہوا)

اردو

حصہ ٦١	جنوری سنہ ١٩٣٦ ع	جلد ١٦

انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ

اورنگ آباد (دکن)

اردو

فہرست مضامین

بابت جنوری سنہ ۱۹۳۶ ع

تعالی

شاعر

(یہ ولولہ انگیز قطعہ سر محمد اقبال مدظلہم نے یونیورسٹی سوسائیٹی حیدرآباد کی درخواست پر اپنے قلم سے لکھ کر ارسال فرمایا اور انجمن موصوف کے جلسے ۲۶ نومبر سنہ ۳۵ء میں پڑھ کر سنایا گیا) :-

مشرق کے نیستاں میں ہے محتاجِ نفس نے
شاعر! ترے سینے میں نفس ہے کہ نہیں ہے؟

تاثیر غلامی سے خودی جس کی ہوئی نرم
اچھی نہیں اُس قوم کے حق میں عجمی لے

شیشے کی صراحی ہو کہ مٹی کا سبو ہو
شمشیر کی مانند ہو تیزی میں تری مے

ایسی کوئی دنیا نہیں افلاک کے نیچے
بے معرکہ ہاتھ آئے جہاں تختِ جم و کے

ہر لحظہ نیا طور، نئی برقِ تجلی
مرحلۂ شوق نہ ہو طے !

سر سید احمد خاں مرحوم کی مجوزہ ورنیکلر یونیورسٹی

از

ادیٹر

سر سید مرحوم کو ابتدا سے اپنے ملک کے علمی اور تعلیمی مسائل سے گہرا لگاؤ تھا اور جہاں کہیں وہ رہے انہوں نے اشاعت تعلیم میں مقدور بھر کوشش کی اور خود بھی اپنی تالیف و تصنیف کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس سے ملک کو بہت فائدہ پہنچا اور خیالات میں مغربی تعلیم کی طرف سے بہت کچھ تغیر پیدا ہوا' جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں - اسی شوق اور انہماک کا نتیجہ تھا کہ سائنٹفک سوسائٹی علی گڑہ اور محمڈن اینگلو اورینٹل کالج قائم ہوا —

اس کے علاوہ سنہ ۱۸۶۶ ع میں ایک انجمن برٹش انڈین ایسوسی ایشن کے نام سے قائم کی جس کا مقصد یہ تھا کہ " ہندوستانیوں کو گورنمنٹ سے اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے پارلیمنٹ سے تعلق پیدا کرنا چاہیے - ایسٹ انڈیا کمپنی کی عملداری میں بڑی دقت ہندوستان کو یہ تھی کہ اُس کے تقریباً تمام معاملات صرف کورٹ آف ڈائرکٹرز تک پہنچتے تھے اور پارلیمنٹ سے بہت کم تصفیہ پاتے تھے ۔ مگر اب حکومت ہندوستان کی

ملکۂ معظمہ نے اپنے ہاتھہ میں لے لی ہے اور اب ہندوستان کے امورات کو زیادہ تر پارلیمنٹ سے تعلق رہے گا - پس اس غرض کے لیے کہ پارلیمنٹ کے ممبر ہمارے حالات اور معاملات سے بخوبی واقفیت حاصل کریں' ہم کو ایسی تدبیر کرنی چاہیے جس سے ہم اپنے صحیح حالات اور مناسب خواہشوں سے ان کو مطلع کرسکیں اور جس طرح اُن انگریزوں نے جو ہندوستان میں رہتے ہیں ایک ایسوسی ایشن انگلستان میں قائم کرنی چاہی ہے اسی طرح ہم بھی تمام اضلاع شمال مغرب کی طرف سے ایک ایسوسی ایشن اپنے ملک میں قائم کریں اور اس کے ذریعہ سے اپنے تمام مطالب اور مقاصد گورنمنٹ اور پارلیمنٹ تک پہنچائیں "—

چنانچہ اس انجمن کے توسط سے بہت سی شکایتوں اور تکلیفوں کا تدارک ہوا - لیکن سب سے اہم اور قابل قدر تحریک ورنیکلر یونیورسٹی کی تھی جو سر سید نے اس کی وساطت سے سنہ ۱۸۶۷ ع میں گورنمنٹ میں بھیجی -

اس درخواست یا تحریک کا لب لباب یہ تھا - اول یہ کہ اعلیٰ درجے کی تعلیم عام کا ایک ایسا سررشتہ قائم کیا جائے جس میں بڑے بڑے علوم اور فنون کی تعلیم دیسی زبان کے ذریعہ سے ہوا کرے - دوم یہ کہ دیسی زبان میں انہیں مضمونوں کا امتحان سالانہ ہوا کرے جس میں کہ اب طالب علم کلکتہ کی یونیورسٹی میں انگریزی زبان میں امتحان دیتے ہیں - سیوم یہ کہ جو سندیں اب انگریزی زبان کے طالب علموں کو علم کی مختلف شاخوں میں لیاقت حاصل کرنے کے عوض میں عطا ہوتی ہیں وہ ہی سندیں ان طالب علموں کو عطا ہوا کریں جو انہیں مضمونوں کا دیسی زبان میں امتحان دے کر کامیاب ہوں - چہارم یہ کہ خواہ تو ایک اردو فریق کلکتہ کی یونیورسٹی میں قائم کیا جائے یا ممالک شمالی و

مغربی میں ایک یونیورسٹی دیسی زبان کی علحدہ قائم کی جائے —

حیرت ہوتی ہے کہ اُس زمانے میں جبکہ انگریزی تعلیم کا آغاز تھا سرسید کو دیسی زبان کی یونیورسٹی قائم کرنے کا خیال پیدا ہوا - اس سے اُن کی روشن خیالی اور دوراندیشی کا پتا لگتا ہے - یہ وہ خیال ہے کہ برٹش انڈیا میں اب بھی لوگ اسے پیش کرتے ہوے جھجھکتے ہیں -

ہم یہاں اُس عرضداشت کی جو نواب گورنر جنرل بہادر باجلاس کونسل کی خدمت میں پیش کی گئی تھی، پوری نقل درج کیے دیتے ہیں اس کے پڑھنے سے معلوم ہو گا کہ سر سید نے اپنی تحریک کی تائید میں کیسی مدلل اور معقول بحث کی ہے - یہ دلائل اب بھی ویسے ہی قوی اور لائق غور ہیں جیسے اُس وقت تھے —

مسودہ

عرضداشت برٹش انڈین ایسوسی ایشن اضلاع شمال و مغرب

بحضور جناب نواب گورنر جنرل بہادر، باجلاس کونسل،

ہم برٹش انڈین ایسوسی ایشن اضلاع شمال و مغرب جن کی دستخط اِس عرضداشت کے ذیل میں ثبت ہیں بدل و جاں گورنمنٹ کی اِن سخت کوششوں سے بخوبی واقف اور اُن کی قدر و منزلت کرنے والے ہیں جو اس نے ہندوستانیوں کی عام تعلیم کے باب میں کی ہیں اور ان کی عوض میں ہم سب پر گورنمنٹ کی نہایت بڑی احسان مندی واجب اور لازم ہے - ہم کو اچھی طرح یقین ہے کہ گورنمنٹ نے اس تعلیم کے کام کو نہایت خالص نیت اور بالکل بے غرضی سے اختیار کیا ہے - تعلیم سے گورنمنٹ کا اصلی مقصود بالکل لوگوں کی بہبودی اور فلاح ہے - وہ اپنی رعایا کی حالت کو ترقی دینے کے باب میں ہمیشہ ساعی رہتی ہے —

اِس یقین کے مستقل اثر سے جو تمہارے دلوں پر اچھی طرح نقش پذیر ہوگیا ہے پیشگاہ حضور میں ایسی چند تدبیریں پیش کرنے کے لیے ہماری ڈھارس بندھی ہے جس کا عمل درآمد ہو جانے پر ہم کو کامل بھروسہ ہے کہ اِس موجودہ سررشتہ تعلیم سے لوگوں کو حد سے زیادہ فائدہ حاصل ہوگا اور ہم کو بہت بڑی توقع ہے کہ گورنمنٹ کمال فیاضی سے اِن تدبیروں پر اربس سنجیدہ اور پسندیدہ توجہ فرمائے گی —

ہم اقرار کرتے ہیں کہ جو علوم و فنون اب ایشیا کے ملکوں میں جاری ہیں جن کے موضوع اور تاریخی حالات ہمارے بہت سے مشہور مصنفوں کی کتابوں میں موجود ہیں اور اپنی اصل حالت میں بغیر کسی طرح کے تغیر و تبدل اور ترقی کے ہم تک پہونچے ہیں اُن میں سے اکثر ایسے اصول پر مبنی ہیں جو زمانۂ حال میں علم کی ترقی ہونے سے بالکل غلط اور ناجائز ٹھہرے ہیں اور بعضے علم ایسے ہیں کہ اگرچہ بنیاد اُن کی صحیح اور مضبوط اصول پر ہے مگر زمانہ حال کی نئی نئی تحقیقاتوں اور تلاشوں کے سبب سے ان کا رنگ ڈھنگ بالکل بدل گیا ہے اور بعضے علم ایسے ہیں کہ اب تحصیل ان کی محض فضول اور غیر مروج ہوگئی ہے - اور برخلاف اس کے آج کل دنیا میں بہت سے ایسے علوم و فنون کی گرم بازاری ہے جو زمانۂ حال کے ایجاد ہیں اور ان کا حال ہمارے بزرگوں کو بالکل معلوم نہ تھا- پس یہ ایک ایسی بات ہے جس سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا کہ ایشیا میں جو علوم اور زبانیں اب جاری ہیں اُن کی تحصیل ہمارے علم کی ترقی اور روشن ضمیری کے واسطے محض غیر کافی ہے اور یہ بات بھی ایسی ہی تحقیق اور مسلم ہے کہ مذکورہ فائدہ کے حاصل کرنے کے واسطے کوئی ذریعہ اِس سے بہتر نہیں ہے کہ ہم انگریزی زبان کو

سیکھیں اور اب جو مالامال خزانے علم و ھنر کے زمانۂ حال میں جمع اور قائم ھوے ھیں ھم سب اِس بات پر اتفاق رکھتے ھوں کہ گورنمنٹ کی جو تدبیر اس ملک میں انگریزی زبان کے رواج دینے کی ھے وہ حقیقت میں نہایت عمدہ اور مناسب سوچی گئی ھے —

مگر یہ بات ممکن ھے کہ جس حالت میں ھم ایک اچھے کام کرنے پر کوشش کرتے ھوں تو ھم اور ایسے کاموں سے جو زیادہ ضروری اور زیادہ مرتبہ کے ھیں غافل رھویں اور اسی طرح سے ان کوششوں کی قدر و منزلت کو گھٹا دیویں جن کو اگر مناسب اور بلا رو رعایت کے کیا جاے تو ھم کو وہ نہایت اعلیٰ درجہ کی کامیابی پر پہنچاویں - ھم خیال کرتے ھیں کہ یہ غلطی تعلیم کے سررشتۂ حال میں ھوئی ھے - ھماری بڑی آرزو یہ ھے کہ یہ سررشتہ ایسا بے عیب اور بے داغ ھوجاے جیسا کہ حوصلہ توقع میں سما سکتا ھے اور ھم اس بات کا خیال کرنے سے باز نہیں رہ سکتے کہ ھم ایک اچھے کام کے پورا کرنے پر کمر باندھے رھنے سے ایسے مطلبوں سے غفلت کر رھے ھیں جو بہت بڑی قدر و منزلت رکھتے ھیں اور ضروری ھیں —

جو گورنمنٹ خصوصاً انگریزی گورنمنٹ اپنی رعایا کے بہت سے گروھوں کو عام تعلیم دینے کا کام اختیار کرے تو اُس کا فرض ایسے علم و پند اور نصیحت کی تعلیم دینا ھے جو لوگوں کے روز مرہ کے کاروبار میں کام آوے اور فائدہ بخشے اور اس سے ان کی عادت اور اخلاق کی تہذیب اور اصلاح ھووے اور لوگوں کو قدرت اور علم کے حقائق اور حالات سے جہاں تک ممکن ھو آگاھی حاصل ھو اور ان کے دلوں میں عمدہ عمدہ اصول اور بڑے بڑے اعلیٰ درجہ کے خیال پیدا ھوویں - مگر اس بات کی احتیاط رھے کہ ان اصولوں اور خیالوں کی اصل و بنیاد کسی مذھب کے

مسائل یا کسی قومی مذہبی رسم و رواج پر نہ ہووے بلکہ وہ قدرتی اخلاق کے قوانین اور علی العموم عقل کے تسلیم کرلینے پر مبنی ہو - یہ کام مشکل تو بیشک ہے مگر غیر ممکن نہیں اور اگر اُس کو کامیابی کے ساتھہ انجام دینے پر کوشش کی جاے تو نتیجے اُس کے ملک کے حق میں نہایت عمدہ ہوں - چنانچہ لوگوں کی عقل کے روشن ہونے سے ان کی مال و دولت اور جسمانی فائدوں کو ترقی ہوگی جب کہ وہ اُن سب چیزوں کی ماہیت سے جو ان کے چاروں طرف نظر آتی ہیں واقف ہو جائیں گے اور ایسے فاسد خیالوں اور بیہودہ خوف و اندیشوں کو آیندہ فوراً اور یک بیک قبول نہ کرلیا کریں گے جس سے لوگوں کی طبیعتوں کو پریشانی حاصل ہوتی اور سب میں ایک ہل چل پڑ جاتی ہے اور عام امن و آسائش اور انتظام میں خلل واقع ہوتا ہے علاوہ اس کے جو نفرت اور عداوت نسل اور مذہب کی غیریت سے پائی جاتی ہے وہ قدرت اور عقل کی روشنی کے آگے نیست و نابود ہو جاے گی اور بجاے ان سب کے آپس میں لحاظ و پاس اور بھروسہ قائم ہو جاے گا -

جو گورنمنٹ سواے ان غرضوں کے اور کسی قسم کی اور شاید اس کمتر خواہش کے سبب سے اپنی رعایا کی تعلیم پر آمادہ ہو کہ ان کو صرف اس قدر تعلیم کیا جاے کہ وہ اپنی زندگی کے معمولی کاروبار کے انجام دینے کے لائق ہو جائیں تو وہ گورنمنٹ رعایا کے ساتھہ اس سے زیادہ کچھہ نہیں کرے گی جو ایک آدمی اپنا بوجھہ کھنچوانے یا اور کوئی کام لینے کی غرض سے کسی جانور کے ساتھہ اس کے سدھانے میں کرتا ہے مگر ہم کو دل سے یقین ہے کہ گورنمنٹ ہند کی یہ غرض اور ایسا ارادہ نہیں ہے بلکہ اس بات کو ہم تحقیق جانتے ہیں کہ اس نے جو کام تعلیم کا اختیار کیا ہے وہ بڑے بڑے اعلیٰ درجے کے مقصدوں اور ارادوں سے

شروع کیا ہے چنانچہ اس کا مشہور عمدہ ثبوت وہ تین یونیورسٹیاں یعنی مدرسہ ہاے اعظم ہیں جن میں علی‌العموم علم تک ہر ادنیٰ و اعلیٰ کی دسترس ممکن ہے - اس لیے ہم اپنی گورنمنٹ کو اس بات کے تصفیہ پر متوجہ کراتے ہیں کہ جو سرشتہ تعلیم کا آج کل سرکار کا درست اور قائم کیا ہوا موجود ہے وہ اس قابل ہے یا نہیں کہ اُس سے تعلیم کے اصلی مقصد جن کا تذکرہ بالاجمال اُوپر ہوا حاصل ہوویں ہم نیاز مندی سے عاجزانہ عرض کرتے ہیں کہ ہماری راے میں اس سرشتہ سے وہ مقصد حاصل نہیں ہوں گے - سرشتہ مذکور کے ذریعہ سے چودہ کروڑ آدمیوں میں جو گورنمنٹ ہند کے محکوم اور مطیع ہیں چند آدمیوں کو ایک عمدہ اور معقول تعلیم کے تمام حظ اور لطف اور فائدے حاصل ہوے ہوں مگر جب کہ بہت سی خلقت کا ان چند تعلیم یافتہ سے مقابلہ کیا جائے تو ان کی تعداد نہایت بے حقیقت اور خفیف ٹھہرتی ہے کیونکہ خلقت کے اس انبوہ کثیر کو روشن ضمیری حاصل ہونا تو ایک طرف روشن ضمیری کا پرتو بھی اس پر نہیں پڑا ہے - غرض کہ ملک باعتبار ھئیت مجموعی اپنی اصل تاریکی کی حالت میں ہے اور اس نے علم اور شائستگی کے کسی فائدہ کا مزہ نہیں چکھا - ہم عرض کرچکے ہیں کہ اس عرض داشت کے پیش کرنے سے ہمارا یہ مقصد نہیں ہے کہ ایشیا کے مردہ علوم وفنوں، شائستگی اور خوبی کو تر و تازہ کیا جاے بلکہ اصل غرض یہ ہے کہ پچھلے زمانوں میں اہل یورپ نے جو علم و ہنر بہم پہونچایا ہے اور وہ زیادہ عمدہ اور مفید ہے اس کا رواج ملک میں ہووے - سوا اس کے ہماری خواہش یہ ہے کہ بجاے چند آدمیوں کے گروہوں کے گروہوں کو فائدہ پہونچے، اخلاق پسندیدہ اور قومی دانائی کی نعمتیں تمام ملک پر پھیل جائیں —

بالفعل بڑے بڑے علموں سے صرف زبان انگریزی کے ذریعہ سے واقفیت حاصل ہوسکتی ہے اور یہی بات ایسی ہے جس کے سبب سے ملک میں مفید علموں کے عموماً جلد شایع ہونے میں بڑے بڑے موانع اور ہرج واقع ہوتے ہیں اور اسی کے باعث سے لوگوں کی رائے اور خیالات میں بہتر تبدیلی ہونے میں توقف ہوتا ہے اور عام تعلیم مضمحل اور پژمردہ ہوگئی ہے اور چند لوگ ایسے ذریعہ سے جس تک رسائی مشکل ہے اس علم کے ثمروں کو حاصل کرسکتے ہیں جس تک سب کی رسائی آسان اور سہل ہونی چاہیے۔

یہ جو حال تعلیم کا ہو رہا ہے اس کا باعث یہ نہیں ہے کہ لوگ انگریزی کی تحصیل سے گریز یا نفرت کرتے ہیں۔ جن وقتوں میں لوگ انگریزی کی تحصیل سے گریز یا نفرت کرتے تھے ہم کو یقین ہے کہ وہ زمانہ ایسا گذر گیا کہ پھر کبھی نہ آے گا، انگریزی کی ضرورت اور اس کے فائدوں کو لوگوں نے اچھی طرح سمجھا اور دیکھا اور علانیہ اقرار کیا ہے اور ان میں سے اکثر نے اپنی رایوں کو اپنے ہم وطنوں کی بڑی بڑی شاندار مجلسوں میں اس امر کی نسبت ظاہر کیا ہے — چنانچہ ہم خاص ایک شخص یعنی سر سید احمد خاں صدر الصدور علی گڈہ کے قول نقل کرتے ہیں "خاص کر میں تمہاری توجہ اِس بڑی ضرورت پر مائل کرنا چاہتا ہوں جو انگریزی کی تحصیل کرنے سے اہل ہند کو ہے اِس کی تحصیل اُن بڑے فائدے بخشنے والے عہدوں کے باعث سے ضروری نہیں جو اِس کے سبب سے حاصل ہوتے ہیں بلکہ ان بے نہایت فائدوں کے سبب سے ضروری ہے جو زندگی کے روزمرہ کے ذرا ذرا سے کاروبار میں بھی ہوتے ہیں چنانچہ انگریزی کا پورا علم ہم کو اس بات کے قابل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے ملک کے قوانین کو بخوبی سمجھہ سکیں جو گورنمنٹ کے ایکٹوں اور

روئیدادوں معمولی میں ظاہر ہوتے ہیں ، اور تجارت کامیابی کے ساتھہ کرسکیں اور اہل یورپ کے ساتھہ ربط و ضبط بڑھا سکیں اور بہت سے علوم و فنوں میں جن کی بحث بہت قابلیت سے انگریزی زبان میں ہے کامل ہو سکیں "۔

تعلیم جو اب ترقی کرنے سے تھکی ہوئی ہے اس کی اس حالت کے اور بھی کئی باعث ہیں جن میں سے سب سے بڑا باعث یہ ہے کہ صرف انگریزی کی تحصیل کے ذریعہ سے جیسے کہ اب مروج ہے علی العموم ہر ایک طالب علم باستثنائے بعض طالب علموں کے علم کے اس قدر درجہ یا اخلاق اور تربیت کے اس قدر مرتبہ کو نہیں پہونچتا یا اس کی ذات سے ظاہر نہیں ہوتا جس کی لوگ تعظیم اور تکریم حرص و تقلید کریں یا جس سے ان کے والدین کو یہ معلوم ہووے کہ انہوں نے نہایت اعلیٰ درجہ کی تعلیم پائی ہے البتہ سیکڑوں میں سے ایک کا اُس درجے کی عظمت تک پہونچنا ممکن ہے جس کی بڑی خواہش کی جاتی ہے مگر ایسے طالب علموں کی تعداد بہت خفیف اور تھوڑی ہے ، اور ہزاروں جاہلوں پر جو ان کے گرد و پیش موجود ہیں کچھہ اثر ان کا نہیں ہوتا - اس نقصان کے علاج کی غرض سے ہم اپنی تجویزیں پیش کرنے کے آرزو مند ہیں - ہماری خواہشیں یہ ہیں کہ جو کوششیں انگریزی زبان کی اشاعت کے لیے بالفعل کی جاتی ہیں وہ جاری رہیں بلکہ اُن کو وقتاً فوقتاً ترقی ہوتی رہے - مگر ایک اور طریقہ تعلیم کا جو عام تعلیم کی ترقی کے لیے زیادہ موثر تصور کیا جاتا ہے قائم اور جاری کیا جائے ، اور اس کے ذریعہ سے انگریزی زبان کو بجائے بہت تھوڑے آدمیوں کے بہت سے لوگوں کو فائدہ پہونچانے کا وسیلہ بنایا جائے - جو طریقہ ہم تجویز کرتے ہیں وہ تعلیم کے طریقۂ مروجہ سے گو علیحدہ اور غیر ہو مگر اس سے مخالف نہیں ہے - نتیجہ دونوں کا انجام کو ایک ہی حاصل ہوگا -

وہ طریقہ یہ ہے کہ بجائے اس بات کے کہ صرف انگریزی ہی زبان میں تعلیم کی جائے دیسی زبان کو بھی تعلیم کے اعلی درجے کے مضمون اور مطالب میں لوگوں کی تعلیم و تربیت کا ذریعہ گردانا جائے —

بادی النظر میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس تجویز کا ایک مدت ہوئی تصفیہ ہوچکا مگر ہم اس کے سخت مخالف ہیں کیوں کہ ہم جو کچھ تجویز کرتے ہیں اس پر کبھی مباحثہ تک بھی نہیں ہوا ہے - جس بات کا تصفیہ ہوچکا وہ یہ ہے کہ انگریزی زبان کا رواج اس ملک میں ہونا چاہیے یا مشرقی زبانوں کا ، اور مشرقی زبانوں میں جو فضول علم و ہنر مندرج ہیں ان کی تحصیل کو ترقی اور رواج دیا جائے یا نہیں - جو تصفیہ اس امر کا ہوا اس سے ہم کو بخوبی اتفاق ہے وہ تصفیہ ہر طرح سے مقبول اور پسندیدہ ہے مگر جس تجویز کو ہم گورنمنٹ اور لوگوں کی غور و فکر اور تصفیہ کرنے کے واسطے پیش کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ جس حالت میں ہم انگریزی کی تعلیم قائم رکھیں اور اس کی ترقی میں کوشش کریں تو کیا ہم کسی دیسی زبان کو اس قسم کا ذریعہ اختیار اور تجویز نہیں کرسکتے جو ایک غیر ملک کی زبان کی نسبت علم کے عموماً شائع ہونے اور لوگوں کے خیالات اور طور و طریقے اور اخلاق کی ترمیم کے واسطے زیادہ تر مناسب ہو - کیا اہل یورپ کی رو شنضمیری اور شائستگی اور فضل و کمال کی تعلیم ایسی زبان کے ذریعہ سے جس سے وہ نا آشنا ہیں اور وہ ایک غیر ملک کی ایسی زبان ہے جس کی تحصیل ممکن نہیں کہ ہندوستان مقبوضۂ سرکار کے چودہ کروڑ باشندے کرلیویں بہتر اور علیحدہ نہیں ہوسکتی ہے ؟ یہ ممکن نہیں کہ ان کروڑوں آدمیوں کو ایک ہی زبان اور وہ بھی نئی سکھائی جاسکے - یہ کب ہوسکتا ہے کہ ہم خدا تعالی کی اس قدرت کے

بر خلاف عمل کرسکیں جو بابل کے منار پر اُس نے دکھائی - پس اگر یہ بات ممکن نہیں تو بجز اس کے اور کوئی علاج اور تدبیر نہیں کہ اهل یورپ کی روشن ضمیری اور ان کا علم اور فضل لوگوں کے علی العموم سکھانے کے لیے دیسی زبان کو ذریعہ تھہرایا جاے - جو معقول رائیں کہ هاگسن صاحب نے هندوستان میں علم پھیلنے کے لیے ایک جلسہ کی بنیاد پڑنے پر ظاهر کیں ان کا ذهن نشین کرنا نہایت مناسب اور بہت اچھا هے - چنانچہ انہوں نے فرمایا هے کہ میرے نزدیک اگر هم کتابی ترتیب کے ذریعہ سے هندوستان کو فی الحقیقت فائدہ پہونچانا چاهیں تو وہ هم کو اسی طرح پر پہونچانا چاهیے جس طرح کہ هم اس کو اپنی حکومت اور اپنے قوانین سے پہونچاتے هیں یعنی کتاب کے علم کو جھگڑوں اور دقتوں سے پاک صاف اور عام فہم کرکے ان کی خاص زبان سے اس کو هم رشتہ اور هم پیوند کردیں تاکہ بہت لوگوں کی رسائی اس تک هونے لگے اور انہی مقصدوں کو اصلی اور مستحکم سمجھہ کر ان کی تہذیب اور تربیت کو اپنا بڑا منشا قرار دیویں - علم کی اس طرح پر تعلیم کیجاے کہ وہ روز مرہ کے کام میں آئے اور فائدہ بخشے اور اس کی تحصیل میں هر قسم کی آسانی کرنی چاهیے جب کہ یہ سب مری خواهشیں هیں تو میں علم کی تحصیل کے واسطے زبان کے ذریعہ کو اس لیے ازبس ترجیح دیتا هوں کہ اول تو طالبعلم کو اس میں بہت سی آسانی هوتی هے ' دوسرے اس کی یہ خاصیت هے کہ جو علم اس زبان کے ذریعہ سکھایا جاتا هے اُس کا اثر عمل میں بہت قوی اور مفید هوتا هے علاوہ اس کے اس میں ایک بڑی خوبی یہ هے کہ اس کے ذریعہ سے علم خوب شائع هوتا هے —

اگر علم کی تحصیل غیر ملک کی زبان کے ذریعہ سے کی جاے تو اس میں دو چند وقت صرف هوتا اول تو خود زبان هی کے سیکھنے میں وقت

خرچ ہوتا ہے اور اس کی تحصیل میں ہزاروں طالبعلم اس قدر وقت کھوتے ہیں کہ پھر اس زبان کے ذریعہ سے جس کو انہوں نے حاصل کیا ہے کسی مفید علم کی تحصیل کرنے کے واسطے وقت باقی نہیں رہتا ہے بہت تھوڑے طالبعلم ایسے ہوتے ہیں جو بخوبی علم تحصیل کرلیتے ہیں - دوسرے علم کی تحصیل خاص علم کے فائدوں کے لحاظ سے ضروری ہوتی ہے اور شاذ و نادر ایسے طالبعلم پائے جاتے ہیں جن کو زبان اور علم دونوں کے تحصیل میں کامیابی حاصل ہو - مگر جب کہ اس کے دیس کی زبان میں علم کی تحصیل کیجاتی ہے تو طالبعلم کا کچھہ بھی وقت ضائع نہیں ہوتا - اور یہ بات تحقیق ہے کہ ان مضمونوں سے اس کو کچھہ کچھہ آگاہی ہوگی جن پر اس کی رسائی اس حالت میں کہ وہ زبان جس کے ذریعہ سے ان مضمونوں کو حاصل کیا غیر ملکی ہوتی اگر غیر ممکن نہ ہوتی تو جیسا کہ اکثر ہوتا ہے نہایت مشکل ضرور ہوتی —

ہم نہایت ادب کے ساتھہ عرض کرتے ہیں کہ ان لفظوں سے کہ تعلیم دیسی زبان کے ذریعہ سے ہونی چاہیے ہماری یہ مراد نہیں کہ ایشیا کے علوم و فنون پھر سر و تازہ کیے جائیں اور ان کی تعلیم ہو بلکہ ہم صرف اس بات کے خواستگار ہیں کہ جو علوم و فنون بالفعل یورپ میں مروج ہیں اُنہیں کو شایع کیا جاوے کیونکہ بجز اس کے ہماری اور کوئی غرض نہیں ہے کہ اہل یورپ کی طرح روشنضمیری تمام ہندوستان میں عموماً پھیل جائے -

دو کالج اب ایسے موجود ہیں جن کی سند ہم اپنی تجویز کے مفید ہونے کی تائید میں پیش کرتے ہیں - ایک تو تامسن سول انجنیرنگ کالج رورکی اور دوسرا میڈیکل کالج آگرہ کی شاخ اردو رورکی کالج کے انگریزی اور اردو فریقوں میں سے ہر ایک کو ایک ہی قسم اور ایک ہی درجے کے علم

سکھائے جاتے ہیں یعنی جن کتابوں کی تحصیل اردو فریق کے طالب علم کرتے ہیں وہ کتابیں بالکل اُن کتابوں کا ترجمہ ہوتی ہیں جو انگریزی طالب علموں کے استعمال میں ہوتی ہیں۔ امتحان کے سوالات دونوں فریق کے یکساں ہوتے ہیں ایک بند سوالوں کا انگریزی میں اور دوسرا اردو میں دیتے ہیں جو انگریزی کا ٹھیک ترجمہ ہوتا ہے امتحان کے نتیجے بھی ایک ہی قسم کے ہوتے ہیں کبھی اردو فریق والے کا طالب علم انگریزی فریق اپنے ہم سر سے بہتر نمبر حاصل کرتا ہے اور کبھی انگریزی طالب علم اپنے ہم سر اردو کے طالب علم سے سبقت لے جاتا ہے۔ دونوں فریق کے طالب علموں کو مساوی فائدے حاصل ہوتے ہیں صرف وہ ذریعہ مختلف ہوتا ہے جس سے وہ علم کی تحصیل کرتے ہیں۔ علاوہ اس کے میڈیکل کالج آگرہ میں یہ بات معلوم نہیں ہوتی ہے کہ اردو کے طالب علم اپنے انگریزی کے ہم سر طالب علموں سے ان مضمونوں کے بخوبی تحصیل کرنے میں پیچھے رہ جاتے ہوں جو دونوں کو ایک ہی معین حد تک یکساں طریق پر سکھاتے ہیں —

پس اگر دیسی زبان کو تعلیم کا ذریعہ ٹھیرایا جائے تو اسی درجے کا علم جس تک اب چند ایم۔اے کے سند یافتہ طالب علموں کو رسائی ہوتی ہے بے انتہا لوگوں کو حاصل ہونے لگے گا۔ اب جو سررشتہ تعلیم کا غیر ملکی زبان کے ذریعہ سے جاری ہے اُس کی بدولت طالب علم جس علم کو ایک مرتبہ حاصل کرتا ہے اُس کو وہ یونیورسٹی کے چھوڑنے اور زندگی کے معمولی کام کاج میں مصروف ہونے کے بعد جلد بھول جاتا ہے اور جلد اس کے ذہن سے وہ علم اُتر جاتا ہے۔ مگر جو طریقہ ہم نے تجویز کیا ہے اُس کے ذریعہ سے جو علم ایک مرتبہ حاصل ہو جائے گا صرف وہی باقی اور برقرار نہیں رہے گا بلکہ علم کے تحصیل کا ذریعہ اس معمولی زبان کے ہونے سے جس میں ہر وقت اس کے

خیالات ظاہر اور پیدا ہوتے ہیں وہ علم طالب علم کی استعداد اور قابلیت کی مناسبت سے ہمیشہ ترقی اور شگفتگی پاتا رہے گا —

اس بات کا خیال کرنا بے جا ہے کہ دیسی زبان کے ذریعہ سے اعلیٰ درجہ کی تعلیم کرنا انگریزی زبان کی اشاعت کو مضر اور ہارج ہوگا۔ کیوں کہ یہ کہنا بھی تو اسی طرح سے صحیح نہیں ہے کہ نہر اور سڑکوں دونوں کا ایسے مقاموں میں بنانا جہاں دونوں کی ضرورت ہے مضر اور ایک دوسرے کا مخالف اور مانع ہوگا حالانکہ یہ دونوں کام ایسے جداگانہ ہیں کہ اپنی ذات سے ہر ایک فیض بخش ہے۔ اور ایک دوسرے کا ہارج اور مزاحم نہیں۔ انہیں وجوہات سے تعلیم کا انگریزی میں ہونا ایسے دو متفرق کام ہیں کہ دونوں ایک اچھے نتیجے کے مدد و معاون ہیں۔ حقیقت میں وہ دونوں دو جدا جدا آلے ایک ہی قسم کے نتیجوں کے حاصل کرنے کے لیے ہیں۔ ہم کو کچھ شبہ نہیں بلکہ اچھی طرح یقین ہے کہ اگر اہل یورپ کے علموں اور ان کے نتیجوں کی تعلیم دیسی زبان کے ذریعہ سے کی جائے تو اس سے انگریزی زبان کی تحصیل کرنے کی خواہش پیدا ہوگی اور ہندوستانیوں میں انگریزی کے عموماً پھیلنے میں اُس سے بڑی مدد ہوگی۔ بالفعل ہندوستانیوں میں ان علموں اور فضل کی تعظیم و تکریم بہت سی نہیں ہے جو اہل یورپ کو حاصل ہیں اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یورپ کی تحصیل اور تحقیق اس سے برتر نہیں ہے جو ایشیا والوں کو پہلے حاصل تھی۔ اس کی یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی اہل یورپ کے علم و تربیت سے بالکل واقف نہیں ہیں۔ اور یہ ان کی ناواقفیت ایسی ہے کہ جب تک ان کو اس کے دور کرنے کا ذریعہ حاصل نہ ہوگا جیسا کہ اب تک حاصل نہیں ہے اس وقت تک وہ ناواقفیت قائم رہے گی۔ فرض کیا

جاے کہ ایک ہندوستانی کلکتہ بلکہ انگلستان کی کسی یونیورسٹی میں علم تحصیل کرکے گھر کو واپس آے اور ایم-اے یا ایل ایل-ڈی کی سند کے تمام اعزاز اُس کو حاصل ہوے ہوں لیکن جب وہ اپنے دوستوں سے گفتگو کرے گا تو جو علم اُس نے حاصل کیا ہے اس کا کچھہ بھی حال ان کو نہیں بتا سکے گا' انگریزی اصطلاحیں اور الفاظ تو اس کے دل میں پھرتے ہوں گے مگر مطلب اور منشاء اپنی دیسی زبان میں مہارت نہ رکھنے کے سبب سے اپنے دوستوں کے روبرو بالکل بیان نہیں کر سکیگا - اسی وجہ سے اس کا علم اس کے دوستوں اور واقف کاروں کو کچھہ فائدہ نہ بخشیگا اور اس کے علم کو ذلیل اور حقیر سمجھیں گے - اب اگر تعلیم اس کی دیسی زبان کے ذریعے ہووے اور وہ تمام لوگوں پر جو اس سے ملتے جلتے ہیں اپنے علم اور تجربوں کو فوراً ظاہر کرسکے تو ان میں اس کی کسی قدر زیادہ عزت اور بڑائی ہو اور ناواقفیت کی وجہ سے نفرت کرنے کی بجاے لوگ اس کی حرص اور تقلید کریں اور ایک برتر درجے کی تربیت کے عمدہ نتیجوں کی اُن کی آنکھوں کے سامنے ظاہر ہونے سے اُن کو اس بھی کی مانند علم حاصل کرنے کی ترغیب ہو اور اس کا ایسا اثر ہوکہ زمانۂ حال کے علموں کی تحصیل کا شوق لوگوں کے دلوں میں پھیل جاے—

وجوہات مسطورہ بالا کی رو سے ہم مسکینی اور نہایت عاجزی سے گذارش کرتے ہیں کہ گورنمنٹ ہند اعلی درجے کی تعلیم عام کا ایسا سرشتہ قائم کرے جس میں بڑے بڑے علوم اور فنون کی تعلیم دیسی زباں کے ذریعہ سے ہوا کرے اور دیسی زباں میں انہیں مضمونوں کا امتحان سالانہ ہوا کرے جس میں کہ اب طالب علم کلکتہ یونیورسٹی میں انگریزی زبان میں امتحان دیتے ہیں اور جو سند اب انگریزی زبان کے طالب علموں کو علم کے مختلف شاخوں میں لیاقت حاصل کرنے کی عوض میں عطا ہوتی ہیں وہ ہی سندیں

طالب ان علموں کو عطا ہوا کریں جو انہیں مضمونوں کا دیسی زبان میں امتحان
دے کر کامیاب ہوں - حاصل یہ ہے کہ خواہ تو ایک اردو فریق کلکتہ کی
یونیورسٹی میں قائم کیا جائے یا ممالک شمالی و مغربی میں ایک یونیورسٹی
دیسی زبان کی علیحدہ مقرر کی جاوے —

گورنمنٹ پنجاب نے مشرقی زبانوں کی ایک یونیورسٹی کی ضرورت
کو تسلیم کرکے اُس کی بنیاد ڈالنے کی کوشش شروع کی ہے - اس یونیورسٹی
کا مقصود اور منشاء مشرقی زبانوں کا شگفتہ اور سرسبز کرنا ہے اور یہ
یونیورسٹی ایک ایسا ذریعہ ہوگی جس کی بدولت اہل یوروپ کے علم
اور شائستگی اور تربیت ہندوستان میں پھیلے گی' جس سے ہندوستان
کی حالت بالکل بدل جائے گی —

یہ بات البتہ سچ ہے کہ بالفعل ایسی کتابیں دیسی زبان میں موجود
نہیں ہیں جن کے ذریعہ سے طالب علم اس درجے تک علم کی تحصیل
کرسکے جو اب یونیورسٹی میں امتحان دینے کے واسطے ضرور ہوتا ہے -
لیکن ایسی کتابوں کا موجود ہوجانا کوئی مشکل امر نہیں ہے جو کتابیں
یونیورسٹی کے امتحان کی فہرست میں مندرج ہیں ان کے ترجمے دیسی
زبان میں تیار ہوسکتے ہیں اور بعض مضمونوں کی اصل کتابیں تصنیف
ہوسکتی ہیں - چنانچہ بہت سے عالم فاضل اس کام کے لائق موجود ہیں
اور علی گڈہ کی سائنٹفک سوسائٹی اسی کام کو انجام دے رہی ہے - اس
نے حال ہی میں ایلفنسٹن صاحب کی مشہور تاریخ ہندوستان کا ترجمہ
مشتہر کیا ہے جو ایک کتاب یونیورسٹی کے امتحان کے مضمونوں میں سے ہے
اور آئندہ بھی وقتاً فوقتاً سوسائٹی اسی قسم کے ترجمے چھاپتی رہے گی —

خاتمہ پر ہم اپنا یہ قوی یقین ظاہر کرتے ہیں کہ جس تجویز کی

ہم تائید کرتے ہیں اگر اس کو جاری کیا جاے تو اِس ملک کی حالت کو از سر نو عمدہ اور بہتر کرنے اور اِس کے باشندوں کی طبیعتوں میں سے غلطی اور جہالت کے دور کرنے اور سب حاکم محکموں کو برابر بہت سا فائدہ پہونچانے کا یہ تجویز ایک بڑا موثر وسیلہ اور ذریعہ ہوگی ہم اس ایسے نہایت ادب اور بھروسہ کے ساتھہ اُمید رکھتے ہیں کہ ہماری روشن ضمیر گورنمنٹ ہند جس نے اپنی ہندوستانی رعایا کی بہبودی اور ترقی کے لیے ہمیشہ اپنی آرزو اور فکر ظاہر کی ہے اِس بڑے پایہ کی تجویز پر جواب ہم پیش کرتے ہیں اپنی نہایت سنجیدہ اور پسندیدہ توجہہ فیاضی سے کرے گی - الہی آفتاب دولت و اقبال ہمیشہ تاباں اور درخشاں رہے * ' —

اِس عرض داشت کا جو جواب گورمنٹ کی طرف سے وصول ہوا اس کی نقل بجنسہ یہاں درج کی جاتی ہے -

نمبر ۳۲۱۷

از جانب ای ' سی ' بیلی صاحب بہادر سکریٹری گورنمنٹ ہندوستان

بنام

پریسیڈنٹ و ممبران برٹش انڈین ایسو سی ایشن ممالک مغربی و شمالی

صیغۂ ہوم ڈپارٹمنٹ مقام شملہ ' ۵ ستمبر ۱۸۶۷ ع

اے شریف صاحبو -

حضور ویسراے کے پرائیویٹ سکریٹری کی معرفت آپ کو پہلے اس امر کی اطلاع ہوچکی ہے کہ آپ کی عرض داشت در باب تعلیم کے مورخہ ماہ گذشتہ حضور گورنر جنرل باجلاس کونسل کے حضور میں اس صیغہ میں پیش کی جاے گی ' چنانچہ اب مجھہ کو ہدایت کی گئی ہے کہ

* اخبار سائنٹفک سوسائٹی علی گڑہ مورخہ ۹ اگست ۱۸۶۷ ع

آپ کی عرض کو بغور تمام ملاحظہ کرنے کے بعد جو راے حضور محتشم الیہ نے ثبت فرمائی ہے اس سے آپ کو اطلاع دوں —

(۲) سنہ ۱۸۵۴ ع کے مراسلۂ تعلیم میں خلاصہ دفعہ ۱۱ سے لغایت ۱۴ کا ملفوف ہے جس میں وہ بڑے بڑے قول مندرج تھے جن کے بموجب اس سال سے اس ملک کی تعلیم کا بندوبست کیا جاتا ہے ' یہ بات تسلیم کی گئی ہے کہ لوگوں کی تعلیم کے واسطے دیسی زبانوں کو بطور ذریعہ کے قرار دینا نہایت ضرور ہے اور حضور گورنر جنرل اس بات کے دیکھنے سے نہایت خوش ہیں کہ جو رائیں مراسلۂ مذکور میں بیان کی گئی ہیں اُن کے مطالب کی تصدیق نہایت اچھی طرح پر اس عرضی کے ذریعہ سے ہوتی ہے - جو آپ نے گذرانی ہے —

(۳) مراسلۂ مذکورالصدر میں محکمہ ڈائرکٹروں نے یہ بیان فرمایا تھا کہ ان کا نہ تو یہ ارادہ ہے اور نہ یہ خواہش ہے کہ ملک کی دیسی زبانوں کی بجاے انگریزی زبان قائم کریں اور صاف یہ راے تحریر فرمائی تھی کہ یورپ کی ترقی یافتہ علم کی کسی قسم کی واقفیت جو ایسے بہت سے لوگوں کو سکھلایا جاے جو اپنی حالتوں کے باعث سے اعلیٰ درجے کی تعلیم نہیں حاصل کرسکتے ہیں اور جن کی ذات سے یہ بھروسہ نہیں ہوسکتا کہ وہ ایک غیر ملک کی زبان کی مشکلوں پر غالب آویں گے ' صرف ان دیسی زبانوں میں سے کسی نہ کسی زبان کے ذریعہ سے اُن کو حاصل ہوسکتی ہے علاوہ اس کے یہ بات بیان کی گئی تھی کہ انگریزی کا سیکھنا جو علم یورپ کے واسطے بطور ایک کنجی کے ہے اُن ہندوستانیوں کے واسطے ضرور ہوگا جو ایک اعلیٰ درجے کی تعلیم کے حاصل کرنے کے واسطے کوشش کرتے ہیں —

(۴) پس دیسی زبانوں اور انگریزی زبان کے درمیاں میں ایک فرق
عظیم قرار دیا گیا تھا' یعنی یہ کہ ایک عام پسند تعلیم کے واسطے
دیسی زبان ھی صرف ایک ذریعہ لابدی ھے اور اعلی درجہ کی تعلیم
کے واسطے انگریزی زبان ایک ضروری لوازمہ ھے —

لیکن ایک طرف تو عام پسند تعلیم اور دوسری طرف اعلی درجہ
کی تعلیم کی ان دو حدود کے درمیان میں علم کے بہت سے درجہ ایسے
تھے جن کو دیسی یا انگریزی زبان کے ذریعہ سے سکھلانے کے واسطے کوئی خاص
خاص قواعد مقرر نہ ھوسکے - اب تک جیسا کہ مراسلۂ مندرجۂ بالا میں
مذکور ھوا ھے' مشرق کی دیسی زبانوں میں یورپ کی کتابوں کے ترجموں
کے نہ ھونے یا دیسی ھی اصل کتابوں کے نہ ھونے سے ان لوگوں کے واسطے جو
عمدہ تعلیم کے خواھاں تھے یہ ضرور تھا کہ اول اول انگریزی زبان سیکھیں
لیکن یہ ضرورت کچھہ ایسی نہیں سمجھی گئی تھی کہ وہ غالباً ھمیشہ جاری
رھے گی' کیونکہ مراسلہ مذکور میں یہ بیان کیا گیا ھے کہ جس قدر روزبروز
لوگ دیسی زبانوں کی قدر و منزلت کو پہچانتے جاتے ھیں اُسی قدر
ھندوستان کا دیسی علم بھی بذریعہ ترجمہ یورپ کی کتابوں یا ان شخصوں
کی اصلی تصنیفات کے جن کی طبیعتوں میں یورپ کی شائستگی کی بو
سمائی ھے مالامال ھوجاے گا اور اس طریق سے تمام فرقوں کی رسائی
رفتہ رفتہ یورپ کے علم تک ھوجاے گی —

(۵) اس میں کچھہ شک نہیں ھوسکتا ھے کہ سنہ ۱۸۵۴ ع میں اس قدر
ضروری مقصد کے باب میں کسی قدر ترقی خصوصاً یورپ کی کتابوں
کے اس ملک کی دیسی زبانوں میں ترجمہ ھوجانے سے ھوئی ھے اور
آیندہ جو اظہار خواھش اور لیاقت کا ھندوستان کے باشندوں کی

جانب سے اس ترقی کی مدد دینے کے واسطے ہوگا اس کے ملاحظہ سے
حضور گورنر جنرل بہادر کو بڑی خوشی حاصل ہوگی - اس بات کے
دیکھنے سے نہایت خوشی حاصل ہوتی ہے کہ جو عرضداشت اس وقت
گورنمنٹ کے روبرو پیش ہے اس میں صاف صاف دیسی زبان کے
علم کو ترقی دینا اس نظر سے ضرور سمجھا گیا ہے کہ جمہور انام کو
اعلیٰ درجہ کی تعلیم دینے کے واسطے وہ بطور ایک ذریعہ کے کارآمد
ہو اور جناب نواب گورنر جنرل بہادر باجلاس کونسل ان تدبیروںکا
ذکر دیکھکر جو علی گڈہ کی سائنٹفک سوسائیٹی نے اس باب میں
اختیار کی ہیں اپنی رضامندی خاص ظاہر فرماتے ہیں —

(۶) دیسی زبان علم کی ترقی کے واسطے ہر سال ملک کے خاص خاص
صوبوں کی لوکل گورنمنٹوں اور ریاستوں کو روپیہ بطور امداد کے
سپرد کردیا جاتا ہے جو مختلف سررشتۂ تعلیم کی اردو کتابیں واسطے
فروخت اور تقسیم کے طبع یا خرید کرلیتے ہیں اس سے بھی وہی مقصد
مطلوب ہے - اس قسم کے اور ایسے ہی اور ذریعوں سے جو وقتاً فوقتاً
معلوم ہونگے جناب نواب گورنر جنرل بہادر باجلاس کونسل کو امید
ہوتی ہے کہ ہندوستان کی دیسی زبانیں اعلیٰ درجہ کی تعلیم دینے کے
واسطے بطور ذریعہ کے زیادہ تر کارآمد ہوں گی اور حضور محتشم الیہ
کا ہمیشہ یہی مقصد ہوگا کہ افسران سررشتہ تعلیم کے روبرو اس ضروری
معاملہ کو بڑی نمود کے ساتھ پیش کرتے ہیں اور مقصد مطلوبہ کے
حاصل کرنے کے باب میں ہر ایک قسم کی مدد عطا کریں —

(۷) بلحاظ ان درخواستوں کے جو عرضداشت کی دفعہ ۱۲ میں کی گئی
ہیں جناب گورنر جنرل بہادر باجلاس کونسل خیال فرماتے ہیں کہ

یہ بات تسلیم کرنی چاھیئے کہ اس ملک کی دیسی زبانوں سے ابھی اس اعلیٰ درجہ کی تعلیم کے واسطے سامان ولوازمہ حاصل نہیں ھے جیسی کہ برتش انڈین ایسوسی ایشن نے سوچی ھے - یقین ھے کہ جو کتابیں امتحان یونیورسٹی کی فہرست میں مندرج ھیں ان میں سے بہت سی کتابوں کا ترجمہ نہیں ھوا ھے اور یہ بات یاد رکھنی چاھیئے کہ صرف اُن کتابوں کا ترجمہ بھی جو یونیوسٹی خاص کر واسطے درس کے مقرر کرتی ھے اس قدر کافی نہوگا جس سے تدبیرات مجوزہ کے جاری کرنے کی ھمت پڑے کیونکہ تعلیم یونیورسٹی کا مقصد صرف یا خاص کر یہ ھی نہیں ھے کہ بعض خاص کتب ھی سے واقفیت حاصل ھو بلکہ یہ مقصد ھے کہ یورپ کے علوم و فنون کے فراخ دائرہ میں علم کی پیروی کے واسطے طبیعت کو مستعد و طیار کرے اور کچھہ عرصے تک غالباً ھندوستاں کے باشندے صرف انگریزی کے ذریعہ سے اس بات کو حاصل کرسکتے ھیں —

(۸) لیکن اسی کے ساتھہ جناب نواب گورنر جنرل باجلاس کونسل اور نیز تمام لوکل گورنمنٹیں نہایت خوشی سے ان تمام کوششوں کی قدردانی اور مدد کریں گی جو خواہ تو ایسی سوسائٹیاں جیسے کہ آپ کی ھے یا خاص خاص آدمی اس مقصد کی ترقی دینے کے واسطے کریں جو آپ کی سوسائٹی اور گورنمنٹ کو برابر منظور نظر ھے اور ھمیشہ اُس معاملہ کی نسبت عملی رایوں کے معلوم کرنے اور ان پر بخوبی تمام اور نہایت غور کے ساتھہ توجہ کرنے سے نہایت خوش ھوں گے —

(۹) لیکن یہ بات یاد رکھنی چاھیئے جیسا کہ وزیر سلطنت نے بھی اپنے مراسلہ تعلیم مرقومہ سنہ ۱۸۶۱ع میں بیان کیا ھے کہ درصورت پسندیدہ

ہونے کے بھی گورنمنٹ کے واسطے یہ غیر ممکن ہے کہ ایسے گنجان آباد
ملک کو جیسے کہ ہندوستان ہے ایک کامل تعلیم دینے کا کُل خرچ
اپنے ذمہ لے - گورنمنٹ کو دولت مند لوگوں سے اس بات کی توقع
کرنی چاہیے کہ وہ اپنی رضا و رغبت سے اپنے وقت اور روپیہ اور
رعب و داب سے ایسے کام میں مدد دیں جس کی تکمیل پر ہندوستان
کی بہبودی اور ترقی زیادہ تر منحصر ہے —

(۱۰) سوائے اس کے یہ بھی واضح ہو کہ صرف خاص خاص لوگوں یا ان
کے گروہوں کی مذکورہ بالا کوششوں کی بدولت عموماً یورپ کے ملکوں
میں تعلیم کثرت سے پھیل گئی ہے اور درحقیقت یہ ایک ایسا کام
ہے کہ کوئی گورنمنٹ کامیابی کی کسی اُمید سے اس کو بالکل اپنے
ذمہ نہیں لے سکتی —

آپ کا خادم

سکریٹری گورنمنٹ ہند

اس چٹھی کے فقرہ ۲ میں جس مراسلۂ تعلیم کے خلاصے کا حوالہ
ہے وہ یہ ہے —

انتخاب مراسلہ کورٹ آف ڈائرکٹرس ایسٹ انڈیا کمپنی

بنام

گورنر جنرل ہندوستان مورخہ ۱۹ جولائی سنہ ۱۸۵۴ ع

نمبر ۴۹

(۱۱) اب ہم کو یہ بات سوچنی چاہیے کہ ہمارے مقصد کی تکمیل کس طرح
پر ہوسکتی ہے اور اُس سے ہم کو اس ذریعہ کے بحث پر توجہ
ہوتی ہے جس سے ہندوستان کے لوگوں کو علم کی تعلیم کی جائے

اب تک ہندوستان کی دیسی زبانوں میں یورپ کی کتابوں کا ترجمہ نہ ہونے سے یا دیسی اصل کتابوں کے نہ ہونے سے اور مشرقی اعلیٰ درجہ کی زبانوں میں یورپ کے علم کی نہایت ناقص کتابوں کے ہونے سے ان لوگوں کے واسطے جو عمدہ تعلیم حاصل کرنے کی خواہش رکھتے ہوں اب تک اس بات کی ضرورت ہے کہ انگریزی زبان کو یورپ کے علم کی کنجی سمجھہ کر اول اول اُسی کی تحصیل شروع کریں اور انگریزی کا علم ہمیشہ ہندوستان کے اُن باشندوں کے واسطے جو اعلیٰ درجہ کی تعلیم حاصل کرنے کی تمنا رکھتے ہیں ضرور ہوگا —

(۱۲) ہندوستان کے بعض حصوں میں خصوصاً صدر مقاموں کے قرب و جوار میں جہاں کہ انگریزی کا علم رکھنے والوں کو بہت سی سرکاری اور غیر سرکاری نوکریوں کے لیے اور لوگوں پر ترجیح دی جاتی ہے وہ لوگ، جو مدرسوں میں پڑھتے ہیں انگریزی کے اوسط درجہ کی استعداد کو اپنے عام علم کی ترقی کا ضروری سلسلہ نہیں بلکہ اپنی تعلیم کا مقصد اور مآل کار سمجھتے ہیں۔ ہم بہت سی باتوں میں صرف انگریزی بولنے اور لکھنے کی لیاقت کے فائدہ سے منکر نہیں ہیں لیکن ہم کو خوف ہے کہ اِن اضلاع میں کچھہ ایسا ڈھنگ پڑگیا ہے کہ دیسی زبانوں کی تعلیم کی جانب سے بے جا غفلت کی جاتی ہے —

(۱۳) ہمارا یہ ارادہ یا خواہش نہیں کہ ملک کی دیسی زبانوں کے بجائے انگریزی زباں کو قائم کریں ہم ہمیشہ سے یہ بات جانتے ہیں۔ کہ جن زبانوں کو صرف جمہور انام کے بہت سے فرقے سمجھہ سکتے ہیں انہیں کا رواج نہایت ضرور اور مفید ہے۔ ہم نے یہی زبانیں نہ انگریزی زبان بجائے فارسی کے داد رسانی کے محکموں اور

گورنمنٹ کے افسروں اور لوگوں کے درمیان میں معاملات کے واسطے قائم کی ہے۔ پس یہ ضرور ہے کہ تعلیم کے کسی عام انتظام میں اُن کی تحصیل پر بڑی توجہ کی جاے اور یورپ کے ترقی یافتہ علم کی کوئی واقفیت جو جمہور انام کے ان بہت سے فرقوں کو سکھلایا جاوے جو اپنی حالتوں کے باعث سے ایک اعلیٰ درجہ کی تعلیم حاصل کرنے سے معذور ہیں اور جن کی ذات سے یہ توقع نہیں ہو سکتی ہے کہ وہ ایک غیرزباں کی مشکلوں پر غالب آویں گے ان دیسی زبانوں میں سے کسی نہ کسی زباں کے ذریعہ سے ان کو حاصل ہو سکتی ہے —

(۱۴) تعلیم کے کسی عام سرشتہ میں انگریزی زبان ان مقاموں میں سکھلانی چاہیے جہاں اس کی خواهش ہو لیکن انگریزی زبان کی تعلیم کے ساتھہ ہمیشہ ضلع کی دیسی زبان کی تحصیل پر بڑی توجہ اور ایسی عام تعلیم و تلقیں ہونی چاہیے جو اس زبان کے ذریعہ سے ہو سکتی ہے۔ اور جس صورت میں کہ انگریزی زبان کا استعمال بطور ایک نہایت کامل ذریعہ کے واسطے تعلیم ان شخصوں کے جاری رہے جن کو اِس سے اس قدر واقفیت حاصل ہوگئی ہے کہ وہ اس کے ذریعہ سے عام تعلیم و تلقیں حاصل کر سکتے ہیں تو اُن کو بہت سے فرقوں کے سکھلانے کے واسطے جو انگریزی زباں سے بالکل ناواقف ہیں یا کم واقف ہیں دیسی زبانوں کو استعمال کرنا چاہیے۔ اس کا انجام ایسے ماسٹروں اور پروفیسروں کی معرفت بخوبی تمام ہوسکتا ہے جو خود انگریزی داں اور جو ترقیاں حال میں ہر ایک قسم کے علم میں ہوئی ہیں ان سے بخوبی واقف ہوکر اپنے ہم وطنوں کو

اپنے وطن کی زبان کے ذریعہ سے وہ علم سکھلا سکتے ہیں جو انہوں نے بذریعہ انگریزی کے حاصل کیا ہے - اسی کے ساتھہ میں اور جس قدر کہ روز بروز دیسی زبان کی قدر کو لوگ پہچانتے جاویں ہندوستان کی دیسی زبان کی قدر کو لوگ پہچانتے جاویں ہندوستان کی دیسی زبان کا علم انگریزی کتابوں کے ترجمہ یا ان شخصوں کی اصلی تصنیفات کے ذریعہ سے جن کے دل میں یورپ کی شائستگی کی بو سماگئی ہو رفتہ رفتہ مالامال ہوجاے گا اور اس طرح پر تمام فرقے رفتہ رفتہ یورپ کے علم کو حاصل کرسکیں گے - پس ہم انگریزی زبان اور نیز ہندوستان کی دیسی زبانوں کو ذریعہ اشاعت علم یورپ کا سمجھتے ہیں اور ہماری یہ خواہش ہے کہ جو مدرسہ ایسے اعلیٰ درجہ کے ہوں جن میں ایک ایسا مدرس رہ سکتا ہو جس میں تمام ضروری لیاقتیں موجود ہوں ان سب میں انگریزی اور دیسی غرض کہ زبانوں کی تحصیل ہووے" -

سر سید نے گورنمنٹ کا یہ جواب برٹش انڈین ایسوسی ایشن کے جلسے میں پڑھ کر سنایا - ایسوسی ایشن کے ممبروں نے مندرجۂ ذیل تجویز منظور کی - اس تجویز میں جو "دونوں سوسائٹیوں" کا لفظ ہے اُس سے مراد برٹش انڈین ایسوسی ایشن اور سائنٹفک سوسائٹی علی گڑہ ہے -

"بعد سننے مضامین چٹھی موصوفہ کے صدر انجمن نے فرمایا کہ جو بے بہا توجہ ہماری فیاض اور عادل گورنمنٹ نے ہماری عرض داشت معروضہ یکم اگست سنہ ۱۸۶۷ ع پر فرمائی ہے کسی طرح اس کا شکریہ ادا نہیں ہوسکتا -

چونکہ یہ جواب اور عرض داشت جملہ ترقی علم سے متعلق ہیں

لہذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ممبراں سائنٹفک سوسائٹی بھی اس معاملہ پر غور کریں اس واسطے میں تحریک کرتا ہوں کہ ایک جلسہ بشرکت ممبراں دونوں سوسائٹیوں کے کیا جاوے اس تحریک کی تائید بابو ایشرچندر مکرجی صاحب نے کی اور بالاتفاق یہ بات قرار پائی کہ سوسائٹی کے ممبروں کو اس امر میں گفتگو کرنے کی غرض سے اجلاس میں تشریف لانے کی تکلیف دی جاے * "—

سرسید نے ایسوسی ایشن کی عرض داشت اور گورنمنٹ کا جواب بغرض اظہار راے ایک انگریز عالم کے پاس بھیجی - جن الفاظ میں سرسید نے اس کا ذکر کیا ہے اور جو جواب اُس انگریز عالم کی جانب سے وصول ہوا وہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے -

"اس ایسوسی ایشن کے سکرتری نے ایک نقل اس عرض داشت کی جو درباب وسعت تعلیم اہل ہند حضور میں جناب معلی‌القاب رائٹ‌آنریبل وائسراے اور گورنر جنرل بہادر کشور ہند بھیجی گئی ہے مع اس کے جواب کے ایک بہت بڑے یورپین عالم کے پاس جس کے برابر ہندوستان میں چند ہی انگریز عالم ہوں گے اس مراد سے بھیجی تھی کہ وہ اپنی راے اس امر میں جس کی درخواست گورنمنٹ سے کی گئی ہے ارقام فرماویں- اگرچہ ہم اِن صاحب کا نام نہیں بتاتے ہیں مگر چونکہ ایک بہت بڑے عالم کی راے اور قابل توجہ حضور وائسراے و گورنر جنرل بہادر کشورہند کی ہے اس لیے ہم اس کو بحذف ان کے نام و نشان کے اس اخبار میں درج کرتے ہیں —

---

* اخبار سائنٹفک سوسائٹی مورخہ ۲۷ ستمبر سنہ ۱۸۶۷ م صفحہ ۶۱۲ —

نقل چٹھی صاحب ممدوح بنام سکرٹری ایسوسی ایشن

مقام ۲۷ اگست سنہ ۱۸۶۷ ع

میرے عزیز صاحب :-

میں نے آپ کی درخواست بہت دل لگا کر پڑھی اور نہایت صدق دل سے اس نہایت مناسب جواب کی مبارک باد دیتا ہوں جو جناب معلی القاب نواب گورنر جنرل بہادر نے آپ کے پاس بھیجا ہے - میری دانست میں اس امر میں مطلقاً شبہ نہیں ہوسکتا ہے کہ آپ کی تجویز مجوزہ موجودہ یونیورسٹی کے اثرہاے فائدہ بخش کو نہایت وسعت دےگی کیونکہ ہزاروں آدمی جو بسبب بعض حالات کے تحصیل علم انگریزی سے محروم ہیں علم مغربی کی تحصیل پر آمادہ ہوں گے اور اس کے ساتھہ یہ بھی فائدہ ہوگا کہ اس ملک کی عمدہ زبانوں کو باحتیاط اور بطرز عالمانہ تحصیل کریں گے—

علوم ریاضی و تواریخ و جغرافیہ اور وہ علم جن سے اخلاق اور عقل کی تہذیب اور ترقی (ہوسکتی ہے) ہندوستان کی ہر دیسی زبان میں اس خوبی کے ساتھہ ہوسکتے ہیں جیسے کہ انگریزی میں بشرطیکہ ان علوم کی عمدہ عمدہ کتابوں کے خاطر خواہ ترجمے اور لئیق مدرس دستیاب ہوں - فی الواقع آپ کی تدبیر کی تکمیل کے لیے وقت اور بہت سے بڑے بڑے عالموں کی باہمی کوشش کی ضرورت ہوگی ' لیکن مجھے یقین واثق ہے کہ یہ امر ممکن التکمیل ہے اور یقینی اس سے فوائد بے شمار پیدا ہوں گے—

آپ اس امر کا یقین کامل رکھیں کہ جو کچھہ اعانت قلیل میں دے سکتاہوں ہمیشہ برضا و رغبت تمام دوں گا

آپ کا صادق " *

---

* اخبار سائنٹفک سوسائٹی علی گڑہ مورخہ ۶ ستمبر سنہ ۱۸۶۷ ع صفحہ ۶۲ -

عرض داشت میں اس امر کو صاف اور صریح الفاظ میں بیان کر دیا گیا ہے کہ ہمارا ہرگز یہ منشا نہیں ہے کہ ایشیا کے مردہ علوم فنون کو تر و تازہ کیا جاے، بلکہ ہمارا مقصد یہ ہے کہ اُن علوم و فنون کی جو اہل یورپ نے اس زمانے میں اپنی جد و جہد اور تحقیقات سے حاصل کیے ہیں ملک میں عام اشاعت کی جاے- گورنمنٹ نے جو ملک میں مغربی تعلیم جاری کی ہے اُس کا احسان مندی کے ساتھ ذکر کیا ہے لیکن موجودہ حالت میں رعایا کی صرف ایک قلیل تعداد اس سے فائدہ حاصل کر سکتی ہے اور عام لوگوں کی دسترس سے باہر ہے- اس لیے جب تک دیسی زبان کے ذریعہ سے تعلیم نہ دی جاے گی ملک میں روشن خیالی نہیں پھیل سکتی اور تعلیم کا اصل مقصد حاصل نہیں ہو سکتا- اس کے ساتھ ہی اس بات کو پر زور الفاظ میں جتایا گیا ہے کہ اس تحریک سے ہرگز یہ منشا نہیں ہے کہ انگریزی تعلیم گھٹا دی جاے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ یا تو کلکتہ یونیورسٹی میں ایک شعبہ ایسا قائم کیا جاے کہ اس میں دیسی زبان کے ذریعہ سے علوم و فنون کی تعلیم اسی درجے تک دی جاے جو انگریزی میں دی جاتی ہے اور اسی قسم کے امتحان لیے جائیں اور ویسی ہی سندیں عطا کی جائیں یا ممالک مغربی شمالی میں ایک یونیورسٹی دیسی زبان کی علحدہ قائم کی جاے- اس امر کا بھی اعتراف کیا گیا ہے کہ بالفعل دیسی زبان میں ایسی کتابیں موجود نہیں ہیں جن کے ذریعہ سے طالب علم اس درجے تک علم کی تحصیل کر سکے جو اس وقت یونیورسٹی میں امتحان دینے کے لیے ضروری ہیں- لیکن ایسی کتابوں کا موجود ہو جانا کوئی مشکل امر نہیں ہے، جو کتابیں یونیورسٹی کے نصاب تعلیم میں داخل ہیں ان کے ترجمے دیسی زبان میں تیار ہو سکتے

ہیں اور بعض مضمونوں کی اصل کتابیں تصنیف ہوسکتی ہیں - چنانچہ بہت سے اہل علم اس کام کے لائق موجود ہیں اور سائنٹفک سوسائٹی علی گڑہ اس کام کو انجام دے رہی ہے —

یہ ہے خلاصہ عرضداشت کا - گورنمنٹ کی طرف سے جو جواب اس کا وصول ہوا اس میں چند باتیں قابل غور ہیں - گورنمنٹ اس امر کو تسلیم کرتی ہے کہ جمہور انام کو اعلیٰ درجے کی تعلیم دینے کے لیے دیسی زبانیں کارآمد ہوں گی لیکن دیسی زبانوں میں ابھی اس اعلیٰ درجہ کی تعلیم کے لیے کافی سامان اور لوازمہ موجود نہیں ہے - دوسری بات جو زیادہ قابل لحاظ ہے یہ ہے کہ صرف ان کتابوں کا ترجمہ جو یونیورسٹی کے نصاب تعلیم میں داخل ہیں اس قدر کافی نہ ہوگا کہ جس کی بنا پر اس تجویز کو عمل میں لانے کی ہمت ہوسکے کیوں کہ تعلیم یونیورسٹی کا مقصد صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ بعض خاص خاص کتب سے واقفیت ہوجاے بلکہ یہ مقصد ہے کہ یورپ کے علوم و فنون کے فراخ دائرے میں علم کی تحصیل کے لیے طبیعت کو مستعد اور تیار کیا جاے اور کچھہ عرصے تک غالباً ہندوستان کے باشندے صرف انگریزی کے ذریعہ سے اس بات کو حاصل کرسکتے ہیں - تیسری بات جس کا گورنمنٹ نے اظہار کیا ہے یہ کہ "در صورت پسندیدہ ہونے کے بھی گورنمنٹ کے واسطے یہ غیر ممکن ہے کہ ایسے گنجان آباد ملک کو جیسا کہ ہندوستان ہے کامل تعلیم دینے کا کل خرچ اپنے ذمہ لے" - یعنے ملک کے اہل دولت کو بھی اپنی رضا و رغبت سے اپنے وقت اور روپے اور اثر سے اس کام میں مدد دینی چاہیے جس کی تکمیل پر ہندوستان کی بہبودی اور ترقی کا انحصار ہے —

اس خط و کتابت کے بعد پھر کچھہ معلوم نہ ہوا کہ کیا ہوا - ایسا

معلوم ہوتا ہے کہ معاملہ یہیں ختم ہوگیا - مولانا حالی حیات جاوید میں لکھتے ہیں کہ " معلوم ہوتا ہے کہ گورنمنٹ کا ارادہ کلکتہ یونیورسٹی کو توڑکر اس کی جگہ ورنیکلر یونیورسٹی قائم کرنے کا تھا اور انگریزی کو بطور سکنڈ لینگوج کے تعلیم میں رکھنا چاہتی تھی - چنانچہ سر سید نے بنارس انسٹی ٹیوت کے ایک جلسے میں جو اسی معاملے پر غور کرنے کے لیے منعقد ہوا تھا یہ تقریر کی تھی کہ :—

" مسٹر کیمسن (ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم اضلاع شمال مغرب) نے ایسوسی ایشن کا مطلب غلط سمجھا ہے - ایسوسی ایشن کی ہرگز یہ رائے نہیں ہے کہ انگریزی بطور ایک زبان کے سکھلائی جائے اور اس کو اعلیٰ تعلیم و تربیت کا ذریعہ نہ گردانا جائے بلکہ اس کی یہ خواہش ہے کہ انگریزی تعلیم کا طریقہ بدستور جاری رہے مگر اس کے ساتھ ایک اور سررشتہ قائم کیا جائے جس سے انگریزی علوم و فنون اور خیالات دیسی زبان کے ذریعہ سے بکثرت عام ہندوستانیوں میں پھیلائے جائیں- پس یا تو کلکتہ یونیورسٹی میں ایک شعبہ قائم ہو یا ایک جداگانہ ورنیکلر یونیورسٹی خاص ان اضلاع میں قائم ہو" اس کے بعد اپریل سنہ ۱۸۶۸ ع میں جب کہ نواب لفٹننٹ گورنر بھی بنارس انسٹی ٹیوٹ میں موجود تھے سر سید نے پھر اسی تقریر کا اعادہ کیا اور کہا کہ " مجوزہ ورنیکلر یونیورسٹی کے حامی انگریزی تعلیم کا ہرگز تنزل نہیں چاہتے بلکہ اس بات کی فکر ہے کہ ہند کے کروڑہا آدمیوں کو تعلیم کا فائدہ کیوں کر پہنچے" -

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ " غالباً زیادہ تر اسی وجہ سے کہ گورمنٹ کا ارادہ انگریزی تعلیم کو گھٹا دینے کا تھا سرسید نے ورنیکلر یونیورسٹی کا خیال چھوڑ دیا ہوگا؛ مگر اس کے سوا خود ورنیکلر یونیورسٹی کے قائم کرنے میں بعض مشکلات ایسی تھیں جن کا حل کرنا نہایت دشوار

تھا۔ چنانچہ سر سید نے اس باب میں جب مسٹر پیرسن انسپکٹر مدارس حلقۂ راولپنڈی سے راے دریافت کی تو انھوں نے اُس کے جواب میں ایک مفصل تحریر بھیجی جس میں ترجمہ کرنے کی اصلی اور حقیقی مشکلات نہایت وضاحت کے ساتھہ بیان کی تھیں۔ اس تحریر سے بھی ضرور ان کے ارادوں میں تزلزل واقع ہوا ہوگا۔ پھر انھیں دنوں میں اُن کو سفر انگلستان کا خیال پیدا ہوگیا جس میں طرح طرح کی مشکلات حائل تھیں اور اُن کا حل کرنا بجاے خود ایک بڑا کام تھا۔ ان وجوہ سے سر سید اور ان کے ساتھہ کے جتنے آمین کھلے والے تھے سب ورنیکلر یونیورسٹی کے خیال سے دست بردار ہوگئے"۔

"ورنیکلر" سے سر سید اور اُن کے رفقا یعنے ارکان برٹش انڈین ایسوسی ایشن و ارکان سائنٹفک سوسائٹی کی (جن میں ہندو مسلمان اور انگریز سب شریک تھے) مراد اردو زبان سے تھی کیونکہ ہندی زبان کی حیثیت اُس وقت ایسی نہ تھی کہ اس بار کی متحمل ہوسکتی۔ عرض داشت کے اُس فقرے سے بھی یہ بات مترشح ہوتی ہے جس میں انھوں نے سائنٹفک سوسائٹی کے ترجموں کا ذکر کیا ہے اور آئندہ ترجموں کا بار اپنے اوپر لینا قبول کیا ہے۔ علاوہ اس کے اس سے قبل اس کا تجربہ دہلی کالج میں ہوچکا تھا جہاں تمام ترجمے اور تالیفات اردو ہی میں ہوئی تھیں اور مختلف علوم و فنون کی اعلیٰ تعلیم اردو ہی کے ذریعہ سے ہوتی تھی۔ چنانچہ (جیسا کہ مولانا حالی نے لکھا ہے) گورنمنٹ کی طرف سے عرض داشت کے جواب آنے پر "بڑے بڑے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں نے ترجمہ کرنے کی حامی بھری تھی جن میں تین نامور آدمی دلی کے بھی تھے؛ ماسٹر پیارے لال، مولوی ذکاءاللہ اور پنڈت دھرم نراین"۔

یہ تینوں صاحب دھلی کالج میں طالب علم اور استاد رہے تھے ــ

ملک کی بد نصیبی دیکھیے کہ اگرچہ تجویز مکمل ہونے نہیں پائی تھی اور اس کے عمل میں آنے کی بھی کوئی قوی توقع نہیں تھی مگر زبان کے معاملے میں اختلاف شروع ہوگیا اور اخباروں میں اس بات کی چھیڑ چھاڑ شروع ہوگئی کہ مجوزہ یونیورسٹی میں مسلمانوں کے لیے اردو اور ہندؤں کے لیے ہندی زبان مخصوص کی جاے - اور "باوجود تسلیم کرنے اس بات کے کہ ہندی زبان سردست ترجمے کی قابلیت نہیں رکھتی اس امر پر زور دیا جاتا تھا کہ اس کی ترقی میں کوشش کرکے اس کو ترجمے کے لائق بنایا جاے" - معلوم ہوتا ہے کہ یہ چیز بھی اس تحریک کے مزاحم ہوئی اور کارروائی آگے چلنے نہ پائی ــ

دیسی زبان کی یونیورسٹی قائم کرنے اور اس کے ذریعے اعلیٰ تعلیم دینے کی تجویز سب سے پہلے سرسید نے سوچی - اب اتنی مدت کے بعد جب ہم یہ سوچتے ہیں کہ اگر یہ یونیورسٹی وجود میں آجاتی تو ہماری زبان کی کیا حالت ہوتی تو ہمارے دل میں عجیب قسم کا ولولہ پیدا ہوتا ہے۔ ساتھہ ستر سال کی مدت کچھہ کم نہیں ہوتی - اگر اس مدت میں استقلال، خلوص اور ہوش مندی سے کام کیا جاتا تو ہندوستان کی کوئی زبان اس سے لگا نہ کھاتی - یہ تو خیر ایک تجویز تھی، ہمارے وہ ادارے جو اس کام کو بخوبی انجام دے رہے تھے، ایسے وقت میں بند ہوگئے یا سست پڑگئے جب کہ اُن کی شدید ضرورت تھی - اس سے ہماری زبان کو سخت نقصان پہنچا - دھلی کالج جس نے اس عظیم الشان کام کا سب سے پہلے بیڑا اٹھایا اور جہاں اس کے کار فرما اور کارکن بڑے شوق اور جوش سے یہ خدمت ادا کررہے تھے، بے وقت نشانۂ اجل ہوگیا - سنہ ۵۷ کے ہنگامے سے اسے ایسا

دھچکا لگا کہ پھر نہ پنپ سکا اور اس کی ساری کوششوں اور محنتوں پر پانی پھر گیا - اس کے بعد سائنٹفک سوسائٹی علی گڑہ نے اس کا ڈول ڈالا تھا اور کام اچھا خاصا چل نکلا تھا اور ورنیکلر یونیورسٹی کی تجویز اسی کے بانی کا نتیجۂ فکر تھی لیکن کچھہ مدت کے بعد وہ بھی رہ گئی - پھر اورینٹل کالج لاھور نے اس سلسلے کو کچھہ ایسی سبھہ گھڑی میں شروع کیا تھا کہ یہ معلوم ھوتا تھا کہ یہ تلافیِ مافات کر کے رھے گا لیکن ایک عرصے کے بعد اس کا کام بھی رک کے رہ گیا - اب جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن نے اس بار عظیم کو اپنے ذمہ لیا ھے اور زیادہ استحکام اور وسعت کے ساتھہ اس کام کو انجام دینا شروع کیا ھے - اس سے ھماری زبان کی بڑی بڑی توقعات وابستہ ھیں - لیکن زبان کی ترقی کا اس پر انحصار کرکے بیٹھہ رھنا دانشمندی کے خلاف ھے - اس وقت ایسے اسباب پیدا ھوگئے ھیں کہ ھمیں زیادہ فکر اور مستعدی کے ساتھہ اس کے سنبھالنے اور اس کی توسیع و اشاعت پر غور کرنے کی ضرورت ھے - مشاعرے اور برائے نام انجمنیں اس کام کو انجام نہیں دے سکتیں - اس کے لیے باھمی اتحاد اور زندہ مرکز کی ضرورت ھے —

محفل رقص کی تصویر

کالی داس ، پیرلوتی اور میر حسن کے قلم سے

مترجمہ

جناب اختر حسین صاحب رائے پوری

[یہاں نظارۂ رقص کی تین تصویریں پیش کی جاتی ہیں ، جن کے صناع تین باکمال ادیب ہیں —

کالیداس نے اپنے ڈرامے ' مالوکاگنی متر ' میں بڑی حسن و خوبی سے محفل رقص و سرود منعقد کی ہے - راجا اگنی متر اپنی رانی دھرنی کی باندی مالوکا کی تصویر دیکھہ کر اس پر ریجھہ جاتا ہے اور اسے دیکھنے کا موقع تلاش کرتا ہے - مالوکا اور راجا کی ایک باندی گوتمی دو مختلف استادوں سے ناچ کی تعلیم حاصل کر رہی ہیں - یہ دونوں استاد جوش رقابت میں ایک محفل سجاتے ہیں تاکہ اپنی اپنی چیلی کے کرتب دکھلائیں - ایک جوگن جو محل میں رہتی ہے اس مقابلے کی ثالث مقرر کی جاتی ہے - راجا کا مطلب بر آتا ہے اور وہ اپنی محبوبہ کو دو بدو دیکھہ لیتا ہے - سنسکرت ڈرامے میں ودوشک (مسخرہ) کو وہی حیثیت حاصل ہے جو کلاسکل یورپین ڈرامے میں ' فول ' کو - وہ عموماً ہیرو کا لنگوٹیا یار ہوتا ہے - یہ ترجمہ ڈرامے کے دوسرے ایکٹ سے براہ را

سنسکرت سے کیا گیا ہے - حصہ نظم واوین میں رکھا گیا ہے —

فرانس کے نامور ادیب پیرلوتی (Pierre Loti) نے اپنے سفرنامۂ ہند میں کوچین کے ایک ناچ کا حال بڑے لطیف انداز میں لکھا ہے - اس کا ترجمہ 'ہندوستانی رقاصہ' کے عنوان سے کیا گیا ہے —

میر حسن نے بھی اپنی مثنوی میں بدر منیر اور بےنظیر کی شادی کے بیان میں ناچ کی محفل بڑی دھوم سے سجائی ہے —

ان ترجموں اور اقتباس سے ایک تو ان ادیبوں کا کمال ظاہر ہوتا ہے اور پھر ادب کا تقابلی مطالعہ بھی کم دلچسپ نہیں - مترجم]

(رقص و سرود کا انتظام ہوچکا ہے اور راجا اپنے دوست کے ساتھ تخت پر بیٹھا ہے - رانی، جوگن اور خدم و حشم حسب مراتب بیٹھے ہوے ہیں)-

راجا - محترمہ ان دونوں استادوں میں سے پہلے کس کی تعلیم اداکاری کا امتحان لیا جائے گا ؟

جوگن - یوں تو دونوں اپنے فن کے چاند سورج ہیں تاہم عمر کی بزرگی کے لحاظ سے گن داس کو ترجیح دینا چاہیے —

راجا - اچھا تو ' مودگلیہ ' ان صاحبوں کو یہ خبر پہنچا کر اپنی خدمت پر مستعد رہو —

حاجب - کرامات ' جہاں پناہ - (رخصت)

گن داس - حضور ' شرمشٹھا * کا بنایا ہوا ایک گیت رباعی میں ہے ' جو مدھم لے میں گایا جاتا ہے - اس کے ایک بند کو توجہ سے سننے کی زحمت فرمائیے —

---

* جنوں کے راجا کی بیٹی اور راجا ییاتی کی بیوی تھی جس کا ذکر پرانوں میں کئی جگہ آیا ہے -

راجا - فرط احترام سے میں ہمہ تن گوش ہوں —

(گن داس باہر جاتا ہے)

راجا (علحدہ) - یار - "وہ جو پس پردہ ہے ' اس کے شوق دیدار میں
یہ بیقرار نین گویا پردے کو الٹ دینے کی کوشش کر رہے ہیں - "

مسخرہ (چپکے سے) - بھئی لو ' تمہاری آنکھوں کا رس تو آگیا لیکن تمہاری
رانی شہد کی مکھی بنی بیٹھی ہے - ذرا ہوشیاری سے درشن پیاس بجھانا -
(مالوکا اپنے استاد کے ساتھہ جو اس کے سڈول بدن کو غور سے نرکھہ
رہا ہے ' اندر آتی ہے) —

مسخرہ (کان میں) - حضور دیکھیے تو سہی - تصویر اور اصل کے حسن میں
جو سرمو فرق بھی ہو —

راجا (آہستہ سے) - دوست - "میرا دل اس خیال سے دھڑک رہا تھا کہ کہیں
چھب میں اس کا روپ نکھر نہ آیا ہو - لیکن اب تو یہ گمان ہوتا
ہے کہ اس کا مصور نظارۂ حسن میں اتنا کھو گیا تھا کہ تصویر جیتی
جاگتی نہ بن سکی" —

گن داس - بیٹی لاج اور جھجک کو چھوڑ کر اپنے آپے میں آجا —

راجا (خودبخود) - حقا کہ اس کا ہر عضو تن سانچے میں ڈھلا ہوا ہے —
" آنکھیں غلافی ہیں - چہرہ زمستاں کے ماہتاب کی طرح روشن
ہے اور کاندھوں سے دونوں ہاتھہ کس بانکپن سے نیچے ڈھل گئے
ہیں - بھری ہوئی چھاتی میں گدرائے ہوئے جوبن تن کر ایک دوسرے سے
بھڑ گئے ہیں - آغوش میں کیا کٹاؤ ہے اور کمر اتنی پتلی کہ بازو حمائل
کرلے - ساق بلوریں گداز ہیں اور ان سب پر پاؤں کے انگوٹھے
کی ہلکی سی کنجی غضب ہے - معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کالبد اپنے

استاد کے تخیل کی مناسبت سے تیار کیا گیا تھا " —

(مالوکا تال سر ملا کر اس رباعی کو لحن سے گاتی ہے) —

" پیتم پیارے کا ملنا ناممکن ہے ' اس لیے اے دل اب آس چھوڑ دے - لیکن میری بائیں آنکھہ کی کور رہ رہ کر پھڑک کیوں رہی ہے - مدت دراز کے بعد آج جو محبوب نظارہ فروز ہے تو اس کے پاس جاتے ہوئے میں شرما رہی ہوں - میرے مالک گو میں باندی ہوں پھر بھی یقین جان کہ تیرے فراق کی ماری ہوئی ہوں " —

(گیت میں مسطور معنی کے اظہار کے لیے وہ ناچ کر بھاؤ بتلاتی جاتی ہے) -

مسخرہ (کان میں) - دوست ' یہ چوپدا سنا کر اس نے بھی اظہار الفت کردیا -

راجا (چپکے چپکے) - بھائی میرا دل بھی یہی شہادت دیتا ہے —

" میرے مالک میں تیری مشتاق ہوں — یہ گا کر غمزہ وعشوہ سے اس نے ان الفاظ کو واضح کیا اور اشارے میں مخاطب کرکے اپنا درد دل سنا دیا کیونکہ رانی دھرنی کی موجودگی کے سبب اظہار مدعا کی کوئی دوسری صورت نہ ہو سکتی تھی " -

(گانا ختم کرکے مالوکا محفل سے اٹھنا چاہتی ہے) —

مسخرہ - ٹھہریے جناب - آپ کی ایک آدہ بھول چوک کے متعلق مجھے دریافت کرنا ہے —

گن داس - بیٹی ذرا ٹھہر جاؤ - کسی کو یہ کہنے کی جگہ نہ رہ جائے کہ تمہاری تعلیم میں کوئی نقص رہ گیا —

(مالوکا پلٹ کر خاموش کھڑی ہو جاتی ہے) —

راجا - (خود بخود) - ہر ڈھب پر اس کا حسن نئی آن بان دکھلانے لگتا ہے —

"لاریب کہ شان رقص سے یہ انداز استادگی کہیں زیادہ دلفریب
ہے - یہ انداز کہ دھڑ چھڑی کی طرح سیدھا ہے اور بایاں
ہاتھ سرین پر اس انداز سے رکھا ہوا ہے کہ اس کی چوڑی چپ چاپ
کلائی سے لپٹی ہوئی ہے - اور دوسرا ہاتھ یوں ڈھیلا لٹکا
ہوا ہے گویا شیام بیل کی زلف ہے - اس کی آنکھیں روش پر
جمی ہوئی ہیں جس پر بکھرے ہوے پھولوں کو وہ اپنے انگوٹھے
سے آہستہ آہستہ مسل رہی ہے" —

گن داس - (مسخرے کو مخاطب کرکے) سنیں تو سہی کہ جلاب کا
اعتراض کیا ہے؟ -

مسخرہ - پہلے اپنی ثالثہ سے پوچھہ لیں بعد ازاں میں اس نقص کا ذکر
کروں گا جو دوران رقص میں مجھے نظر آیا -

گن داس - دیوی، اپنے مشاہدہ کے مطابق فیصلہ کیجیے کہ یہ کرتب کامیاب
رہا یا ناکام -

جوگن - میری دانست میں تو وہ بالکل بے عیب تھا، کیوں کہ :-
"اس کے جسم نازنیں کا ہر بن مو جذبات کی بولتی ہوئی
تصویر بن گیا تھا - خرام اور لے میں مناسبت تھی اور وہ
خود جذبات کے اظہار میں محو ہوگئی تھی - سیمیں بازوؤں
کی ہر جنبش کمال نازک تھی اور رس کی لہریں یکے بعد
دیگرے امڈتی آتی تھیں - لیکن از ابتدا تا آخر جذبۂ محبت
میں جو قیام تھا اس نے دلچسپی میں اتار چڑھاؤ پیدا
نہ ہونے دیا" —

"ہندوستانی رقاصہ" -

وہ چہرہ قریب آتا جاتا ہے جس کی آنکھیں بہت بڑی بڑی ہیں جو شباب پرور ہے، جس پر غازہ ملا ہوا ہے - شہوانیت اور کلفت اس پر صاف عیاں ہیں اور بڑی نزاکت و سرعت سے وہ کبھی سامنے آتا اور پھر فوراً پیچھے ہٹ جاتا ہے - اس کی ناچتی ہوئی نین پتلیوں کو دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ سفید میناکاری کی زمین پر سیاہ سنگ سلیمانی جڑے ہوئے ہیں - ہر خرام ناز کے ساتھ جذبۂ شہوت کو ابھارتی ہوئی وہ آگے آکر پھر تاریکی کی طرف لوٹ جاتی ہے اور اس کی ہر پیش قدمی میں ایک نیا اشتعال انگیز اشارہ پنہاں ہوتا ہے - اور اس سارے وقفے میں اس کا تار نظر مجھ پر بندھا ہوا ہے - یہ سانولا سلونا مکھڑا جواہرات سے لدا ہوا ہے - ہیرے اور کندن کا ایک مکٹ پیشانی کا ہالہ بنا کر اور زلفوں کو اپنے آغوش میں چھپا کر کانوں کے اوپر ڈھلک گیا ہے - ناک میں اور کانوں میں کئی ہیرے جگمگا رہے ہیں -

رات کا وقت ہے اور ہر طرف روشنی ہو رہی ہے - لیکن اس انبوہ میں میں فقط اس تاجدار حسینہ کو دیکھ سکتا ہوں جس کے مکٹ کی انی مجھ پر جادو پھونک رہی ہے - بہتیرے تماشائی اس کے گرد حلقہ بنا کر یوں گھور رہے ہیں کہ اسے بمشکل تمام ہاؤ بھاؤ بتانے کی جگہ ملتی ہے - ایک ذرا سی کھلی ہوئی جگہ رہ گئی ہے جس میں سے ہو کر وہ میرے قریب آتی اور پھر پلٹ جاتی ہے - لیکن ان کا ہونا نہ ہونا میرے لیے برابر ہے اور میں صرف اس عورت کو، اس کے درخشاں مکٹ کو، اس کی چشم سرمہ سا کو اور کٹیلی ابرو کو دیکھ سکتا ہوں - اس کا جسم نازنیں سانپ کی طرح لچکیلا ہوتے ہوئے بھی گداز اور مضبوط ہے - کیسے سحر طراز بازو

ہیں وہ جو گل بہیاں کرنے کو بے تاب معلوم ہوتے ہیں، جو سانپوں کی
طرح بل کھا رہے ہیں اور جو کاندھوں تک گھیر و زمرد سے زیربار ہیں-
لیکن نہیں! کشش تو ان آنکھوں میں ہے جن کا انداز ہر آن تغیر پذیر
ہے- کبھی وہ طعنہ زن ہیں تو کبھی ان میں عجب دل پذیر حلاوت ہے-
جب وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتی ہے تو میں کانپنے لگتا ہوں-
مکٹ کے رتن اور ناک کان کے جواہرات اس آب و تاب سے جلوہ فگن
ہیں اور یہ طلائی فیتہ ایسا روشن حلقہ بنائے ہوئے ہے کہ اس وقت بھی
جب وہ مجھ سے بالکل پھر جاتی ہے، اس کا چہرہ اپنے دل ربا نک سک
اور اُڑے اُڑے سے سانولے رنگ کے ساتھ ایک پر اسرار ابہام میں ملبوس
نظر آتا ہے- رقاصہ آتی ہے اور جاتی ہے- معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف مجھے
ناچ دکھا رہی ہے - کتنا نوا محروم ہے یہ رقص! صرف ان بیش قیمت
گھنگروؤں کی رم جھم سنائی دیتی ہے- اس کے ننگے اور ننھے پاؤں کی چاپ
کا زیر و بم قالین ہی میں سما جاتا ہے - ان پیروں کی کشیدہ اور سیماب وش
انگلیوں میں چھلے پڑے ہوئے ہیں—

یہ رقص جس جگہ ہو رہا ہے وہ پھولوں کی مہک اور عطروں کی
لپک سے اس قدر بسی ہوئی ہے کہ دم گھٹ رہا ہے- فرانسیسی علاقے کے
جو ہندوستانی یہاں رہتے ہیں انہوں نے میری خاطر یہ محفل سجائی
ہے- میں اس کا مہمان ہوں جو ان میں سب سے زیادہ دولت مند ہے- میرے
آتے ہی میزبان نے یاسمین کے پھولوں کے کئی لڑی کے ہار گلے میں ڈال
دیا اور ایک نقرئی گلاب پاش سے مجھ پر چھڑکاؤ کیا- گرمی کے مارے سانس
رک رہا ہے- تقریباً سبھی مہمان بیٹھے ہوئے ہیں- گویا کالے کالے سروں کی
ایک قطار ہے جس پر زری کی پگڑیاں رکھی ہوئی ہیں- نیم برہنہ و استادہ

نوکر تاز کے رنگین پتوں کے بڑے بڑے پلکھے ان کی کوپڑیوں پر جڑں رہے ہیں - اس خوش لباس مجمع میں جہاں مرد بھی جواہر جڑے ہیں' ان غریبوں کی برہنگی کمال درجہ موجب حیرت ہے —

رقاصہ سے کہہ دیا گیا تھا کہ یہ جشن میرے اعزاز میں ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ جسے ذوق و اکتساب دونوں حاصل ہے یوں مجھ پر توجہ کررہی ہے-

آج شام کو وہ دور دراز سے یہاں آئی ہے - دکن کے کسی مندر میں وہ شیو بھگوان کی داسی ہے - دور دور تک اس کا شہرہ ہے - اور ایک ناچ کے لیے اسے بہت روپے دیئے ہوتے ہیں —

وہ آگے پیچھے جھوم رہی ہے - ساتھ ساتھ اس کے برہنہ سیمیں بازو مچل رہے ہیں - اس کی انگلیاں طرح طرح سے مٹک رہی ہیں - انگشت پا جو بچپن سے اپنے کرتب کی مشق کرتے آے ہیں اور بھی اچرج دکھا رہے ہیں - انگوٹھا برابر الگ اور ادھر کھڑا رہتا ہے —

سنہرے کمربند اور اس سینہ بند کے بیچ جس میں اس کے جوبن جکڑے ہوے ہیں اس کے چلبلی بدن اور گٹھے ہوے سڈول جسم کی ذراسی پھبن نظر آرہی ہے - سینوں کے نچلے ابھار کی تھرکن کو بھی ہم صاف دیکھ سکتے ہیں - اس کا رقص مختلف اداؤں کے اظہار کا ایک سلسلہ ہے' ایک قسم کی اداکارانہ یک شخصی تمثیل ہے - اس کا رہ رہ کر سامنے آنا اور جھک کر پیچھے لوٹ جانا' تماشائیوں کے جمگھٹ کو چیر کر مجھ پر ٹکٹکی باندھے ہوے بہت قریب آجانا اور پھر بجلی کی طرح اس تاریکی میں گھل مل جانا جو دیوان خانوں کی پشت پر چھائی ہوئی ہے!

وہ شہوت اور ملامت کا ایک نظارہ پیش کر رہی ہے - پس منظر میں سازندے طنبوروں اور بانسریوں سے اس نظارہ کو سرودی

لباس پہنا رہے ہیں —

اداکاری کے ساتھہ وہ زیرلب گاتی بھی جاتی ہے ' اتنے دھیمے سروں میں جنھیں اس کے سوا کوئی اور نہیں سن سکتا - اس سے اس کی یاد داشت تازہ ہوتی جاتی ہے اور اپنے کرتب کے مختلف تمثیلی پہلوؤں کو اجاگر کرنے میں اسے مدد ملتی ہے —

لو وہ دیوان خانے کے تاریک گوشے سے باھر نکلی' سونے روپے سے جگمگاتی ہوئی! گلہ و شکوہ کی پر عتاب اداؤں کے ساتھہ وہ میری طرف لپکتی ہے اور اس انداز سے مجھہ پر ملامت کرتی ہے گویا فلک کو میرے گناہ کی ہولناکی کا شاھد بنا رہی ہے —

یک بیک رقاصہ طنز سے کھلکھلا کر ھنسنے لگتی ہے - اپنی زھر آلود حقارت سے وہ مجھے عرق عرق کردیتی ہے اور طعنہ زن مجمع کو انگلی اتھا کر میری طرف متوجہ کرتی ہے - یہ تو ظاھر ہے کہ اس کی طعن و تشنیع بھی اسی طرح فرضی ہے جس طرح وہ پر غضب بددعا - لیکن اس اداکاری کے فطری ہونے میں ذرا شبہہ نہیں - اس کی کھلکھلاھت اور اداس ھنسی کی صدائے باز گشت اس کے سر جوش سینہ میں گونج رہی ہے - اور جب وہ ھنستی ہے تو اس کا منہ' آنکھیں' ابرو' نیز ھانپتی اور کانپتی ہوئی چھاتیاں بھی ھنسنے لگتی ھیں —

جب وہ اس طرح ھنستی ہوئی پیچھے بھاگتی ہے تو بلا کا اثر ہوتا ہے اور تماشائی اس کے ساتھہ ھنسنے کے لیے مجبور ہو جاتا ہے —

وہ پوری طاقت سے پیچھے پلٹتی ہے ' اپنے سر کو اس طرح موڑ کر تاکہ مجھے دوبارہ نہ دیکھہ سکے - لیکن اب وہ ہولے ہولے بڑی شان کے ساتھہ ادھر آرہی ہے - وہ طعن چھوڑنے کے لیے ھی تھا - اس کی محبت

اٹھاہے - اثر الفت نے اسے پر شکستہ کر کے اس صورت میں واپس بھیجا ہے کہ کبھی تو وہ معافی کی التجا میں دونوں ہاتھ پھیلاتی ہے اور کبھی خود سپردگی کا یقین دلاتی ہے - اور اب جو وہ اپنے سر کو پیچھے پھینک کر اور نیم کشودہ لبوں میں گوہر دنداں کی آب دکھلا کر، جو ہیرے کی کیل کے نیچے جھلک رہے ہیں، باز گشت کرتی ہے تو وہ مجھے دعوت ہم رکابی دیتی ہے - بلکہ وہ مجھے حکم دے رہی ہے - اس کے بازو اس کے جوبن اس کے متوالے نین مجھے اپنے پاس بلا رہے ہیں - اس کی زندگی کا ہر تار سراپا اذن بن گیا ہے گویا وہ مجسم مقناطیس ہے - ذراسی دیر میں بلا ارادہ کہیں میں اس کی دعوت پر لبیک نہ کہہ دوں کیونکہ ان دلربائیوں نے مجھے گرفتار نظر کر لیا ہے - جھوٹے ہیں اس کی محبت کے دعوے! اس کی ہنسی کی طرح یہ بھی اس تماشے کے سپارے ہیں - یہ کون نہیں جانتا - اور پھر بھی اس احساس سے کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا - شاید اس عشوہ طرازی کا علم منظر میں ایک نئی اور شدید کشش پیدا کردیتا ہے۔

جب وہ بھاؤ دکھاتی ہے تو دونوں سازندوں میں اور اس میں ایک مقناطیسی یا پوشیدہ تعلق پیدا ہوجاتا ہے - وہ بھی انسانوں کی قطار میں سے ہو کر آگے آتے اور پیچھے جاتے ہیں، آگے بڑھ کر پھر تین چار قدم پیچھے لوٹ جاتے ہیں - جب میرے پاس آتی ہے تو وہ بھی قریب آجاتے ہیں لیکن اس کی واپسی کے پہلے ہی لوٹ جاتے ہیں - وہ کبھی نظروں سے اسے اوجھل نہیں ہونے دیتے اور ان کی آتشیں نگاہیں اس پر جمی رہتی ہیں - ساتھ ساتھ وہ منہ پھاڑ کر موذن کی سی فلک سیر آواز میں گاتے جاتے ہیں - یہ اونچے پورے سازندے سر جھکا کر اس کے بوتے سے قد کا جائزہ لیا کرتے ہیں - ان کے وتیرے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ استاد ہیں جو اس رقاصہ

کی روح میں سمائے ہوئے ہیں - گویا وہ اپنی آواز سے اس کی رہبری کر رہے ہیں اور اپنے سانس کی گرمی سے اسے گرما رہے ہیں - یا یہ کہ وہ کوئی نازک اور فرخندہ تتلی ہے جسے انہوں نے اپنی مرضی کا غلام بنا رکھا ہے - اس پوری روش میں کوئی ایسی نامعلوم سی شئے ہے جو غیر مرئی اور کج فطرت معلوم ہوتی ہے —

طائفہ جس جگہ بیٹھا تھا وہاں روشنی کچھ ہلکی ہلکی سی تھی - وہاں دو تین خوش لباس رقاصائیں بیٹھی ہوئی تھیں جن کا ناچ پہلے ہو چکا تھا - ان میں سے ایک نے مجھے خاص طور پر متاثر کیا کیونکہ وہ ایک زہریلے مگر حسین پھول سے ملتی جلتی تھی - دراز قامت اور چھریرا بدن جس کے عضو بہت نازک معلوم ہوتے تھے اور آنکھیں کاجل کی لمبی لیک کے بغیر بھی بہت بڑی تھیں - گہرے کالے بال جن کے گچھے چوٹیوں میں گندھے ہوئے ' گالوں پر لہرا رہے تھے - سیاہ لباس ' سیاہ کمر بند اور ہلکی سی روپہلی کور کی کالی نقاب - اس کے گہنوں میں زمرد کے سوا کچھ نہ تھا - کلائی اور ہاتھوں میں بیش بہا لعل اور ناک میں عقیق کا جھمکا جو لبوں پر یوں لٹکا ہوا تھا گویا موٹے موٹے ہونٹوں پر خون کا ایک قطرہ ٹپک پڑا ہو —

لیکن میں ان سب کو بھول گیا - جب میں نے اس رانی کو ' اس ستارہ جبیں کو دیکھا جو یکایک سازندوں کی قطار کو چیر کر نمودار ہو گئی — وہی جو سونے روپے میں لدی ہوئی سب کے بعد سامان نظارہ مہیا کرنے والی تھی —

یہ رقص طویل تھا ' بہت طویل حتی کہ تکان سی معلوم ہونے لگی - تاہم اس لمحہ کے خوف سے میں ہراساں ہو رہا تھا جب وہ ختم ہو جائیگا اور میں پھر کبھی اسے نہ دیکھ سکوں گا —

ایک مرتبہ پھر اسنے ملامت اور مسکراہٹ کا اعادہ کیا - از سر نو اس کی چمکتی ہوئی آنکھوں کا تیز طنز میرے دل میں چبھہ گیا اور لگاوٹ کے وہ اشارے میرے دل میں کھپ گئے —

بالآخر وہ خاموش ہوگئی اور سب کچھہ ختم ہوگیا - میں ہوش میں آتا ہوں اور اس مجمع کو دیکھہ کر یاد کرتا ہوں کہ یہ جشن اور اس کی حقیقت کیا تھی - اب بر خاست ہونے کا وقت ہوگیا ہے اور میں اپنا ہدیۂ تحسین پیش کرنے کی غرض سے رقاصہ کے پاس جاتا ہوں - وہ ایک جھینے ہیلے رومال سے منہ کا پسینہ پونچھہ رہی ہے - گرمی کے مارے اس کی پیشانی سے پسینہ کی بوندیں مرمریں اور سرمئی سینے پر ڈھلک رہی ہیں - اب بالکل بے نیازی ، بے پروائی اور تکلف کے ساتھہ یہ تھکی ہاری تجاہل کوش تماشا گر مجھے سلام کرتی ہے - اس ہندوستانی سلام کے بھولے پن میں بھی تیکھا طنز پنہاں ہے - ہر سلام کے ساتھہ وہ اپنے رخ زیبا کا پردہ دار ہاتھوں کو بنالیتی ہے جن کے پور پور میں ہیرے دمک رہے ہیں —

کسی رقاصہ کی روح نسل اور نجابت کی کیا پروا کرتی ہے ؟ وہ خاندانی نرتکیوں کی اولاد ہے جسے سیکڑوں اور ہزاروں سال سے یہ تعلیم دی گئی ہے کہ وہ محض عیش و عشرت کی بندی ہوکر زندگی گزار دے —

بینظر اور بدر منیر کی شادی کا جلسہ

کروں راگ اور ناچ کا کیا بیاں　　قدیمی کسی وقت کا سا سماں
وہ ارباب عشرت کا آپس میں مل　　جمانا کھڑے راگ کا دے کے دل
وہ ایمن کی تانیں ادھر اور اُدھر　　ملے سر طنبوروں کے با یکدگر
اور اس صف سے ایک چھوکری کا نکل　　جتانا ہنر اپنا پہلے پہل

التلا دوپٹے کا دے دے کے تال
وہ بوٹا سا قد اور گھنگرو کی چال

کبھی پرملو میں دکھاتی ادا
کہ جوں لوٹ کر ہووے بجلی ہوا

کبھی گت سری ناچنا ذوق سے
کہ تیورا کے عاشق کرے شوق سے

ادھر کی تو یہ گت اور اس کا یہ بھاؤ
اُدھر اوٹ میں نائیکہ کا بناؤ

کھڑی ہو کے دو گھونٹ حقہ کے لے
چبا پان اور رنگ ہونٹوں پہ دے

انگوٹھی کی لے سامنے آرسی
وہ صورت کو دیکھ اپنی گلزار سی

الٹ آستیں اور مہری کا چاک
نئے سر سے انگیا کو کر ٹھیک ٹھاک

بنا کنگھی اور کر کے ابرو درست
جھٹک دامن اور ہو کے چالاک چست

دوپٹے کو سر پر الٹ اور سنبھل
یکایک وہ صف چیر آنا نکل

پکڑ کان اور گھنگھروؤں کو اٹھا
پہن پانؤ میں اور سر سے چھوا

ادھر اور اُدھر رکھ کے کاندھے پہ ہاتھ
چلے ناچتے آنا سنگت کے ساتھ

فتح چند کے ہاتھ کی مورت ایک
لجائی سوئی چاند سی صورت ایک

کبھی ناچنا اور گانا کبھی
رجھانا کبھی اور بتانا کبھی

روسی ناول

دوسرا دور

ویسیوولود میخائلووچ گارشن

(۱۸۵۵ - ۱۸۸۸)

از

[جناب محمد مجیب صاحب بی۔اے (آکسن]

گارشن اپنے خاندان، تربیت، تعلیم اور طبیعت کے لحاظ سے اپنے زمانے کے خوش حال روسیوں کا ایک مثالی نمونہ تھا، مگر مزاج کی چند خصوصیتوں نے اس کی زندگی پر ایسا اثر ڈالا کہ وہ ان خفیف مسرتوں اور اس ذرا سے سکون سے بھی محروم رہا جو مایوسی اور ندامت کے اس دور میں تعلیم یافتہ طبقے کے لوگوں کو کبھی کبھی نصیب ہوجاتا تھا۔ ابھی اس کی تعلیم ختم ہوئی نہیں تھی کہ ترکی اور روس کے درمیان جنگ چھڑ گئی (۱۸۷۶)، اور گارشن ایک معمولی سپاہی کی حیثیت سے فوج میں بھرتی ہوگیا۔ اگست ۱۸۷۷ میں وہ ایک معرکے میں زخمی ہوا، اور چار دن تک ایک مردہ ترک کے پہلو میں پڑا کراہتا رہا۔ ہسپتال میں پہنچ کر جب وہ اس قابل ہوا تو اس نے اپنی سرگزشت ایک افسانے کی شکل میں لکھی جس کا عنوان "چار دن" تھا، اور اس ایک قصے

نے اسے ادبی دنیا میں مشہور کر دیا - صحت پانے کے بعد اس نے انشا پردازی کو اپنا ذریعۂ معاش بنا لیا، اور اسے خاصی کامیابی ہوتی رہی - مگر اس کی طبیعت میں قوت برداشت بالکل نہیں تھی، اور اس پر آفت یہ تھی کہ وہ بہت نازک مزاج اور حساس بھی تھا - آہستہ آہستہ اس کی طبعی مایوسی اور حزن جنون کی حد تک پہنچ گیا، اور جب اس کے ایک عزیز دوست کو پھانسی دے دی گئی اور اسی کے ساتھ چند اور واقعات ہوے جن سے اس کے دل کو سخت چوٹ لگی تو اسے جنون کا ایک شدید دورہ ہوا - اسی میں وہ مکان کے زینے سے نیچے کود پڑا، اور تین چار روز بعد مر گیا —

۱۸۷۶ کی لڑائی میں گارشن اس سبب سے نہیں شریک ہوا تھا کہ اسے وطن سے محبت یا ترکوں سے نفرت تھی - اس کا خیال تھا کہ اسے ان مصیبتوں سے بچے رہنے کا کوئی حق نہیں جن میں ہزاروں بے گناہ خواہ مخواہ مبتلا کر دیے گئے ہیں، اور یہ نقطۂ نظر اس کی سیرت کے سب سے اہم پہلو کو ظاہر کرتا ہے - اس نے جس فضا میں نشو و نما پائی وہ ندامت، مایوسی اور پشیمانی سے معمور تھی، اور اس فضا نے درد اور ہمدردی کے جذبے کو اس کے لیے سوہان روح بنا دیا - روسی انشا پردازی میں حزن اور مایوسی کی ہر کیفیت پائی جاتی ہے، مگر مرغ بسمل کی طرح لوٹنا اور تڑپنا گارشن ہی کا حصہ ہے - "چار دن" میں اس نے بڑی سادگی سے ایک سپاہی کی تکلیفیں بیان کی ہیں، بالکل اسی طرح جیسے ایک بے زبان سپاہی بیان کرتا جس میں شکایت کرنے کی جرأت نہیں ہے، مگر جس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ لڑ کر ایک دوسرے کا خون کیوں بہاتے ہیں، اور اسے وطن اور عزیزوں سے چھڑا کر اس کشت و خون میں شریک

کرنے سے کسی کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے - ایک اور افسانے میں جس کا عنوان "بزدل" ہے، گارشن نے یہی داستان ذرا انداز بدل کر سنائی ہے - اس قصے میں ایک نوجوان جو جنگ کو اخلاقی جرم مانتا ہے لڑائی میں شریک ہوکر اپنی جان دے دیتا ہے، اس لیے کہ وہ بھی گارشن کی طرح اپنے آپ کو ایک وبا سے جس میں لاکھوں معصوم جانیں ضایع ہو رہی تھیں محفوظ رکھنا بزدلی اور نامردی سمجھتا ہے - اسے یقین ہوگیا ہے کہ اپنی جان بچالینے میں کوئی مصلحت نہیں ہوسکتی۔ اس کے سامنے ایک تندرست اور خوبصورت دوست کی مثال ہے جو کسی لڑکی پر عاشق ہوکر زندگی سے ایسا بیزار ہوگیا کہ ایک معمولی مرض کو بڑھاتے بڑھاتے مہلک بنا لیا - اس کی معشوقہ کا انجام اس سے کچھ بہتر نہیں ہوا کیوں کہ جب اس نے اپنی بے التفاتی کا درد ناک انجام دیکھا تو اس کے دل کی کیفیت ایک بجھے ہوے چراغ کی سی ہوگئی جس میں کوئی آرزو اور کوئی امید روشنی پیدا نہ کرسکی—

گارشن کے سب سے مشہور افسانے "سرخ پھول" اور "اتالیہ پرنسپس"* ہیں - "سرخ پھول" ایک دیوانے کا قصہ ہے جسے پاگل خانے کے باغ میں تین سرخ پھول نظر آے، اور انہیں دیکھتے ہی اسے یقین ہوگیا کہ یہ پھول دنیا کی کل برائی کے مجسمے ہیں، اگر وہ توڑ ڈالے جائیں اور ان کے بیج زمین پر نہ گرنے پائیں تو دنیا سے برائی بالکل مٹ جاے گی - وہ ساتھ ہی یہ بھی سمجھ لیتا ہے کہ یہ پھول بہت زہریلے ہوں گے، اور کوئی تعجب نہیں اگر انہیں توڑ کر کپڑوں میں چھپانے سے انسان کے جسم میں زہر پھیل جاے اور وہ ہلاک ہوجاے - مگر وہ ایثار پر آمادہ ہے - وہ بڑی چالاکی سے رات کو محافظوں کی آنکھ بچاکر ایک ایک کرکے تینوں پھول توڑ لیتا ہے، اور انہیں اپنے سینے میں

---

* تاڑ کی ایک قسم جو جنوبی امریکا میں پائی جاتی ہے -

چھپا لیتا ہے - آخری پھول توڑنے کے لیے اسے سردی میں اُٹھ کر چوروں کی طرح دیواروں پر چڑھنا اور کھڑکیوں سے نیچے کودنا پڑا ' اور اس مہم سے واپس ہونے کے بعد اس کے قویٰ نے بالکل جواب دے دیا - سویرے جب اس کے محافظ اسے دیکھنے آے تو وہ مرا پڑا تھا ' مگر اس کے چہرے پر شگفتگی اور رونق تھی جو پہلے کبھی نہیں دکھائی دی تھی ' اور معلوم ہوتا تھا کوئی گہری مسرت اس کے منہ کو بوسہ دے رہی ہے - اس قصے کو ہم واقعہ نگاری سمجھیں یا استعارہ ' اس کی خوبی اور عبرت انگیزی ظاہر ہے ' اور اس کے درد اور طنز کا کانٹا دل میں ایسا چبھ جاتا ہے کہ پھر نکالے نہیں نکلتا - گارشن خود کچھ دن پاگل خانے میں رہا تھا ' اور اس افسانے میں اس نے وہی فضا پیدا کردی ہے - اپنے دیوانے ہیرو کی طرح گارشن بھی تمام عمر دنیا کو برائیوں سے پاک کرنے کی آرزو میں تڑپتا رہا تھا ' اور یہ قصہ بالکل آپ بیتی معلوم ہوتا ہے - قصے کے ادبی اوصاف بھی بیان کے محتاج نہیں ' لیکن ایسے جلوں آموز حزن کی تاب لانا ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے —

" اتالیہ پرنسپس ' میں بھی درد اور مایوسی کا وہی عالم ہے جو " سرخ پھول " میں - نباتیات کے ایک روسی ماہر نے جنوبی امریکا سے تاڑ کے ایک درخت کو لاکر اپنے باغ میں لگایا ' اور اسے سردی سے محفوظ رکھنے کے لیے ایک شیشے کے گرم خانے میں رکھا * یہ تاڑ کی ایک بہت نایاب قسم تھی ' اور لوگ اسے دور دور سے دیکھنے کو آے ان میں سے ایک جنوبی امریکا کے اس خاص علاقے کا رہنے والا تھا جہاں سے تاڑ کا درخت لایا گیا تھا - درخت کو دیکھتے ہی وطن کی یاد نے اس کو ایسا بے قرار کردیا کہ پردیس میں ایک لمحہ اور گزارنا اسے گوارا نہ ہوا اور وہ فوراً وطن روانہ ہوگیا -

* Hot house

ایسے ہی کسی جذبے نے تاڑ پر بھی اپنا جادو کردیا - اس نے اپنا سر اٹھایا اور بڑھتے بڑھتے گرم خانے کی چھت تک پہنچ گیا - ماہر نباتیات کو خوف ہوا کہ گرم خانے کی چھت پھٹ پڑے گی اور اس وجہ سے اس نے درخت کو کٹوا کر باہر پھنکوا دیا یہ انجام ہوا بیچارے درخت کی آرزوؤں اور کوششوں کا، اور یہ حقیقت تھی ان لوگوں کی قدردانی کی جنھوں نے اسے اپنی اصل سرزمین سے جدا کرکے پردیس میں ایک اعجوبہ بنا کر رکھا تھا۔

گارشن کا شمار روس کے سربرآوردہ انشاپردازوں میں نہیں ہوتا، اور دراصل وہ اس کا مستحق بھی نہیں ہے - اس کے تخیل میں قوت کی کمی اور درد کی بہت زیادتی تھی، زندگی کی جو تصویریں وہ دکھاتا ہے ان پر ایک مردنی چھائی ہوتی ہے جسے برداشت کرنا آسان نہیں اور اسے برداشت کرنے سے کوئی فائدہ بھی نہیں معلوم ہوا - خاکساری، ایثار دوسروں کے درد کو اپنا درد بنا لینا بلند اخلاقی اوصاف ہیں، لیکن گارشن کے فلسفے میں وہ زندگی کی بنیاد نہیں ہیں بلکہ زندگی کو برباد کرتے ہیں - گارشن نے حقیقت کو کبھی نظر انداز نہیں کیا، اس کے کیرکٹر گھڑے ہوئے نہیں معلوم ہوتے - لیکن دنیا میں بیماری ہے تو تندرستی بھی ہے، اگر کسی جماعت میں اتفاق سے اکثریت بیماروں کی ہوجائے تب بھی تندرستی ہی کو سب کا نصب العین اور سب کے لیے دائمی حقیقت کا مظہر ہونا چاہیے۔

ولا جیمر گلا کتیونووچ کورولینکو

(۱۸۵۳ - ۱۹۲۱ء)

کورولینکو ڈوگول کا ہم وطن یعنی روس کے جنوب مغربی صوبے اوکرائن کا رہنے والا تھا - اوکرائن کی زبان روسی سے جدا ہے، اور یہاں کے لوگ صورت اور سیرت میں روسیوں سے اس قدر مختلف ہیں کہ ان میں

ہمیشہ سے قومیت کا ایک جذبہ موجود ہے جو ان کے اور روسیوں کے درمیان کشیدگی پیدا کرتا رہا ہے - لیکن گوگول کی طرح کورولینکو کی تعلیم بھی روس میں ہوئی اور اس کی زبان بہت شستہ اور فصیح ہے - اپنے سیاسی خیالات کی بنا پر کورولینکو پیٹربرگ کے مدرسۂ صنعت و حرفت اور پھر ماسکو کے مدرسۂ زراعت سے نکالا گیا' اور ۱۸۷۹ میں ملک بدر کر کے سائبیریا بھیج دیا گیا - چھ سال کے بعد اسے روس واپس آنے کی اجازت ملی' اور اسی وقت اس کی پہلی قابل قدر تصنیف' ایک لمبا افسانہ جس کا عنوان "ماکار کا خواب" تھا' شایع ہوا - دس برس تک کورولینکو افسانہ نویسی میں مشغول رہا' اور اس نے خاصی مقبولیت اور شہرت حاصل کرلی' مگر پھر وہ انشا پردازی ترک کرکے پولیس اور نظام عدالت کی اصلاح کی فکر میں پڑگیا' اور آخر عمر تک بس ایک ناول اور لکھہ سکا جو اس کی آپ بیتی ہے - کورولینکو بولشیوک پارٹی کا ہم خیال نہیں تھا' مگر اس نے بولشیویکوں کی عملی مخالفت بھی نہیں کی —

کورولینکو سیاسی معاملات میں بہت دلچسپی لیتا تھا اور اس کا میلان انتہا پسندی کی طرف تھا' لیکن اس کے افسانوں میں اس کے سیاسی خیالات کا عکس بہت کم نظر آتا ہے - اس کا فلسفۂ حیات تورگنیف کے عقائد سے بہت ملتا جلتا ہے' اور تورگنیف کی طرح وہ بھی چاہتا ہے کہ انسانی زندگی اور اس کے قدرتی ماحول کو ایک شعر کے دو مصرعے بنادے - اس کا یہ رنگ بہت پسند کیا گیا' اس وجہ سے کہ جس زمانے میں کورولینکو نے ادب کے میدان میں قدم رکھا' اس وقت تورگنیف کا دوبارہ چرچا ہو رہا تھا- لیکن کورولینکو محض ایک مقلد کی حیثیت نہیں رکھتا - اس کے بیان میں شاعرانہ انداز کے ساتھہ ایک ظرافت پائی جاتی ہے جو تورگنیف کی تصانیف

میں نہیں ملتی' اور وہ اس حزن سے بھی نا آشنا معلوم ہوتا ہے جو تورگنیف کے تخیل پر چھایا ہوا تھا - دراصل کورولینکو اپنے اوکرائنی پیش رو گوگول سے زیادہ مشابہت رکھتا ہے' اگرچہ اسے گوگول کا جوش اور جولانیت اور تخیل کی فراوانی نصیب نہیں ہوئی - مگر دوسری طرف کورولینکو کی ظرافت مردم بیزاری کے دھبے سے بالکل پاک ہے' اور اس انسان کی خلقی نیکی کا اتنا گہرا اور سچا اعتقاد کہ اس کے افسانے پڑھنے والے کو مایوس یا مغموم نہیں کرتے' اور اس اعتبار سے وہ روسی انشا پردازوں میں اپنا جواب نہیں رکھتا —

" ماکار کے خواب " میں کورولینکو نے شمال مشرقی سائبیریا کے مناظر کی کیفیات بیان کی ہیں - افسانے کا ہیرو اس علاقے کی ایک نیم وحشی قوم " یاقوت " کا ایک آدمی ہے - کورولینکو نے اس کی طبعی خود مرضی کو واضح کیا ہے' مگر ساتھ ہی یہ دکھایا ہے کہ اس خود غرضی کی تنگ و تاریک فضا میں انسانیت اور اخلاقی بے غرضی کا چراغ بھی ٹمٹما رہا ہے - " بری صحبت " میں مناظر قدرت کا عکس اتارنے میں کمال دکھایا گیا ہے' مگر اس کے پلاٹ اور کیرکٹروں میں کوئی خاص خوبی نہیں ہے - " رات " " یوم جزا " اور " بے زبان " کورولینکو کی ظرافت کے بہترین نمونے ہیں - " رات " میں بچوں کی ایک شبانہ مجلس کی کارروائی بیان کی گئی ہے' جس میں وہ بیٹھ کر اس اہم مسئلے پر رائے زنی کرتے ہیں کہ بچے کیسے بنائے جاتے ہیں - " یوم جزا " ایک عیسائی کی سرگزشت ہے جسے شیطان نے ایک سود خوار یہودی کے شبہے میں جہنم پہنچا دیا' کیونکہ عیسائی میں وہ تمام صفات موجود تھیں جو سود خوار یہودی میں واصل جہنم کرنے کے لیے کافی سمجھی گئی تھیں - " بے زبان " تین اوکرائنی مزدوروں

کا قصہ ہے جو کسب معاش کے لیے امریکا گئے - انہیں اپنی زبان کے سوا
اور کوئی بولی آتی نہیں تھی ' اور اس سبب سے نہایت ہی مضحکہ
خیز وارداتیں پیش آئیں - کورولینکو کی بہترین تصنیف اس کا آخری
ناول ہے ' جس کا عنوان "میرے زمانے کے ایک صاحب کی سوانح عمری "
ہے - اس میں اس کے سارے کمالات ' مناظر قدرت کی مصوری ' ظرافت '
انسانیت اور نوع انسانی سے عقیدت مندی ' سب یکجا ہوگئے ہیں ' اور
اس کی انشا پردازی کا حسن نکھر آیا ہے —

روسی ناول ' دوسرا دور

آنتون پاولووچ چخوف (۱۸۶۰ - ۱۹۰۴)

چخوف کے اجداد جنوبی روس کے شہر تگن روگ کے تاتار تھے جو
پہلے مسلمان تھے اور بعد کو عیسائی ہوگئے - اس کا دادا ایک زرعی
غلام تھا ' مگر اس نے روپیہ پیدا کرکے اپنی آزادی خریدلی ' اور چخوف
کے باپ نے دادا کے قائم کیے ہوے کار و بار کو بہت ترقی دی - چخوف
کا بچپن خوش حالی میں گزرا ' لیکن وہ اسکول ہی میں تھا جب باپ
نے کاروبار میں بہت نقصان اٹھایا اور چخوف کو اسکول میں چھوڑ کر
سارا خاندان ماسکو چلا گیا - ۱۸۷۹ میں چخوف بھی فارغ ہوکر ماسکو
پہنچا اور وہاں کے دارالعلوم کے شعبۂ طب میں داخل ہوگیا - خاندان
کی مالی دشواریاں رفع کرنے کی نیت سے اس نے طالب علمی کے زمانے
میں انشا پردازی کی مشق شروع کردی اور شہر کے معمولی قسم کے اخباروں
اور رسالوں میں اس کے مزاحیہ افسانے شائع ہونے لگے - اس نے جب
سند حاصل کی تو اس شغل سے اس کو خاصی آمدنی ہونے لگی تھی '

اس لیے طبابت کرنے کی جگہ اس نے افسانہ نویسی کو اپنا ذریعۂ معاش بنایا - ۱۸۸۱ میں اس کا تعارف ایک مشہور نقاد گریگوروروچ اور ماسکو کے سب سے بڑے روزانہ اخبار کے مدیر سووورن سے ہوگیا گریگوروروچ کی سرپرستی کی بدولت روس کی ادبی دنیا میں چخوف کی ایک خاص حیثیت ہوگئی، اور جب سووورن اس کے افسانے اپنے اخبار میں شایع کرنے لگا تو چخوف کو نفیس مذاق اور وسیع نظر رکھنے والے قدرداں مل گئے، جن کی نکتہ رسی ہر صاحب ہنر کو اپنے جوہر دکھانے کا حوصلہ دلاتی ہے - چخوف نے مسخرے پن کا وہ انداز جو اس نے ادنیٰ اخباروں کی خاطر اختیار کیا تھا چھوڑ دیا، اور رفتہ رفتہ اس کے افسانوں میں وہ خاص رنگ پیدا ہوگیا جو اس کی امتیازی صفت ہے - ۱۸۸۷ میں اس کا پہلا ڈراما دکھایا گیا، مگر ڈراما نویس کی حیثیت سے وہ اسی وقت مقبول عام ہوا جب ماسکو آرٹ تھیئٹر نے اس کے ڈرامے دکھانا شروع کیا * —

۱۸۹۰ میں چخوف سخالن کے جیل خانے اور سزا یافتہ مجرموں کی حالت کا معائنہ کرنے کے لیے مشرقی سائی بیریا گیا اور "سخالن" کے عنوان سے اپنی رپورٹ شایع کی، جس کا ریاست اور عام تعلیم یافتہ روسیوں پر بہت اثر ہوا - ۱۸۹۱ میں ماسکو کے قریب کئی ضلعوں میں قحط پڑا، اور پھر انہیں ضلعوں پر ہیضے کا بہت شدید حملہ بھی ہوا - ان دونوں موقعوں پر چخوف نے مصیبت زدوں کی بڑی جاں فشانی سے خدمت کی - جب اس کی مالی حالت سنبھل گئی تو اس نے ماسکو سے پچاس میل کے فاصلے پر ایک مکان مول لیا اور ایک نوآبادی کی بنا ڈالی جسے وہ دیہاتی بستیوں کا مثالی نمونہ بنانا چاہتا تھا اور جس کی

---

* چخوف کے ڈراموں کا مفصل ذکر "روسی ڈراما" کے تحت میں آئے گا -

ترقی کے خواب وہ عمر بھر دیکھتا رہا - وہ آس پاس کے کسانوں کا علاج کرتا تھا اور دوائیں مفت تقسیم کرتا تھا' اس کے علاوہ اس نے ایک ایک اسکول بھی قائم کیا اور گانو کو خوبصورت بنانے کے لیے اس کے گرجا میں ترمیمیں کرائیں - اس کا آبائی شہر تگن روگ اس کی توجہ سے محروم نہیں رہا وہاں بھی وہ ایک کتب خانہ' ایک ادبی عجائب خانہ اور تاجروں کو ہر طرح کی معلومات اور اطلاعات فراہم کرنے کے لیے ایک دفتر یادگار چھوڑ گیا -

چخوف کو جوانی سے کھانسی کی شکایت شروع ہوگئی تھی' اور بلغم کے ساتھہ اکثر خون بھی گرا کرتا تھا - یہ شکایت دق کا پیش خیمہ تھی - لیکن چخوف نے اس کی مطلق پروا نہیں کی' اور اپنے عزیزوں کو پریشانی سے بچانے کے لیے مرض کو حتی الامکان چھپاتا رہا - ۱۸۹۷ کے بعد اس کی حالت بہت خراب ہوگئی' اور اس کی زندگی کے بقیہ سات سال زیادہ تر علاج کرنے میں صرف ہوئے - اس زمانے میں بھی اِس کے ادبی مشاغل جاری رہے' اور اس کے ڈراموں نے اسے خاص طور پر ہردل عزیز کر دیا - ۱۹۰۴ میں اس کا ڈراما " شاہ دانے کا باغ " دکھایا گیا تو ناظرین پر ایک وجد کی سی کیفیت طاری تھی' اور تماشے کے بعد جب دستور کے مطابق مصنف اسٹیج پر بلایا گیا اور اس کی صورت دیکھہ کر معلوم ہوگیا کہ وہ صرف چند دن کا مہمان ہے تو پورے مجمع کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے - اسی کے تھوڑے دن بعد چخوف کا جنوبی جرمنی کی ایک صحت گاہ باڈن وائلر میں انتقال ہو گیا - اس کے ماتم میں ایک روسی قوم نہیں بلکہ ساری مغربی دنیا شریک تھی' اور اس کا جنازہ اس دھوم سے اٹھا کہ دستوفسکی کے سوا کسی اور کا نہ اُٹھا ہوگا -

۱۸۹۰ کے بعد چخوف نے کئی مرتبہ یورپ کا سفر کیا ' عام طور سے اس کا ملنا جلنا متوسط طبقے کے تعلیم یافتہ لوگوں سے رہتا تھا ' اور اس کے افسانوں میں زیادہ تر انہیں کی زندگی کے نقشے کھینچے گئے ہیں - یورپی تہذیب اور اس تہذیب کے مارے ہوے تعلیم یافتہ روسیوں سے تعلق رکھنے کے باوجود کسانوں' مزدوروں اور ادنی قسم کے تاجروں کی بہبودی کی ایسی فکر رکھنا جیسی کہ چخوف کو تھی ذہنی اور روحانی صحت کی ایک روشن دلیل ہے - چخوف کی تصانیف پر غور کرتے وقت ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ وہ نہایت نیک دل ' ہم درد ' مخلص اور بڑی محبت کا آدمی تھا ' اور اس کے دل میں انسانی زندگی کو سدھارنے اور سنوارنے کے بڑے حوصلے تھے - وہ بہت ملنسار اور مہمان نواز تھا اور لوگوں کی ہر طرح مدد کرنے میں اُسے بہت لطف آتا تھا - خاندان کی پرورش کا بار تمام عمر اسی کے ذمے رہا ' اور یہ ذمہ داری اس نے خوشی سے منظور کی اور بہت مستعدی اور محبت سے پوری کرتا رہا - اس کی شخصیت ایسی نہیں تھی کہ دوسروں پر حاوی ہوجاے ' لیکن اس کی مردم دوستی سب کو اپنی طرف کھینچتی تھی ' روس کے بہت سے نوجوان انشاپرداز اس کی سرپرستی سے فیض یاب ہوے ' اور جن لوگوں کی شہرت پہلے سے قائم تھی انہیں اس کے ادب اور احترام نے خوش رکھا ؛ تالستائی سے اس کے بہت اچھے تعلقات تھے ' تالستائی نے کئی خطوط میں اس کی تعریف کی ہے ' اوراس کے ایک افسانے پر تبصرہ کیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ چخوف کو انسانی سیرت کا عکس اُتارنے میں کیسا ملکہ تھا اور تالستائی کی نظر کیسی نکتہ بیں تھی —

چخوف افسانہ نویسی کے ایک نئے اور نرالے طرز کا موجد مانا جاتا

ہے جو زندگی کی کیفیات اور انسان کے احساسات بیان کرنے کے لیے اس قدر موزوں ہے کہ اس نے فن افسانہ نویسی میں ایک انقلاب پیدا کردیا - سب سے نمایاں خصوصیت اس نئے طرز کی یہ ہے کہ اس میں قصہ سنانے کا خیال بالکل نظر انداز کیا گیا ہے - دوسرے روسی انشا پردازوں کی طرح چیخوف بھی داستان کو معنی خیز بنانے کے لیے غیر معمولی حادثوں کا سہارا نہیں ڈھونڈھتا تھا' اس کے قلم میں معمولی واقعات اور احساسات کو اس صفائی اور وضاحت سے پیش کرنے کی قدرت تھی کہ اس کے افسانے سیدھی سادی حقیقت ہی کی بدولت لطیف اور دلکش ہوجاتے ہیں - عام طور سے چیخوف افسانے کے لیے اپنے ہیرو یا ہیروین کی سرگزشت کا کوئی ایسا موقع یا واقعہ منتخب کرتا ہے جو ایک مثالی نمونہ قرار دیا جاسکے' اور اس کو وہ ایک شمع بنادیتا ہے جس کی روشنی میں اس کے ہیرو کی ساری زندگی اور تمام مزاجی اور روحانی کیفیتیں آپ ہی آپ نظر آنے لگتی ہیں - اس کے طرز بیان کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ ہم اس فضا سے گھر جاتے ہیں جس کا عکس اتارنا چیخوف کا مقصد ہوتا ہے' یہاں تک کہ چیخوف کے فنی کمالات کو ہم اپنی نظر کی گہرائی اور ادراک کی خوبی سمجھنے لگتے ہیں' اس نے خواہ کتنی ہی نازک بات پیدا کی ہو' ہم سمجھتے ہیں کہ ہماری نظر پہلے ہی اس پر پڑگئی تھی' اور ہم چاہتے تو اسے خود بھی اسی طرح بیان کردیتے - ایسے ہی وہ ہزارہا اپنے اپنے رنگ کی نرالی طبیعتیں رکھنے والے لوگ جن سے چیخوف ہمارا تعارف کراتا ہے سب اپنے جانے بوجھے دوست آشنا معلوم ہوتے ہیں' جن کے حلیے اور سراپا سے ہم بخوبی واقف ہیں جن کی سیرت اور خصلت کو ہم اچھی طرح پہچانتے ہیں' جو کچھہ ان پر

گزری وہ ہمارا سنا ہوا قصہ ہے اور جو کچھہ ہونے والا ہے وہ ہمارے لیے کوئی راز نہیں - چخوف نہ تو خط و خال کی باریکیوں پر جان دیتا' جو عہد مغلیہ کے مصوروں کا دستور تھا' اور نہ اصلیت سے قطع نظر کرلیتا ہے جیسا کہ یورپ کے جدید مصور کرتے ہیں - بعض نقاد یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اس کی دنیا میں دھوپ چھاؤں نہیں' دن رات نہیں' بس ایک جھٹپٹا سا رہتا ہے جس میں کوئی چیز صاف نظر نہیں آتی' اسی وجہ سے اس کی تصویروں میں کوئی رنگ نہیں' جو صورتیں اس نے بنائی ہیں وہ دھندھلی اور سب ایک سی معلوم ہوتی ہیں - ایک حد تک تو یہ اعتراض درست ہے' لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ روس اور تمام یورپ میں طریقۂ تعلیم' معاشرتی انقلابات اور سیاسی اور اخلاقی دباؤ نے یک رنگی کو ایک وبا بنا دیا ہے' نرالے اوصاف کے لوگ ڈھونڈھے سے بھی نہیں ملتے' اور زندگی کا ایسا مصور جو ذہنی اور اخلاقی فضا کی ہر کیفیت سے متاثر ہوتا ہو حقیقت کا اتنا پابند ضرور ہوجاتا ہے کہ اس یک رنگی کو ہر جگہہ دکھائے - یورپ کی زندگی کو دیکھتے ہوے چخوف نے اپنے افسانوں میں پھر بھی بہت کچھہ رنگ پیدا کیا ہے' کیونکہ وہ بہت سی نازک کیفیتوں کو جو دوسرے ملکوں کے ناول نویسوں سے پوشیدہ رہیں بڑی نکتہ رسی کے ساتھہ بیان کرتا ہے —

چخوف کی تصویروں کے دھندھلے ہونے کی شکایت وہی لوگ کرتے ہیں جو انگریزوں کی طرح ناول اور افسانے کو دراصل حسن و عشق کی دلچسپ داستان سمجھتے ہیں - یہ تو ایک مانی ہوئی بات ہے کہ ہر صورت' اور خصوصاً حسین صورت کسی نہ کسی اعتبار سے نرالی ہوتی ہے' اور عشق کا جذبہ ایسا جامہ زیب ہے کہ ہر لباس اس پر نیا اور اچھا لگتا ہے - لیکن یہ

بھی ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ عشق بالکل خیالی نہیں تو اس قدر ناپائدار جذبہ ضرور ہوتا ہے کہ اسے زندگی کی حقیقتوں میں شمار کرنا اپنے آپ کو دھوکا دینا ہے، اس کی بدولت داستان چٹپٹی ہوجاتی ہے، مگر اور بہت سے احساسات جو اتنے ہی لطیف اور رنگین ہیں بیان سے محروم رہ جاتے ہیں، اور اس لحاظ سے یک رنگی کا اعتراض چخوف سے زیادہ ان انشا پردازوں پر عائد ہوتا ہے جو پڑھنے والوں کو طرح طرح سے حسن و عشق کے شعبدے دکھاکر لبھاتے ہیں - چخوف ہر شخص کو عاشق یا معشوق نہیں سمجھتا' اس نے انسان کے احساسات کو ایک جذبے تک محدود نہیں رکھا' ایک ہی تصویر کو پس منظر اور گردوپیش بدل بدل کر نہیں دکھایا - ظاہر ہے انسانی زندگی کا ہر پہلو اتنا رسیلا نہیں ہوتا جتنی حسن و عشق کی کشمکش' لیکن حقیقت نگار کی نظر پوری حقیقت پر ہونا چاہیے' اور چخوف نے حقیقت کو مدنظر رکھنے کے علاوہ اس میں ایسی جان ڈال دی ہے کہ جو کچھہ وہ بیان کرتا ہے ہم سمجھتے ہیں کہ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھہ رہے ہیں یا دیکھہ چکے ہیں —

اسی حقیقت کا ایک رخ مردوں' عورتوں کے تعلقات ہیں - ایسے ناول نویس بہت ہیں جنھوں نے سطحی دلچسپی کی حد سے گزر کر انسانی فطرت کی گہرائیوں میں غوطہ لگایا ہے اور کسی نہ کسی قیمت کا موتی لے کر آے ہیں - لیکن ایک دو موتیوں سے زیادہ کسی کے ہاتھہ نہیں لگے' اور ان کے مشاہدے میں یہ لوگ ایسے محو ہوگئے کہ انہیں اس خزانے کا خیال ہی نہیں رہا جس میں سے وہ ان چند موتیوں کو نکال کر لاے تھے - فرانسیسی انشا پرداز عورت کی چالاکی اور لذت پرستی کے مرقع کھینچنے میں ماہر ہیں' اور اس میدان میں کوئی ان کی برابری کا دعوی

نہیں کر سکتا - انگریز مصنف اب تک محبت کی داستانیں سنانا اپنا فرض منصبی سمجھتے تھے ' لیکن اب وہ اس سے کچھہ اکتا گئے ہیں اور جدید ترین ناول نویس عورتوں سے بیزار معلوم ہوتے ہیں - نسوانی سیرت کا پورا حق در اصل صرف روسی ادا کر سکے ہیں - ان کی معاشرت کا کئی صدیوں سے کچھہ ایسا رنگ رہا ہے کہ وہ اخلاقی پابندیاں جو دوسرے ملکوں میں معیار کا کام دیتی ہیں ان کے یہاں تسلیم ہی نہیں کی گئیں ' جنسی جذبات ان کے نزدیک اسی قسم کی قدرتی خواہشیں ہیں جیسی بھوک اور پیاس ' اور کسی نے غلطی سے یا جان بوجھہ کر کوئی بے قاعدگی یا زیادتی کی تو وہ اس کے عمل کو فلسفیانہ غور و فکر کا موضوع نہیں بناتے اور نہ اُسے اخلاقیات کے کانٹے پر تول کر رتی ماشے کا فرق نکالتے ہیں - وہ عشق مجازی کو اس طرح نہیں لکھتے کہ پڑھنے والا دھوکے سے اس کو حقیقی سمجھہ لے ' اور نہ لذت پرستی کو ایسا سنوارتے ہیں کہ لوگ خواہ مخواہ اس پر فریفتہ ہو جائیں اور ضبط نفس کو بد مذاقی یا بے حسی سمجھنے لگیں - چخوف اس اعتبار سے بھی سچا روسی تھا ' اس نے نسوانی سیرت کی کسی خصوصیت کو مرکزی حیثیت نہیں دی ہے ' اس نے عورت کو کسی صفت یا کسی عیب کا مجسمہ نہیں ٹھہرایا ہے ' اس کے افسانوں کے نسوانی کیرکٹر سب انسان ہیں ' اور انسانوں میں جو طرح طرح کی خوبیاں اور خامیاں ہوتی ہیں وہ ان میں بھی پائی جاتی ہیں - اپنے فرانسیسی ہم چشم موپساں (Manpaes ant) کی طرح چخوف عورتوں سے ڈرنا ' نفرت کرنا یا انہیں حقیر اور پست حوصلہ سمجھنا نہیں سکھاتا ' اس کا فلسفۂ حیات بہت زیادہ وسیع اور ہمہ گیر ہے - دوسری طرف وہ عورتوں کو دیویاں بنا کر پوجتا بھی نہیں ہے - مگر مرد' عورتیں ایک دوسرے کی صورت اور سیرت

سے جو اثر لیتے ہیں اس کو وہ نظر انداز نہیں کرتا ' جیسے اس کو اور
تمام کیفیتیں بیان کرنے میں کمال ہے ویسے ہی وہ اس لگاؤ کو جو خود
بخود پیدا ہو جاتا ہے ' آغاز محبت کے اس نشے کو جس میں دل و دماغ
چور رہتے ہیں' اس بے صبری اور بے چینی اور جدائی کی اُن تکلیفوں کو
جو محبت کی دلیل مانی جاتی ہیں بڑے رسیلے اور لطیف انداز سے بیان
کرتا ہے - اس کے افسانے حسن اور عشق کی شعبدہ بازیوں سے خالی ہیں '
مگر اس کے باوجود ان میں ہزاروں دلچسپیاں ہیں اور وہ حقیقت کو ایسے
دلآویز پیرایے میں پیش کرتے ہیں کہ ان کا نقش دل سے مٹائے نہیں مٹتا —

سادی اور موثر حقیقت نگاری کے بعد چیخوف کی سب سے قابل قدر صفت
اس کی ظرافت ہے - اس نے افسانہ نویسی کی بسم اللہ ظریفانہ قصوں
سے کی تھی ' اور سنجیدہ ' متین اور مستند انشاپرداز بننے کے بعد بھی
اس کی ظرافت میں کوئی کمی نہیں ہوئی البتہ اس میں ذرا شائستگی
آگئی - اس کی ظرافت کھری اور سچی ہے ' وہ عبارت اور الفاظ کی مدد
کی محتاج نہیں اس کا کوئی ایسا پہلو نہیں ہوتا جسے صرف روسی زبان
جاننے والے سمجھہ سکیں ' وہ مسخرہ پن سے پاک ہے ' اس میں کسی کی
تحقیر نہیں کی جاتی اور اس سے کسی کا دل نہیں دکھتا - کبھی کبھی ایسا
ضرور ہوتا ہے کہ ہنستے ہنستے دل پر ایک چوٹ سی لگتی اور آنکھہ سے آنسو
ٹپک پڑتے ہیں ' مگر عام طور پر جو ہنسی آتی ہے وہ سیدھی سادی بے تکلف
ہنسی ہوتی ہے - چیخوف کسی کی ناکامی یا حماقت کا مذاق نہیں اڑاتا
کسی خلقی عیب کو اپنی ظرافت کا تختۂ مشق نہیں بناتا ' اس کی مردم
دوستی ہر حالت میں قائم رہتی ہے اور وہ ہنسا ہنسا کر ہم کو بھی
مردم دوست بناتا ہے - ان اوصاف کی بدولت اسے دنیا کے تمام ظریفوں

میں ایک جداگانہ حیثیت اور خاص مرتبہ حاصل ہے اور بہت کم انشا پرداز اس کی ہمسری کا دعویٰ کرسکتے ہیں ۔

۱۸۸۸ میں چیخوف کو روسی اکادمی کی طرف سے " پشکن پرائز " کا نصف حصہ ملا ' اور انعام دیتے وقت اکادمی کے ایک رکن نے اس کی تصانیف پر تنقید بھی کی - چیخوف کی انشاپردازی کا یہ ابتدائی زمانہ تھا ' اس کا شمار نوجوان اور نومشق مصنفوں میں ہوتا تھا ' اس لیے فاضل نقاد نے اس کی قدرتی استعداد کا اعتراف کرتے ہوئے کچھ بزرگانہ نصیحت کرنا اپنا فرض سمجھا ' اور اس پر افسوس ظاہر کیا کہ " مصنف (یعنی چیخوف ' جس کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ زیر بحث تھا) اپنی استعداد کو ایسی فضول باتوں میں ضایع کرتا ہے جو کم و بیش وقتی او اتفاقی ہیں ' اور یہ احساس ہوتا ہے کہ اس نے رستہ چلتے کچھ دیکھ لیا اور اسی کا نقشہ کھینچ رہا ہے یا کسی کی باتوں میں اسے کچھ پسند آیا اور اس نے اسے نقل کر دیا ہے - ...... اس کی زبان میں رس اور فصاحت ہے ' اگرچہ کبھی کبھی اس کی تشبیہیں صحیح نہیں ہوتیں اور محاورے غلط ہوتے ہیں - " چیخوف کی زبان روز مرہ بول چال کی زبان ہے ' جس میں فصاحت اور بلاغت کو کوئی دخل نہیں ' اور تصنع سے بالکل پاک ہے - موضوع کے انتخاب پر جو اعتراض کیا گیا ہے وہ دراصل چیخوف کی حقیقت نگاری کی تعریف ہے - اور اکادمی کے فاضل نقاد نے غلط طریقے پر یہ صحیح بات کہی ہے کہ چیخوف کے قصے " آورد " نہیں ہیں ' " آمد " ہیں - اکادمی کے علاوہ چیخوف کے خاص انداز پر دوسرے روسی نقادوں نے بھی طبع آزمائی کی ہے - ایک مشہور اور با اثر نقاد میخائلوفسکی نے اس کے دماغ کو قابل قدر اور اہم تصورات سے اور اس کے دل کو ایمان

کے نور سے خالی پایا، " اور جس میں یہ نہیں اس میں ظاہر ہے کچھہ بھی نہیں "۔ ایک اور نقاد نے جلھوں نے پیشین گوئی کی تھی کہ چخوف ایک روز کسی چہار دیواری کے سایے میں شراب کی بو میں بسا ہوا مردہ پڑا ملے گا - ان دونوں حضرات کا مطلب یہ تھا کہ چخوف نے ان گہرے سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی مسائل پر بحث نہیں کی ہے جن پر غور کرنا ناول نویسوں کا فرض مانا جاتا تھا، اس لیے کہ ان کا ذکر ناول یا افسانوں کے پیرایے میں نہ کیا جاتا تو سرکاری محتسب کا سامنا کرنا پڑتا تھا - یہ بے شک چخوف کی انشاپردازی کی ایک خامی تھی، لیکن جو شخص اس کی طبیعت اور قومی خدمات سے ذرا بھی واقف ہوتا وہ یہ ہرگز نہیں کہہ سکتا تھا کہ چخوف کو انسانی زندگی کے سدھارنے اور نوع انسانی کا غم غلط کرنے کا حوصلہ نہیں- اس پر اعتراض کیا جا سکتا ہے تو بس اس قدر کہ اس نے نصیحت نہیں کی اور نوجوانوں کو جوش نہیں دلایا- روسی زندگی کا کوئی مسئلہ چخوف کی نظر سے پوشیدہ یا اس کی توجہ سے محروم نہیں رہا، خواہ ہم کسانوں کی جہالت اور جمود کو دیکھیں، یا تعلیم یافتہ طبقے کا ذہنی ہیجان، بے صبری، تلون مزاجی اور عقیدے پر عمل کرنے کی نااہلی، خواہ ہم انقلاب کے شیدائیوں کے حوصلے دیکھیں یا ندامت پسندوں کی کج فہمی اور خود ستائی- چخوف کا مقصد قوم کی اصلاح کی کسی خاص تدبیر یا تجویز کو مقبول عام بنانا نہیں تھا، اور اسی وجہ سے کہ اس کی نظر محدود نہیں تھی، اس کے ذہن پر کوئی خاص حوصلہ یا جذبہ حاوی نہیں ہوسکا- اس کا دل درد سے بھر آئے یا رنج سے نڈھال ہو یا غصے سے کانپ اٹھے، اس کا قلم کبھی نہیں لرزتا، وہ انسانی ہمدردی اور محبت کا دامن کبھی نہیں چھوڑتا اور زندہ دلی اور ظرافت

سے فضا کی گرانی اور داستان کی غمگینی کا بار ہلکا کرتا رہتا ہ
ان لوگوں میں سے تھا جو ہر گناہ معاف کردیتے ہیں' ہر عیب سے چش
پوشی کرتے ہیں' اس لیے کہ وہ انسانی فطرت کو خوب سمجھتے ہیں او
"جو سب کچھہ سمجھتا ہے وہ سب کچھہ معاف کردیتا ہے' —

چیخوف کے منتخب افسانے ڈھائی سو سے کچھہ اوپر ہیں - ان میں
کسی قسم کی ترتیب پیدا کرنا بہت دشوار ہے' اس لیے کہ زندگ
کو مختلف شعبوں میں تقسیم کرنا ' انسانی جذبات اور ان کے ا
کی حد بندی کرنا حقیقت کے بالکل خلاف ہے - ہم افسانوں کی نمایا
خصوصیات کے مطابق انہیں تقسیم کر سکتے ہیں' لیکن یہ یاد رکھنا چاہی
کہ یہ محض کام چلانے کے لیے ہے - کوئی نقاد دو چار نمونے دے کر چیخو
کے افسانوں کی تنقید کا حق ادا نہیں کر سکتا —

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے' چیخوف نے افسانہ نویسی کی ابتد
ظریفانہ قصوں سے کی' ان میں سے زیادہ تر ایسے ہیں جس کا مقصد محض
ہنسانا ہے' کچھہ ایسے بھی ہیں جن میں درد' عبرت یا نصیحت کا پہل
بھی ہے - "مقرر" "بھٹکے ہوے" "سنگ تراشی کا اعجوبہ" "تہمت" "فالتو
"دھونس" وغیرہ خالص ظرافت کے بے مثل نمونے ہیں' جن میں حزن
مایوسی یا درد کا ذرا بھی اثر نہیں- "مقرر" میں قبرستان کا منظر ہ
ایک صاحب جنہیں بیوی کی بد مزاجی اور شراب پینے کی عادت
موت کے گھاٹ اُتارا ہے دفن کیے جا رہے ہیں' اور آخر میں ایک صاحب
جو بہت خوش تقریر سمجھے جاتے تھے مرحوم کی نیکیاں بیان کرنے کو کھڑ
ہوتے ہیں - فاضل مقرر رہنے والے تو اسی جگہ کے تھے' مگر انہیں اطلا
دیتے وقت مرحوم کا نام نہیں بتایا گیا تھا' بلکہ صرف عہدہ' اور وہ سمج

کہ ایک اور صاحب، جو پہلے اسی عہدے پر تھے، راہیء عدم ہوے ہیں- بہر حال اُنہیں تقریر کرنے میں کوئی تکلف نہیں تھا، ان کی تقریر بہت موثر تھی، اور اگرچہ مرحوم کا جو حلیہ انہوں نے بتایا وہ غلط تھا، اور ان کی زندگی کے جو حالات انہوں نے بتاے وہ بھی غلط تھے، ان کا انداز بیاں ایسا پر درد تھا کہ سب کی آنکھوں میں آنسو بھر آے- اتفاق سے وہ صاحب جنہیں فاضل مقرر سمجھتے تھے کہ زمین کے سپرد کیے گئے ہیں سامعین میں موجود تھے، اور تقریر کے سلسلے میں جب ان کا نام آیا تو ان کی حیرت اور غصے کی انتہا نہ تھی- جب فاضل مقرر سے ان کی آنکھیں چار ہوئیں تو ظاہر ہے کہ تقریر کی روانی میں خلل پڑ گیا- مقرر نے رک کر اپنے ان دوست سے جو انہیں بلانے گئے تھے کہا :—

"ارے بھائی وہ تو زندہ ہے ؟"

"کون ؟"

مقرر نے نام بتایا-

"ہاں وہ تو زندہ ہیں- انتقال تو — کا ہوا ہے"-

اس کے بعد دو چار منٹ اور بحث ہوئی- پھر دوست نے کہا-

"ارے بھئی تم رک کیوں گئے- تقریر کرتے رہو- وقفہ اچھا نہیں معلوم ہوتا"-

مقرر نے قبر کی طرف اشارہ کیا اور ایک نئی تقریر شروع کر دی-

"بھٹکے ہوے" دو دوست ہیں جن میں سے ایک مہمان ہیں، دوسرے جو ایک کھاتے پیتے وکیل ہیں، وہ میزبان ہیں، اور اپنے دوست کو اپنی بیوی سے ملانے اور اپنا نیا گھر دکھانے کے لیے لاے ہیں- گھر ان کا دیہات کی ایک چھوٹی سی بستی میں ریلوے اسٹیشن سے خاصی دور ہے- گاڑی رات کو پہنچی ہے، اور رات بھی ایسی کہ سڑک نظر نہیں آتی- مہمان کی بھوک پیاس کی شدت سے حالت زار ہے، اور

میزبان انہیں اپنی بیوی کی محبت اور سلیقے کے قصے سنا کر اور ان کو جو کچھ کھلایا پلایا جائے گا اس کی تفصیل بتا کر تسلی دیتے ہیں۔ آخر میں بستی دور سے دکھائی دیتی ہے، اور ایک مکان کے پاس ٹھیر کر وکیل صاحب خوش خبری سناتے ہیں کہ لیجیے منزل مقصود پر پہنچ گئے۔ مکان میں ہر طرف اندھیرا ہے، وکیل صاحب اپنی بیوی کا نام لے کر پکارتے ہیں تو کوئی جواب نہیں ملتا۔ پہلے وہ سمجھتے ہیں کہ بیوی سو گئی ہے، پھر خیال ہوتا ہے کہ شاید مذاق کر رہی ہو، اور جب وہ پکارتے پکارتے تھک جاتے ہیں تو دوست کے کندھوں پر پیر رکھ کر کھڑکی کے رستے سے ایک کمرے میں داخل ہوتے ہیں جسے وہ سمجھتے ہیں کہ ان کی نشست کا کمرا ہے۔ کمرے میں مرغیاں اور بطخیں بند ہیں جو ان کے پہنچتے ہی شور مچانا شروع کرتی ہیں اور کھڑکی سے اڑ کر باہر بھاگنے لگتی ہیں۔ وکیل صاحب بہت پریشان ہوتے ہیں، اسی پریشانی میں ان کا ہینڈ بیگ جس میں دیا سلائیاں ہیں گم ہوجاتا ہے، اور اسے تلاش کرنے میں انہیں اور بھی پریشانی ہوتی ہے۔ اس دوران میں مرغیوں کا شور ساری بستی کو جگا دیتا ہے، لوگ لالٹینیں اور ڈنڈے لے کر پہنچتے ہیں اور وکیل صاحب اور ان کے دوست کو چور سمجھ کر گھیر لیتے ہیں۔ وکیل صاحب اور ان لوگوں کے درمیان خوب گالی گلوج ہوتی ہے، اور اسی سلسلے میں وکیل صاحب کو پتا چلتا ہے کہ ایک چوراہے پر وہ غلط طرف مڑ گئے اور دوسری بستی میں پہنچ گئے ہیں، اور جس مکان کو اندھیرے میں وہ اپنا خیال کر رہے تھے کسی اور کا ہے —

خالص ظریفانہ قصوں سے زیادہ دلچسپ وہ افسانے ہیں جن میں چیخوف نے ہنسانے کے ساتھ انسانی سیرت کے کسی پہلو پر روشنی ڈالی

ہے، جیسے "لاٹری کا ٹکٹ"، "دھونس"، "گرگٹ"، "انتقام"، "لاٹری کا ٹکٹ" میاں بیوی کی لڑائی کا قصہ ہے - بیوی نے لاٹری کا ٹکٹ خریدا تھا، شوہر اس کا نمبر اخبار میں دیکھتا ہے، اور چونکہ خاصی بڑی رقم انعام میں ملنے والی تھی، وہ فوراً روپیہ خرچ کرنے کی بہترین صورتوں پر غور کرنے لگتا ہے - پھر اسے اندیشہ ہوتا ہے کہ بیوی کنجوسی کرے گی، یا روپیہ ایسی طرح خرچ کرے گی جس میں کوئی مزہ نہ آے گا، اور اس اندیشے کی بدولت اس کے دل میں بیوی کی طرف سے ہزاروں شکایتیں پیدا ہوجاتی ہیں اور اس کی صورت، عادتیں، شوق، ہر چیز بری معلوم ہونے لگتی ہے - بیوی بھی اپنی خوش قسمتی کی خبر سن کر طرح طرح کے منصوبے باندھنے لگتی ہے، مگر اسے بھی یکبارگی یہ خوف ہوتا ہے کہ اس کا شوہر خواہ مخواہ دخل دے کر اس کی ساری تدبیریں الٹ دے گا، اور وہ اپنی جگہہ پر شوہر سے بیزار ہوجاتی ہے - لیکن کھلم کھلا جنگ ہونے سے پہلے ہی شوہر اتفاق سے ٹکٹ کے نمبر کو غور سے دیکھتا ہے اور تب اسے معلوم ہوتا ہے کہ پڑھنے میں غلطی ہوئی ہے اور انہیں کچھہ ملے ہی گا نہیں - اس نے بیوی سے یہ کہہ دیا، دونوں کا مزاج آہستہ آہستہ ٹھنڈا پڑ گیا، اور وہ اطیمنان سے کمرے میں ٹہلنے لگے - دونوں طبیعت کے نیک تھے، اب تک ان میں لڑائی نہیں ہوئی تھی، اور اگرچہ غریب تھے مگر خوش رہتے تھے - دولت ملتی تو بگڑ جاتے --

"دھونس" کا موضوع اس کے عنوان سے ظاہر ہے - * ایک مسافر کرایے کی گھوڑا گاڑی پر بیٹھے ہوے جنگل سے گزر رہے تھے - شام کا وقت اور

---

* روسی میں اس کا عنوان "نمک کی زیادتی" ہے، جس کا انگریزی میں "Overdoing It" ترجمہ کیا گیا ہے --

رستہ سنسان تھا' اکیلے بیٹھے بیٹھے انہیں آپ ہی آپ چوروں اور ڈاکوؤں کے قصے یاد آنے لگے' اور پھر انہیں ڈر لگا کہ رستے میں انہیں ڈاکو لوٹ کر کہیں مار نہ ڈالیں - گاڑی بان سیدھا سادا دیہاتی تھا' مگر دیہاتیوں کی صورت کچھ ایسی ہوتی ہے کہ نیک اور بد کی تمیز کرنا دشوار ہوجاتا ہے' اور حفظ ماتقدم کے خیال سے انھوں نے اپنے گاڑی بان سے باتیں کرنا شروع کیں' اس سے کہا کہ میرے پاس تین پستول ہیں' میں ایک وقت میں دس ڈاکوؤں کا مقابلہ کرسکتا ہوں' اور اگرچہ دیکھنے میں دبلا پتلا اور بیمار ہوں' مجھ میں بیل کے برابر طاقت ہے میں کئی آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار چکا ہوں اور کئی کو سزا دلوا چکا ہوں- یہ باتیں سن کر دیہاتی کے کان کھڑے ہوئے' اور وہ بار بار مڑ کر دیکھنے لگا کہ مسافر کہیں پیچھے سے پستول تو نہیں مارنے والا ہے- مسافر کا یہ حال تھا کہ گاڑی ذرا بھی ہلتی یا چوں چرا کرتی تو وہ کانپ اٹھتے تھے' اور گاڑی بان کو مرعوب کرنے کے لیے کبھی اپنی طاقت اور کبھی اپنی حکومت کا قصہ سنا دیتے- ایک مرتبہ گھوڑا ذرا تیز ہوگیا تو وہ سہم گئے' اور گاڑی بان سے کہنے لگے کہ دیکھو' تمہیں شاید یقین نہ آتا ہو' میں ابھی پستول نکال کر تمہیں دکھاتا ہوں- اب گاڑی بان کو ان کے ڈاکو ہونے میں شبہ نہیں رہا' وہ چیخ مار کر گاڑی سے کود پڑا اور یہ کہتا ہوا جنگل میں بھاگ گیا کہ بھیا میری گاڑی لے لو' گھوڑا لے لو' مگر جان نہ لو- ادھر مسافر کی سٹی گم ہوئی- گاڑی ہانکنا جانتے نہیں تھے' جانتے بھی ہوتے تو رستہ نہیں معلوم تھا- پہلے وہ بیٹھے رہے' پھر گاڑی بان کو پکارنا شروع کیا- وہ پاس ہی جھاڑیوں میں چھپا تھا' اور جب دو تین گھنٹے گزر گئے اور اسے یقین ہوگیا کہ مسافر ڈاکو نہیں ہے تو وہ ڈرتا ڈرتا جھاڑی میں سے نکلا' مسافر نے بہت کچھ تسلی تشفی دے کر

اسے آگے چلنے پر راضی کیا' اور اپنی زورآوری اور پستولوں کا ذکر کرنا چھوڑ دیا —

" گرگٹ " خوشامدیوں پر ایک لا جواب پھبتی ہے - ایک تھانہ دار نئی وردی پہنے اور ایک پولیس کے آدمی کو ساتھہ لیے دو پہر کے وقت بیچ بازار سے گزر رہا ہے - اتنے میں ایک طرف کچھہ شور ہوتا ہے اور دم بھر میں سڑک جو پہلے خالی تھی آدمیوں سے بھر جاتی ہے تھانہ دار مجمع کی طرف بڑھتا ہے اور ڈانٹ کر پوچھتا ہے کہ تم سب یہاں کیوں جمع ہوگئے ہو - مجمع کے بیچ میں سے ایک آدمی اسے اپنی پھٹی قمیص اور خون آلود انگلی دکھاتا ہے اور کہتا ہے کہ دیکھیے اس کتے نے آپ ہی آپ میری انگلی کو نوچ لیا - کتا بھی اسی کے پاس سہما ہوا بیٹھا ہے' اور تھانہ دار فوراً اپنے آدمی کو حکم دیتا ہے کہ اس کتے کو لے جا کر مروا ڈالو' یہ لاوارث ہے اور خطرناک ہے - لیکن مجمع میں سے کوئی چپکے سے کہتا ہے کہ یہ تو فلاں جنرل کا کتا ہے' تھانہ دار کے تیور فوراً بدل جاتے ہیں اور وہ اس شخص کو جسے کتے نے کاٹا تھا ڈانٹنے لگتا ہے کہ تم نے ضرور کوئی شرارت کی ہوگی' جب ہی تمہیں اس نے کاٹا - جب تک اسے یقین نہیں ہو جاتا کہ کتا کس کا ہے تھانہ دار کے تیور ایسے ہی بدلتے رہتے ہیں' کبھی وہ مجرم کتے کو مار ڈالنے کا حکم دیتا ہے' کبھی اس بیچارے کو جسے کتے نے کاٹا تھا للکارتا ہے —

بعض موقعے ایسے بھی ہوتے ہیں جب انسان اپنی غلطی یا کم زوری سے نہیں بلکہ دوسروں کی زیادتی سے مخمصے میں پھنس جاتا ہے اور بہت مضحک معلوم ہونے لگتا ہے - " انتقام " میں سگایف نامی ایک شخص جسے قومی اخلاق درست رکھنے کا حوصلہ ہے اپنی بیوی کو بے وفائی کی سزا دینے کے

لیے پستول خریدنے جاتا ہے - جس وقت دکان دار پستول دکھانا شروع کرتا ہے سگایف کو تصور میں تین لاشیں پھر کتی نظر آتی ہیں لیکن کچھہ ارادے کی کمزوری اور کچھہ دکان دار کی باتوں کے سبب سے وہ یہ طے نہیں کرسکتا کہ بیوی اور اس کے آشنا دونوں کو مار کر خود کشی کرے ' یا صرف آشنا کو مارے یا صرف اپنی بیوی کو - آخر میں وہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ جذبۂ انتقام کی جو آگ اس کے دل میں بھڑک اتھی ہے وہ کسی کو قتل کرنے سے بجھہ نہیں سکتی ' اور وہ پستول کی جگہ بتیریں پکڑنے کا جال خرید کر دکان سے چلا جاتا ہے —

افسانوں کی دوسری قسم وہ ہے جس میں چیخوف کا مقصد خاص طور پر روسی سیرت اور روسی زندگی کی فضا دکھانا ہے - ایک لحاظ سے تو اس کا ہر افسانہ اسی تحت میں آسکتا ہے ' لیکن یہاں ہمیں بحث ان چند افسانوں سے ہے جن میں معاصر حالات اور ذہنیت اور روسی زندگی کے وہ مسائل چیخوف کا موضوع ہیں جنہیں روسی تہذیب کی نرالی خصوصیات سمجھنا چاہیے ' کیونکہ وہ اس صورت میں کہیں اور نظر نہیں آتے - " بے مزہ کہانی " ، " اچھے لوگ " ، " گھر پر " ، " بر سر راہ " ' اور " میری سر گزشت " ایسے افسانوں کے مثالی نمونے ہیں - ان سب میں دراصل چیخوف نے وہی نوحہ خوانی کی ہے جو اس سے پہلے کے تقریباً ہر روسی انشاپرداز کی تصانیف میں ملتی ہے ' لیکن اپنے خاص طرز پر اور حقیقت کا ایک نیا پہلو روشن کرنے کی غرض سے - ان افسانوں کے اشخاص انہیں تعلیم یافتہ زمین داروں کے بیٹے اور پوتے ہیں جن کے خاکے تورگینیف اور گونچروف نے اپنے ناولوں اور افسانوں میں اتارے تھے ' انہیں کی طرح یہ نئی پود بھی تمام عمر یہی سوچتی رہتی ہے کہ ہماری

زندگی کا مقصد کیا ہے اور کیا ہونا چاہیے' انہیں کی طرح یہ بھی استقلال کی نعمت سے محروم ہے' جسمانی جمود اور ذہنی ہیجان نے اسے بھی بے دست و پا کر رکھا ہے' اس کے لیے بھی اسے چین سے دن کاٹنا مشکل ہے اور اس کے دل میں مایوسی اور حیرت کے سوا کوئی جذبہ پنپ نہیں سکتا - چیخوف نے اپنے ایک خط میں لکھا ہے کہ روسیوں کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ ان کی آرزوؤں میں قوت نہیں' اور یہی ان لوگوں کی سب سے نمایاں خامی ہے جن کا ذکر اس کے افسانوں میں آتا ہے - اس پر طرفہ یہ ہے کہ ہمدردی اور ایک دوسرے کی ہمت افزائی' جو کمزوروں کا سہارا اور ان کی تسلی کا سب سے موثر ذریعہ ہوسکتی ہے کسی طرف نظر نہیں آتی - چیخوف نے نہایت پردرد اور عبرت انگیز طریقے پر اس بیگانگی کو ظاہر کیا ہے جو انتہائی قرب میں انتہائی فصل پیدا کردیتی ہے - "بے مزہ کہانی" ایک بوڑھے پروفیسر کا شکوہ ہے جنھوں نے تمام عمر علم کی خدمت کی ہے' جن کے سیلکڑوں شاگرد ہیں' جو سارے ملک میں مشہور ہیں اور جن کی ہر جگہ عزت کی جاتی ہے - ان کی بیوی انہیں صبح شام ترکاری کا بھاؤ بتایا کرتی ہیں' اور خرچ کی تنگی کی شکایت کیا کرتی ہیں - ان کا بیٹا فوج میں نوکر ہے' مگر بجاے باپ کو مدد دینے کے وہ اپنی حیثیت قائم رکھنے کے لیے الٹا اس سے گزارا وصول کرتا ہے - ان کی لڑکی جو بچپن میں ان سے بے حد محبت کرتی تھی اپنی فکروں میں پڑگئی ہے اور اب اسے باپ سے کوئی مطلب نہیں - صبح شام سلام اور رسمی پیار کرنے کے سوا خاندان والوں کو ایک دوسرے سے اورکوئی سروکار نہیں' اور بیچارے بوڑھے پروفیسر پر اس سرد مہری اور اعراض کے اختلاف کا اتنا گہرا اثر ہوتا ہے کہ انہیں اپنے علم پر' اس محنت کے

انجام پر جس میں انھوں نے زندگی صرف کی ہے اعتبار نہیں رہتا اور دنیا میں ان کا جو آخری سہارا تھا وہ بھی دغا دے جاتا ہے۔ خاندان میں بیوی بچوں کے علاوہ پروفیسر کے ایک دوست کی لڑکی کاتیا بھی ہے جس کا باپ مرتے وقت اسے پروفیسر کے سپرد کرگیا تھا۔ کاتیا سے پروفیسر کو بڑی محبت ہے، لیکن عمر کے تفاوت سے دونوں میں ایک دوسرے کے دل کی بات سمجھنے کی صلاحیت کم ہوتی جاتی ہے۔ کاتیا کو ناٹک کا بڑا شوق تھا، مگر شروع جوانی میں اسے ایسی ناکامی اور ایسا تلخ تجربہ ہوا کہ وہ بیزار ہوکر گھر بھاگ آئی۔ جس زمانے کی بد مزہ کہانی پروفیسر صاحب ہمیں سناتے ہیں اس وقت کاتیا الگ مکان میں رہتی ہے، پروفیسر سے جب ملاقات ہوتی ہے تو وہ پوچھتی ہے کہ کچھ بتائیے کیا کروں اور پروفیسر کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا جواب دیں۔ کاتیا اپنے غم میں ایسی مبتلا ہے کہ اسے پروفیسر کے غم کا خیال ہی نہیں آتا، اور وہ ہر وقت اپنی زندگی کو کارآمد نہیں تو قابل برداشت بنانے کی فکر میں لگی رہتی ہے۔ آخر میں جب کاتیا پروفیسر سے رخصت ہوکر کہیں چلی جاتی ہے اور ہمیں یقین ہو جاتا ہے کہ نہ بوڑھے پروفیسر کو کبھی کوئی ہمدم اور غمگسار ملے گا نہ جوان کاتیا کو تو دل پر مایوسی کا ایسا ہجوم ہوتا ہے کہ ہم سمجھتے ہیں ہم کسی بے پناہ مصیبت کی داستان کے ورق الٹ رہے ہیں، حالانکہ واقعات کو دیکھیے تو اس قصے میں وہ چیز جسے آسمان کا جور و ستم کہتے ہیں بالکل ہے ہی نہیں۔ اسی طرح "اچھے لوگ" ایک بھائی بہن کا قصہ ہے جن میں محبت بہت ہے مگر ساتھ ہی مذاق اور خیالات کا ایسا اختلاف ہے کہ وہ حقیقت میں بیگانہ اور ایک دوسرے سے بالکل بے خبر رہتے ہیں۔ آخر میں محبت کے باوجود ان میں ناچاقی پیدا ہوجاتی ہے، بہن اپنے دل

کے حوصلے پورے کرنے کو بستر کلدھے پر رکھہ کر کہیں غریبوں کی سیوا کرنے چلی جاتی ہے' بھائی گھر پر رہ کر مضمون نگاری کا شوق پورا کرتا رہتا ہے' اور پھر دونوں نہ کبھی ملتے ہیں نہ ایک کو دوسرے کی خبر ہوتی ہے - ایسے ہی ڈرامے کی تمہید "گھر پر" ہے - جس میں ایک ہونہار' حوصلہ مند اور سلیقہ شعار لڑکی کا تعلیم سے فارغ ہوکر گھر واپس آنا دکھایا گیا ہے - لڑکی گھر پہنچ کر اپنے عزیزوں سے بڑی محبت سے ملتی ہے اور اس کی بہت خاطر کی جاتی ہے' مگر چند روز بعد جب وہ ایک بچی کو جو گھر میں نوکر ہے پٹتے دیکھتی ہے اور آس پاس کے لوگوں سے ملاقات کرنے پر اسے معلوم ہوجاتا ہے کہ ان میں سے کوئی ذرا بھی مہذب اور دلچسپ نہیں تو اس کی کیفیت بالکل بدل جاتی ہے اور اپنی تنہائی اور زندگی کی یک رنگی سے نجات پانے کے لیے وہ ایک ڈاکٹر سے شادی کر لیتی ہے - ڈاکٹر سے اس کو کوئی لگاؤ نہیں' نہ ڈاکٹر میں کشش پیدا کرنے والی کوئی خوبی ہے اور ایسے میاں بیوی کی زندگی جیسی ہو سکتی ہے وہ ظاہر ہے' خصوصاً جب جی بہلانے کو کوئی شغل بھی نہ ہو - بعد کی سرگزشت افسانے میں بیان نہیں ہوتی - اسے بیان کرنے کی ضرورت بھی نہیں —

"بر سر راہ" کا موضوع روسی سیرت کا وہ نمونہ ہے جس کی مثال تورگنیف نے رودن کی شخصیت میں پیش کی ہے- رودن کی طرح چخوف کا ہیرو لیخارف بھی بہت وجیہ آدمی ہے - اس کی جوشیلی طبیعت اور ایثار اسے تن دھی اور خود فراموشی کی انتہا تک پہنچا دیتا ہے- اس کی خوش کلامی لوگوں پر جادو کر دیتی ہے' اس کے ساتھہ دوسرے بھی اس کے مقاصد کے فدائی بن جاتے ہیں- لیکن رودن کی طرح اس کی طبیعت میں بھی اس قدر تلون ہے' اس کی تن دھی استقلال سے ایسی محروم کہ ہر قسم کا نقصان' صدمہ

اور ذلت اُٹھانے کے بعد وہ وہیں کا وہیں رہ جاتا ہے۔ اور جب چالیس سال کی عمر میں وہ اپنی گزشتہ زندگی پر غور کرتا ہے تو اسے تسکین دلانے کے لیے کوئی کامیابی، کوئی تکمیل کو پہنچا ہوا کام نظر نہیں آتا۔ چخوف کے ایجاز نے لیخارف کی سرگزشت کو رودن کی سوانح عمری سے بہت زیادہ پرتاثیر بنا دیا ہے، اور اس کی داستان کا پس منظر بڑی بہت زیادہ موزوں اور پر معنی ہے۔ جاڑوں کے موسم میں جب برف کے بھونچالوں اور طوفانوں سے زمین کانپ رہی ہے، لیخارف، جو کسی دور افتادہ مقام پر ملازم ہو گیا ہے اپنی چھوٹی لڑکی کو ساتھ لیے وہاں جا رہا ہے۔ رستے میں موسم کی ناسازگاری اسے ادنیٰ سرائے میں پناہ لینے پر مجبور کرتی ہے۔ اور یہیں ایک نوجوان لڑکی کو جو اپنے ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں کو جا رہی ہے رات بھر کے لیے قیام کرنا پڑتا ہے۔ لڑکی بہت ہوشیار، سلیقہ مند اور ہمت والی ہے۔ باپ اور بھائیوں کو نااہل دیکھ کر اس نے جائداد کا انتظام اپنے ذمے لے لیا ہے اور اپنا کام خوش اسلوبی سے انجام دے رہی ہے۔ جب لیخارف اس سے گفتگو چھیڑ کر اپنی ساری سرگزشت سناتا ہے اور اس کی گرم گفتاری کو اپنی تاثیر دکھانے کا موقع ملتا ہے تو لڑکی کے آنسو بہنے لگتے ہیں، اور معلوم ہوتا ہے کہ ذرا دیر اور لیخارف کی شخصیت اس پر اثر ڈالتی رہی تو وہ بھی اس کی گرویدہ ہو جائے گی۔ لیکن اس کی نوبت نہیں آتی۔ جب دوسرے دن لڑکی سلیج* پر بیٹھ کر روانہ ہونے لگی " تو اس نے گھوم کر لیخارف کی طرف اس طرح دیکھا کہ گویا اس سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔ لیخارف اس کے پاس دوڑ کر گیا لیکن اس نے کچھ کہا نہیں، بس اسے دیکھتی رہی ... معلوم نہیں لیخارف

* بغیر پہیوں کی گاڑی جس پر روس میں جاڑوں کے زمانے میں سفر کیا جاتا ہے۔

کے نکتہ رس ذہن نے اس نظر کی صحیح تعبیر کرلی تھی یا یہ محض ایک خیال تھا' مگر اسے یکبارگی محسوس ہونے لگا کہ اگر وہ لڑکی کے دل کے تاروں کو ذرا اور چھیڑ سکتا تو وہ اس کا بڑھاپا' اس کی بیکسی' اس کی ناکامیابی سب معاف کردیتی اور بغیر کسی سوال و جواب کے اس کے پیچھے ہولیتی - وہ بہت دیر تک اسی جگہہ کھڑا سلیج کی لیکھیں دیکھتا رہا... سلیج کے نشان برف میں چھپ گئے وہ خود برف سے اس طرح اٹ گیا کہ ایک سفید چٹان معلوم ہونے لگا - لیکن پھر بھی اس کی آنکھیں برف کے بادلوں میں کچھہ تلاش کرتی رہیں" —

لیخارف کی لاحاصل کوششیں جسے وہ کسی مقصد کے پورے کرنے میں استعمال نہ کرسکا تعلیم یافتہ روسیوں کی روحانی بے چینی کا ایک پہلو تھیں - اس بے چینی کی ایک اور صورت ان لوگوں کی جد و جہد میں نظر آتی ہے جو اپنی زندگی میں روسی عوام کے طرز معاشرت اور فلسفۂ حیات سے مطابقت پیدا کرنا چاہتے تھے' جن کا خیال تھا کہ اگر تعلیم یافتہ روسیوں کی سیرت یورپی اثرات کے میل سے پاک کردی جاے تو اس کے کل امراض کا ایک نسخے سے علاج ہوجاے گا - انشاپردازوں میں تالستائی کی زبردست شخصیت نے اس تصور کی نمائندگی اور اس کا پرچار کیا' اور چخوف کا افسانہ "میری سرگزشت" اسی کے اثر میں ڈوبا ہوا معلوم ہوتا ہے - اس افسانے کی تصنیف میں بھی چخوف نے اپنا خاص طریقہ چھوڑ کر تالستائی کا طرز اختیار کیا' اور دراصل وہ ایک مشق ہے' مگر اتنی کامیاب مشق کہ تالستائی کے بہترین افسانوں سے اس کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے - "میری سرگزشت" کا ہیرو پولوزنف اپنے آپ کو مزدوری کرنے کے سوا اور کسی کام کے لائق نہیں سمجھتا اور مزدوری کرنے لگتا ہے - خاندان کی آبرو ریزی

کی سزا میں اس کا باپ اسے عاق کردیتا ہے' اس کی بیوی' ایک امیر انجنیر کی لڑکی جس نے آغوش فطرت میں زندگی بسر کرنے کے شوق میں اس سے شادی کی تھی کسانوں کی بے تمیزیوں اور دیہاتی معاشرت سے اکتا کر بھاگ جاتی ہے' لیکن ان سب کے باجود پولوزنف مزدوری کا پیشہ نہیں چھوڑتا - چیخوف نے اپنے هیرو کی سیرت' اس کے خیالات' جو سچ پوچھا جائے تو اس کی خلقی مجبوریوں کا نتیجہ هیں' اس کے ماحول پر جو اثر ڈالتے هیں' اس کے خود برست باپ کا غصہ اس کی بہن کی چھپی همدردی' اس کے اپنے طبقے کے لوگوں کی حیرت اور اس کے ساتھ حقارت آمیز سلوک' نہایت سبق آموز اور عبرت انگیز طریقے پر دکھایا ہے - معاشرت کے انقلاب کی اس سے بہتر اور معنی خیز شاید هی اور کوئی تصویر هوگی —

چیخوف کا خاص موضوع تعلیم یافتہ روسیوں کی سیرت اور ذهنیت ہے - لیکن روسی عوام کی زندگی اس کی نظروں سے چھپی نہیں رهی - وہ افسانے جن میں اس نے کسانوں کے رهنے سہنے کے طریقے اور ان کے اخلاقی فلسفۂ حیات کو بیان کیا ہے نکتہ چین نقادوں کے نزدیک فن کے اعتبار سے زیادہ کامیاب اور حقیقت نگاری کی رو سے بالکل صحیح نہیں هیں - لیکن جہالت' درد کی کیفیتیں اور مفلسی کی مصیبتیں بیان کرنے میں اسے کمال ہے - "اندھیرا" چند صفحوں میں جہالت اور بیکسی کی ایک لمبی اور دل گداز داستان سنادیتا ہے - کسی هسپتال میں ایک نوجوان کاشتکار ڈاکٹر کے پاس آتا ہے اور التجا کرتا ہے کہ میرے بھائی کو چھوڑ دیجیے' اس کی ماں اور بیوی بچے اسے بہت یاد کرتے هیں' گھر پر کھانے والے بہت اور کمانے والا کوئی نہیں - اس کا بھائی ایک مجرم ہے جسے تین سال

کی سزا ہوئی ہے اور وہ بیماری کی وجہ سے چند روز کے لیے ہسپتال بھیجا گیا ہے - نوجوان کاشت کار اورتمام افسروں سے مایوس ہوکر ڈاکٹر کے پاس آیا ہے' اور ڈاکٹر اسے کسی طرح یقین نہیں دلاسکتا کہ اسے مجرموں کو چھوڑ دینے کا اختیار نہیں - کاشت کار ڈاکٹر کے قدموں پر گر پڑتا ہے اور ڈاکٹر گھبراکر ہسپتال کے اندر چلا جاتا ہے - کاشت کار سمجھتا ہے کہ یہ بے رخی محض رشوت وصول کرنے کا بہانہ ہے - رشوت دینے کو اس کے پاس روپیہ نہیں' اس لیے ایک اور افسر کی خوشامد کرنے کے بعد وہ پھر اپنے بوڑھے باپ کو ساتھ لے کر ڈاکٹر کے پاس آتا ہے اور دونوں ڈاکٹر کا دل نرم کرنے کے لیے اس کے قدموں پر گر پڑتے ہیں - "اندھیرے" کی طرح "مجرم" میں بھی کسانوں کی جہالت اور وہ ذہنی تاریکی جس میں وہ گھرے ہوے ہیں نہایت درد انگیز مگر ساتھ ہی مضحک صورت میں نظر آتی ہے - ایک کسان ریل کی پٹری کے پیچ کھولنے کے جرم میں پکڑا گیا ہے - اس نے پیچ اس لیے کھولے تھے کہ مچھلی کی شست کے لیے لنگر کی ضرورت تھی' اور اسے سخت حیرت ہوتی ہے - جب منصف کہتا ہے کہ تم نے ایسی حرکت کی ہے جس سے ریل گاڑی کے الٹ جانے اور سینکڑوں مسافروں کے ہلاک ہونے کا اندیشہ ہے - کسان کو اپنی حرکت سے انکار نہیں' اور اسے قید کی سزا دی جاتی ہے' لیکن وہ آخر وقت تک اسی خیال میں رہتا ہے کہ کسی نے دراندازی کی ہے' کیونکہ پٹری کے پیچ نکالنا اس کے نزدیک ہرگز ایسی بات نہیں ہے جس کے لیے کسی بے گناہ اور امن پسند آدمی کو سزا دی جاے —

چیخوف کے نسوانی کیرکٹروں میں سب سے مشہور "پیاری" کی ہیروین اولنکا ہے - وہ اپنے تروتازہ' مسکراتے ہوئے چہرے اور نیک اور محبت بھری طبیعت کی بدولت شروع جوانی میں 'پیاری' کے لقب سے مشہور ہوئی -

پہلے اس کی ایک تھیٹر کے مالک سے شادی ہوتی ہے' جب تک وہ اس کے ساتھہ رہتی ہے اس کے کاروبار میں مدد دیتی ہے اور ہر وقت اور ہر شخص سے تھیٹر کی باتیں کرتی رہتی ہے - کچھہ عرصے کے بعد اس کا شوہر مر جاتا ہے اور ایک لکڑی کا سوداگر اس سے نکاح کرلیتا ہے - دوسرے شوہر کو ناٹک سے مطلق دلچسپی نہیں' 'پیاری' کبھی تھیٹر نہیں جاتی اور کوئی جانے کو کہتا ہے تو وہ جواب دیتی ہے کہ ایسی فضول باتوں کے لیے نہ میرے پاس وقت ہے نہ میرے شوہر کے پاس - اب اس کی گفتگو کا مستقل موضوع لکڑی کا بھاؤ اور تجارت کی دشواریاں ہو جاتی ہیں' اور رات کو بھی اسے خواب میں لکڑیوں اور تختوں کے ڈھیر دکھائی دیتے ہیں - شادی کے چھہ سال بعد 'پیاری' پھر بیوہ ہو جاتی ہے' اور اس کی خبرگیری کے لیے سوائے ایک مویشیوں کے ڈاکٹر کے اور کوئی نہیں رہتا - ڈاکٹر سے اس کی صرف کبھی کبھی ملاقات ہوتی ہے' لیکن یہ ذرا سا تعلق 'پیاری' کو مویشیوں کی بیماریوں سے واقف کرنے اور انہیں اپنی گفتگو کا موضوع بنانے کے لیے کافی ہے - بدقسمتی سے ڈاکٹر کا تبادلہ ہوجاتا ہے' اور پھر کئی سال تک 'پیاری' بالکل اکیلی رہتی ہے - اسے کوئی ایسا شخص نہیں ملتا جس کے خیالات وہ اختیار کرلے' اور اس کی سمجھہ میں نہیں آتا کہ لوگوں سے کیا باتیں کرے - آخر مدن وہی مویشیوں کا ڈاکٹر ملازمت ترک کر کے اسی شہر میں بسنے کے ارادے سے آتا ہے - 'پیاری' اسے' اس کی بیوی اور دس سال کے بچے کو اپنے مکان میں رکھتی ہے اور اس کی زندگی کا چراغ پھر روشن ہوجاتا ہے - وہ بچے کی پرورش میں مشغول اور اس کی روز مرہ زندگی میں بالکل محو ہو جاتی ہے' اسے کھلاتی پلاتی ہے' اسکول کے آدھے رستے تک اس

کے ساتھ جاتی ہے اور جو کوئی ملتا ہے اس سے شکایت کرتی ہے کہ چھوٹے درجوں کے سبق بہت مشکل ہوتے ہیں اور لڑکوں سے ایسے سوال پوچھے جاتے ہیں جن کے جواب انہیں کبھی بتائے نہیں گئے - اس قصے پر تنقید کرتے ہوئے تالستائی نے لکھا ہے کہ مصنف کا مقصد عورت کا مذاق اڑانا اور یہ خیال پیدا کرنا ہے کہ عورت کا بذات خود کوئی وجود نہیں' وہ مرد کی شخصیت کا محض ایک عکس ہے - تالستائی کی راے میں چخوف اپنے ارادے میں کامیاب نہیں ہوا ہے' کیونکہ ہم 'پیاری' پر ہنسنے کی بجاے اس کے جذبۂ ایثار کے فریفتہ ہوجاتے ہیں - لیکن چخوف نے دراصل کوئی راے نہیں ظاہر کی ہے' بس نسوانی سیرت کا ایک مرقع کھینچا ہے' اور ہم اپنے مذاق کے مطابق 'پیاری' کو مضحک یا محبت و احترام کی مستحق سمجھ سکتے ہیں - "پیاری کے علاوہ نسوانی سیرت کی اور بھی قسمیں ہیں جن کے مثالی نمونے چخوف نے "وولوریا"' "مددگار"' "بے بس مخلوق"' اور "پراسرار فطرت" میں پیش کیے ہیں - "پر اسرار فطرت" فن کے اعتبار سے ایک کارنامہ ہے - چخوف نے تین چار صفحوں میں ایک دولت پرست عورت کا روپے پر اپنی جوانی اور حسن نثار کرنے کا قصہ خود اس کی زبانی سنایا ہے' اور نہایت ظریفانہ طریقے پر ایسی عورتوں کی خودستائی اور خود فریبی' بناوٹی حوصلہ مندی اور روحانیت کا نقشہ کھینچ دیا ہے —

چخوف کا فنی کمال' اس کے احساس کی نزاکت اور گہری انسانی همدردی سب سے بہتر ان افسانوں میں ظاہر ہوتی ہے جن کا موضوع دل کا درد ہے یا وہ چھوٹے بڑے صدمے جو ہم میں سے ہر ایک کو پہنچتے رہتے ہیں یا وہ حسرتیں جو دل کو تڑپایا کرتی ہیں - اس طرز کے

انے بہت ہیں اور ہر ایک اپنی جگہ بے مثل ہے - چخوف کے نقش نازک اور باریک ہوتے ہیں، اس کے اشارے اور کنایے پر معنی ، وہ قصے کو کبھی اس طرح نامکمل چھوڑ دیتا ہے کہ وہ خود بخود پڑھنے والے کے ذہن میں انجام کو پہنچ جاتا ہے اور اسے آپ بیتی معلوم ہونے لگتا ہے - وہ ایک ذرا سے واقعے یا معمولی سی بات کے ذریعے سے کسی کی زندگی کی فضا، کسی کے درد کی داستان آنکھوں کے سامنے پھیر دیتا ہے اور وہ ہزارہا نکتے جو زبان اور قلم سے بیان نہیں ہوسکتے اس کی آدھی کہی ہوئی بات میں بیان ہوجاتے ہیں - مثلاً " تشخیص " میں ایک ڈاکٹر کسی امیر کی لڑکی کو دیکھنے کے لیے شہر سے کچھ دور بلایا جاتا ہے - لڑکی کا باپ ایک کارخانے کا مالک ہے ، اس کا مکان بھی کارخانے کے احاطے میں ہے ، اور اس طرح لڑکی دلچسپیوں اور صحبت کے لطف سے اس قدر محروم رہتی ہے کہ اکتا اکتا کر وہ خواہ مخواہ بیمار پڑگئی ہے - ڈاکٹر معائنہ کرنے کے بعد اسی نتیجے پر پہنچتا ہے اور باتوں باتوں میں اس سے کہتا ہے کہ تمہیں ایسی جگہ رہنا اور ایسی زندگی بسر کرنا اپنی قسمت کا لکھا نہ سمجھ لینا چاہیے - جب دوسرے دن سویرے ڈاکٹر رخصت ہونے لگتا ہے تو لڑکی سفید کپڑے پہنے اور بالوں میں پھول لگائے ہوتی ہے - یہ ذراسی بات ہمیں بتادیتی ہے کہ ڈاکٹر کے کہنے کا لڑکی کے دل پر کتنا گہرا اثر ہوا ہے ، اور اب وہ اپنی زندگی میں لطف اور دنیا سے لگاؤ پیدا کرنے کی کوشش کرنے والی ہے - چخوف کا انداز بیان پڑھنے والے کو بھی لڑکی کی امیدوں اور آرزوؤں کے میٹھے میٹھے جوش میں شریک کردیتا ہے ، اور وہ بھی اس کی خوشی منانے لگتا ہے کہ ایک انسان کے دل کو افسردگی اور غم سے نجات ملی ، اب آزادی کی خواہش اسے دنیا کی

سپرد کرائے گی اور اس کی شخصیت نشوونما پائے گی - اسی طرح ایک اور قصے میں ایک عورت جسے اپنے شوہر سے بہت بجا شکایتیں ہیں کسی میں ایک صاحب سے آشنائی کرلیتی ہے - یہ آشنائی اخلاق کی رو سے درست نہیں' لیکن وہ بگڑی ہوئی زندگی کو بنانے کی ایک آخری کوشش ہے اور اس وجہ سے بہت جلد سچی محبت کا رنگ اختیار کرلیتی ہے - عورت اور مرد دونوں کو پرانے رشتے توڑ کر آزادی حاصل کرنے کی زیادہ امید نہیں' پھر بھی آخری گفتگو کے بعد انہیں "معلوم ہونے لگا کہ بس اب تھوڑی سی دیر میں ان کی ساری دشواریاں رفع ہوجائیں گی اور وہ ایک نئی اور شاندار زندگی بسر کرنے لگیں گے" - اس قسم کے افسانے چیخوف عموماً ایک لطیف مایوسی کے انداز میں اور پڑھنے والے کے دل میں ایک خوشگوار حسرت پیدا کر کے ختم کرتا ہے - "ایک مصور کی کہانی" ' "ای اونیچ" ' "وے رو چکا" ' "ایک خاتون کی سرگذشت" محبت کے رشتے کو قائم ہوکر ٹوٹتے ہوئے دکھاتے ہیں' اور محض اس سبب سے کہ ان میں مبالغے اور جذبات پرستی سے بالکل پرہیز کیا گیا ہے داستان اور بھی زیادہ دل گداز ہوجاتی ہے - "جہیز کے سامان" میں مایوسی کا رنگ بہت گہرا ہے - یہ ایک فوجی افسر کی بیوہ کا قصہ ہے جو اپنی بیٹی کی شادی کے لیے سامان تیار کرتی رہتی ہے - ہمیں معلوم ہوجاتا ہے کہ بیٹی کی شادی کبھی ہوگی نہیں' اور اس لیے ماں بیٹی کا شوق اور انہماک دیکھہ کر ہمارے آنسو بہتے بہتے رہ جاتے ہیں - "بوسہ" اور "دلگی" اس طرز کے بہترین افسانے ہیں - "بوسہ" ایک بدصورت اور بدقطع فوجی افسر کا قصہ ہے جو عورتوں کی توجہ سے بالکل محروم رہتا ہے' اور اس کی ساری دلی آرزوئیں اندر

ہی گھٹ گھٹ کر رہ جاتی ہیں - ایک مرتبہ کہیں کھانے اور ناچ کی دعوت ہوتی ہے، اور چونکہ فوجی افسر کو ساتھہ ناچنے کے لیے کوئی خاتون نہیں ملتی ہیں، وہ وقت کاٹنے کے لیے میزبان کے گھر میں مارا مارا پھرنے لگتا ہے - اتفاق سے وہ ایک کمرے میں پہنچتا ہے جو ذرا تاریک ہے، اور یہاں ایک عورت یکبارگی آکر اس سے لپٹ جاتی ہے اور اسے ایک بوسہ دیتی ہے - عورت اپنی غلط فہمی محسوس کرتے ہی چلا کر بھاگ جاتی ہے، لیکن فوجی افسر کو یہ ناگہانی پیار یاد رہتا ہے اور جب کبھی اس کا دل رنج سے بھر آتا ہے تو وہ اس واقعے کو یاد کرکے اپنا غم غلط کیا کرتا ہے - یوں ہی وہ لوگ جنہیں اپنی آرزوئیں پوری کرنے کی امید نہیں ہوتی کسی اتفاقی بات کو اپنا سہارا بنا لیتے ہیں، اور اپنی رونی ہوئی قسمت کی کسی جھوٹ موٹ کی مہربانی سے دل کو تسلی دے لیتے ہیں - "دلگی" میں ایک نوجوان اپنی کسی عزیزہ کو برف پر پھسلنے کے واسطے (Sking) لے جاتا ہے، اور اس وقت جب تختے کی گاڑی بہت تیزی سے نیچے کی طرف پھسلتی ہوتی ہے وہ چپکے سے ایک پیار کا لفظ کہہ دیتا ہے - لڑکی اس طرح پھسلنے سے بہت ڈرتی ہے، لیکن وہ پیار کا لفظ اس کے کان میں پڑگیا، بدحواسی میں وہ یہ نہ سمجھہ سکی کہ آواز کہاں سے آئی ہے، مگر پیار کا لفظ سننے کے شوق میں اور یہ معلوم کرنے کو کہ آواز کہاں سے آئی تھی وہ بار بار اپنے خوف کے باوجود دل کڑا کرکے اسی طرح پھسلنے پر راضی ہوجاتی ہے - لڑکا ہر دفعہ وہی شرارت کرتا ہے - لڑکی کو پتا نہیں چلتا - پیار کا لفظ سننے کا اشتیاق اسے بے چین کردیتا ہے - یہی حرکت لڑکے نے ایک مرتبہ اس وقت کی جب لڑکی گھر کے باغیچے میں کھڑی تھی، اور اس واقعے کے بہت دنوں بعد بھی وہ اس امید میں رہتی

ہے کہ اسے وہ لفظ سنائی دے گا' اس لیے اکثر باغیچے میں جا کر چپ چاپ کھڑی رہتی ہے کہ شاید پھر سنائی دے۔ اس کی شادی ہوگئی' بچے ہوے' مگر وہ پیار کا لفظ اسے نہیں بھولا اور اسے دوبارہ سننے کا اشتیاق باقی رہا۔

چخوف کے بہترین درد انگیز افسانے جن میں لطیف جذبات کی تصویر نہیں' ہے "دشمن" "مصیبت" "آرزوئیں" "وانکا" اور "ایسٹر کی شام" ہیں۔ "دشمن" میں ایک جوان آدمی جس کی بیوی بیمار ہے ڈاکٹر کو بلانے جاتا ہے۔ اسی روز اس ڈاکٹر کے اکلوتے بچے کا انتقال ہوا ہے' اور ڈاکٹر کی بیوی رنج میں دیوانی ہوئی جارہی ہے۔ ڈاکٹر گھر چھوڑ کر کہیں بھی جانا نہیں چاہتا' لیکن جوان آدمی کے اصرار پر وہ اس کے ساتھ چلا جاتا ہے۔ اس کے گھر پر پہنچ کر معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بیوی نے بیماری کا بہانہ کیا تھا اور شوہر کی عدم موجودگی میں اپنے آشنا کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ جوان آدمی کو بیوی کے مکر و فریب پر غصہ آتا ہے اور اس کے بھاگ جانے کا غم ہے' ڈاکٹر کو اپنے بچے کی موت اور بیوی کی پریشانی کا خیال ستاتا ہے۔ دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے کے صدمے کا مطلق لحاظ نہیں کر سکتا' ڈاکٹر نوجوان آدمی کو بیہودہ اور خود غرض سمجھ کر اس پر خفا ہونے لگتا ہے' نوجوان آدمی ڈاکٹر کو لالچی اور بے حس فرض کرکے اس کی اور اس کے غم کی توہین کرتا ہے' اور اس طرح یہ دونوں مصیبت کے مارے جنھیں ایک دوسرے سے ہمدردی کرنا چاہیے تھا خواہ مخواہ ایک دوسرے کے دشمن بن جاتے ہیں۔ "مصیبت" ایک بوڑھے گاڑی بان کی داستان ہے۔ اس کا نوجوان لڑکا جس سے اسے بہت محبت اور بڑی امیدیں تھیں مر گیا ہے۔ بیچارے کو کوئی ہمدرد نہیں ملتا' اور اس

لیے وہ ان تمام لوگوں کو اس کی گاڑی میں بیٹھتے ہیں اپنے غم کا افسانہ سنانے کی کوشش کرتا ہے؛ لیکن وہ سب اپنی اپنی فکروں میں مبتلا ہیں، بوڑھے گاڑی بان کی کوئی نہیں سنتا - آخر میں جب وہ گھر واپس ہوتا ہے تو اس کی حسرت ویسی کی ویسی ہی رہ جاتی ہے - گھر پر وہ اپنی تھکی ماندی گھوڑی کو پیار کرنے لگتا ہے، یہ ذرا سا پیار ان تمام جذبات کے پھوٹ نکلنے کا رستہ بن جاتا ہے جو اس کے دل میں اُمنڈ رہے تھے، اور ان کے سیلاب کو روکنے کی اس میں تاب نہیں رہتی - وہ اپنی گھوڑی کو اصطبل لے جاکر اس کے سامنے چارا رکھہ دیتا ہے اور اسے دل کھول کر وہ ساری رام کہانی سنا دیتا ہے جسے کوئی ہم جنس سننے پر راضی نہ تھا - یہی درد جس کی شدت ظرافت کے ذریعے سے کچھہ کم کردی جاتی ہے "وانکا" اور "آرزوؤں" کا موضوع ہے - "وانکا" ایک یتیم لڑکا ہے جسے اس کے سرپرست بڑی تکلیف سے رکھتے ہیں - اس کا بہت جی چاہتا ہے کہ اپنے گانو واپس چلا جائے جہاں اس کا خیال ہے کہ اس کا دادا رہتا ہے، اور آخر میں وہ اپنی کل شکایتیں ایک میلے کاغذ کے پرزے پر لکھتا ہے، اور "میرے دادا کو، جو گانو میں رہتے ہیں" پتے کی جگہ لکھہ کر کاغذ کو ڈاک کے ڈبے میں ڈال دیتا ہے- "آرزوؤں" میں ایک مفرور مجرم دو پولیس والوں سے جو اس کو تھانے پر لیے جارہے ہیں اپنے ارادے بیان کرتا ہے - وہ کہتا ہے کہ اگر جیل خانے میں رکھنے کے بجائے مجھے سائی بیریا بھیج دیا گیا تو مجھے اُمید ہے کہ مجھے کاشت کے لیے تھوڑی سی زمین مل جائے گی، میں اپنا چھوٹا سا باغ لگاؤں گا اور میرے دن بڑے مزے سے کٹیں گے - اس کی

باتیں سنتے سنتے ایک پولیس والا بڑی بےدردی سے اس سے کہتا ہے کہ تمہاری صحت بہت خراب ہے اور تم سائبیریا میں چھ مہینے بھی زندہ نہ رہ سکوگے - یہ سن کر مجرم کی ساری اُمیدوں پر پانی پھر جاتا ہے' اس کی آنکھوں کی روشنی دھیمی پڑ جاتی ہے' کمر جھک جاتی ہے اور رستے بھر وہ منہ سے ایک حرف نہیں نکالتا —

مختصر افسانوں کے علاوہ چیخوف نے چند لمبے قصے اور افسانہ نما مضامین بھی لکھے - "ڈیوئل" اور "ستپ" جو اس کے سب سے لمبے افسانے ہیں کوئی قابل ذکر خوبی نہیں رکھتے' اور ان میں صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ چیخوف کا خاص طرز مختصر افسانے کے سوا اور کسی قسم کی داستان کے لیے موزوں نہیں تھا۔ اس کے برخلاف اس کے افسانہ نما مضامین خصوصاً "حسین چہرے'- "بچے" "گریشا" نیند" وغیرہ بہت اچھے ہیں- "حسین چہروں" میں اس نے تین لڑکیوں کی صورتوں کا نقشہ کھینچا ہے جن کا اس پر بہت اثر ہوا تھا' اور وہ میٹھا میٹھا درد بیان کیا ہے جو حسن کا دیدار دل میں پیدا کرتا ہے - "بچے" چار پانچ ننھے بچوں کی داستان ہے جو شام کو والدین کی عدم موجودگی میں بیٹھ کر تاش کھیلتے ہیں اور پھر ایک ہی پلنگ پر لدکر سو جاتے ہیں - اسے وہی لکھ سکتا تھا جسے بچوں سے محبت ہو اور جو ان کی ہر حرکت کا معصوم مگر شاعرانہ انداز سمجھ سکتا ہو - "گریشا" ایک دو برس کے بچے کی سرگزشت ہے اور اس میں شعور کے آغاز کی کیفیت جس خوبی اور صحت سے بیان کی گئی ہے اس پر ہر ماہر نفسیات رشک کر سکتا ہے - فن کے اعتبار سے "نیند" کا درجہ ان سب سے بلند ہے - اس میں ایک آٹھ نو سال کی بچی کی نیند کی شدت اور وہ اثر جو نیند کی شدت کا نظر اور حواس پر ہوتا ہے دکھایا گیا ہے - بیان کی

ت یہ ہے کہ پڑھنے والے پر بھی فسردگی طاری ہو جاتی ہے، بچی کی طرح اس کی نظر میں بھی فرق آ جاتا ہے، اور وہ تمام تکلیفیں اسے بھی محسوس ہوتی ہیں جو بیچاری بچی سہتی ہے —

چیخوف کی زندگی میں اس کے افسانوں کا اکیس زبانوں میں ترجمہ ہوا، اور بعض زبانوں میں کئی کئی مختلف ترجمے ہوئے - اسے یہ بے نظیر عزت بھی حاصل ہوئی کہ جرمنی کے شہر باڑن وائلر میں، جہاں اس کا انتقال ہوا تھا اس کے مرنے کے چھ سال بعد اس کی مورت بطور یادگار کے نصب کرائی گئی - روس کے باہر اب بھی وہ اپنے فن میں کامل اور افسانہ نویسی کا بادشاہ مانا جاتا ہے، لیکن روس میں اب اس کی قدر نہیں رہی ہے - اس زمانے کے روسی اس دور کو جب چیخوف کی شہرت عروج پر تھی پستی اور انحطاط کی انتہا سمجھتے ہیں اور وہ نہیں چاہتے کہ روس میں پھر اس قسم کے لوگ پیدا ہوں - چیخوف کو انقلاب کا زمانہ دیکھنا نصیب ہوتا تو اس میں شک نہیں کہ وہ نئی زندگی کا بڑی عقیدت اور محبت سے خیر مقدم کرتا، اور تب شاید روسی نوجوان اس کی یاد تازہ رکھنا اپنا فرض سمجھتے - ہم روس کی نئی پود پر کوئی الزام نہیں لگا سکتے، اس لیے کہ اس زندگی اور ان لوگوں پر جن کی چیخوف نے جیتی جاگتی تصویریں کھینچی تھیں ایسی مردنی چھائی ہوئی تھی جو حوصلہ مندی اور جوانی کے لیے مہلک ہوتی ہے اور نئے دور میں اگر کچھ ہے تو جوش اور جوانی ہے - لیکن اس کے معنے یہ نہیں ہیں کہ روسی چیخوف کو ہمیشہ کے لیے بھول گئے ہیں - جب ان کی نئی زندگی اور نئی تہذیب تکمیل کو پہنچ جائے گی اور

انہیں اس کی مہلت ملے گی کہ دائمی اخلاقی مسائل اور انسانی سیرت کے نہ مٹنے والے نقشوں پر غور کریں تو وہ چیخوف کی تصانیف کے بجھے ہوئے چراغ کو پھر روشن کریں گے' جن تصویروں پر اب گرد جم رہی ہے انہیں صاف کرکے شوق سے دیکھیں گے' اور کوئی تعجب نہیں اگر ان پرانی تصویروں میں انہیں اپنی ہی صورت نظر آے —

ایک ہندی دوہے اور اردو شعر پر مولانا حالی کا محاکمہ

از

اڈیٹر

جناب پنڈت پدم سنگھہ شرما ہندی کے ایک مشہور مصنف گزرے ہیں۔ موصوف ایک جداگانہ اور خاص طرز تحریر کے مالک ہیں - ان کی تحریر میں ایک قسم کا لوچ، اثر، ظرافت، شیرینی اور روانی پائی جاتی ہے - سنسکرت، اردو اور ہندی کے شعرا کے کلام کو ہر مناسب موقع پر پیش کرنے میں انہیں کمال حاصل تھا - حافظہ بلا کا پایا تھا اسی لیے سنسکرت، اردو اور ہندی کے بڑے بڑے شعرا کا کلام ان کی نوک زباں تھا - ہندی کے شاعر بہاری لال کو وہ ہندی زبان کا ایک بلند پایہ شاعر سمجھتے تھے - ہندی ادب میں دوہے کی ایک خاص شان ہے - اس صنف شاعری میں بہاری لال کے دوہوں کو پنڈت جی شاعری کی انتہا خیال کرتے تھے - اُن کی " بہاری ست سئی کی شرح " ہندی دنیا میں مشہور ہے - انہیں اس شرح پر " ہندی ساہتی سمیلن " کی طرف سے بارہ سو روپے کا " منگلا پرساد پرائز " دیا گیا تھا - حال ہی میں ان کی وفات ہوئی ہے —

بہاری لال کے اس دوہے کی انہوں نے بڑی تعریف کی ہے :—

ماتھو ودھی نن اچھّہ چھبی سُوچھّہ را کھیے کاج '
ڈِرگ پگ پونچھن کو کیو بھوشن پایلداج

وہ لکھتے ھیں کہ 'اُردو کے شاعر کے اس شعر میں: —

کیا نزاکت ھے کہ عارض اُن کے نیلے پڑ گئے
ہم نے تو بوسہ لیا تھا خواب میں تصویر کا

شاعر کے خیالی بوسوں سے معشوق کے گل رخسار پر نیلے داغ پڑنے میں بھی وہ لطف نہیں جو اس دوھے کے تخیل میں پایا جاتا ھے " —

" جسم کی نزاکت اور حسن کی یہ انتہا ھے کہ نظر کے پڑنے سے بھی وہ میلا ھوا جاتا ھے! اسی لیے گویا " برھما " نے زیورات کو پایلداز بنا دیا کہ نظر اپنے پانو اس سے صاف کرکے اس سراپا نزاکت معشوق کے جسم پر پڑے - اس کے شفاف مہتابی جسم کو نظر کے پانو خراب نہ کردیں اس لیے پایلداز کو زیورات کی شکل میں بنایا گیا ھے- (نظروں کے پانو اور اُن سے جسم کی درخشانی کا خراب ھوجانا کس قدر نزاکت' صفائی اور نازک خیالی ھے' اس کا کچھہ ٹھکانا ھے؟ " —

اس کے جواب میں رام (ھندی کا ایک مصنف) نے لکھا ھے: —

" ھماری ناقص راے میں اس دوھے پر غور کرنے سے یہ معلوم ھوتا ھے کہ قابل نقاد نے اس دوھے کی تعریف میں بہت کچھہ مبالغے سے کام لیا ھے- کیوں کہ پہلے تو جس اُردو کے شعر سے اِسے بہتر بتایا گیا ھے اس کے ساتھہ اس کا ٹھیک ٹھیک موازنہ نہیں کیا گیا- دوسرے اس دوھے میں ایک بڑا نقص ھے جس پر کچھہ توجہ نہیں کی گئی —

" صرف تصور سے جو محض ایک ذھنی چیز ھے جسم پر اتنا گہرا اثر پڑنا اگر نظر انصاف سے دیکھا جاے تو نزاکت کی کیفیت کو انتہاے کمال پر

پہنچا دیا گیا ہے۔ اب اس کے مقابلے میں " ست سئی " کے دوہے میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ اتنی غیر معمولی بات نہیں ہے جسے اس قدر مبالغے سے قوسین میں دکھایا گیا ہے - اس میں نظر اور جسم ایک دوسرے کے سامنے ہی ہیں۔ لیکن اُردو کے شعر میں خواب میں تصویر کا بوسہ لیا جاتا ہے اور اس کے اثر سے معشوق کے رخسار نیلے پڑ جاتے ہیں۔ اس لیے اس کے تسلیم کرنے میں ہمیں کوئی عذر نہ ہونا چاہیے کہ اس شعر کا تخیل دوہے کے تخیل کے مقابلے میں کہیں اعلیٰ ہے —

دوسرے جب ہم دوہے کے لفظ ودھی (برھما) پر نظر ڈالتے ہیں تو اس سے ہماری مذکورہ بالا رائے کی تائید ہوتی ہے - سب جانتے ہیں کہ زیور کوئی قدرتی چیز نہیں ہے جسے ودھی یا برھما پیدا کر کسی شخص کو پیدا کرتا ہو- وہ ایک مصنوعی چیز ہے- اس لیے اس دوہے میں پایلداز بنانے والا برھما کو قرار دینا کہاں تک درست ہے اسے آپ خود سوچ سکتے ہیں- خلاصہ یہ ہے کہ فاضل نقاد کا اس دوہے کے متعلق یہ رائے دینا کہ یہ دوہا "ست سئی' کے چوٹی کے دوہوں میں سے ہے ہماری رائے میں "ست سئی" کی عظمت کو بڑھانے کی بجائے اور کم کر دیتا ہے - ... ...' —

اس کے جواب میں پنڈت جی نے یہ کیا کہ دوہا اور شعر مہاشے رام کے اعتراض کے ساتھ مولانا حالی کے پاس بغرض اظہار رائے روانہ کردیا- مولانائے موصوف نے اس کے متعلق پنڈت جی کو جو جواب بھیجا وہ درج ذیل ہے :—

جناب من!

عنایت نامے کا جواب بھیجنے میں اس سبب سے دیر ہوئی کہ میں

آنکھوں کی شکایت کے سبب لکھنا پڑھنا بہت کم ہوں - اکثر تحریروں میں دوسرے کا محتاج رہتا ہوں اور بغیر سخت ضرورت کے جواب نہیں لکھتا —

بہاری ست سئی کے دوہے اور ایک اردو شعر کے متعلق جو آپ نے میری راے دریافت کی ہے سو میرے نزدیک شعر کو دوہے کے مضمون سے کچھہ نسبت نہیں- شاعر کیسا ہی ناممکن الوقوع مضمون باندھے جب اُس کے ساتھہ گویا کی قید لگادی پھر ناممکن ناممکن نہیں رہتا —

مثلاً زید بے عیب ہونے میں گویا فرشتہ ہے یا گھوڑا کیا ہے ہوا ہے - یا اُس کے دانتوں کی بتیسی گویا موتیوں کی لڑی ہے یا اُس کا چہرہ چودھویں رات کا چاند ہے - پس جب کہ دوہے کے مضمون میں مانیو یعنی گویا کا لفظ موجود ہے تو اُس میں کوئی استحالہ یعنی عدم امکان باقی نہیں رہتا- برخلاف اس کے شعر کا مضمون بالکل دائرۂ امکاں سے خارج اور ناممکن الوقوع ہے - معترض جس دلیل سے مضمون شعر کے متعلق حد درجہ کی نزاکت ثابت کرتا ہے اُس سے نزاکت کا ثبوت نہیں بلکہ اُس کی نفی ہوتی ہے —

لکھنؤ کے ایک نامور شاعر نے اپنی مثنوی میں بازار کی رونق اور چہل پہل اس طرح بیان کی ہے کہ بازار میں آب گوہر کا چھڑکاؤ ہوتا ہے- ظاہر ہے کہ اس بیان سے بجاے اس کے کہ بازار کی رونق ثابت ہو یہ خیال ہوتا ہے کہ وہاں خاک اُڑتی ہوگی کیوں کہ آب گوہر کا چھڑکاؤ خاک کو دبا نہیں سکتا- اسی طرح شعر مذکور کا حال ہے- کیوں کہ —

خواب میں تصویر کا بوسہ لینے سے صاحب تصویر کے ہونٹوں کا نیلا پڑ جانا بجاے اس کے کہ صاحب تصویر کی نزاکت ثابت کرے بوسہ لینے والے کا جادوگر ہونا ثابت کرتا ہے —

معترض کا یہ اعتراض بھی صحیح نہیں ہے کہ زیور چونکہ مصنوعی چیز

ہے اس لیے برھما یا قدرت کو اس کا بنانے والا قرار دینا غلط ہے کیوں

کہ انسان کے تمام مصنوعات درحقیقت خدا کے مصنوعات ہیں کیوں کہ

انسان خود اُس کا مصنوع ہے۔ اس پر دلیل لانے کی کچھ ضرورت نہیں کیوں

کہ ہر زبان میں ایسی ہزاروں مثالیں موجود ہیں کہ انسان کے کاموں کو

مجازاً خدا کی طرف منسوب کیا گیا ہے اور تصوف اور ویدانت والے تو

انسان کے ہر کام کو مجازاً نہیں بلکہ حقیقتاً خدا ہی کا کام بتاتے ہیں......۔

خاکسار دعا گو

الطاف حسین 'حالی'

کلام جوشش عظیم آبادی

از

قاضی عبدالودود صاحب بیرسٹر ایٹ لا پٹنہ

شیخ محمد روشن جوشش عظیم آبادی غالباً اس دور کے شاعر ہیں جس سے حسن اور مصحفی تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا سال ولادت نہ معلوم ہوسکا، یہ بھی پتا نہ چلا کہ کب انہوں نے وفات پائی۔ بارھویں صدی کے آخری عشرے میں یہ اچھے شاعروں میں شمار ہوتے تھے، اور ۱۲۱۲ ھ تک ان کے زندہ رہنے کا ثبوت موجود ہے۔ ان کی تصانیف سے دیوان اُردو اور رسالۂ قافیہ اب تک باقی ہیں۔ دیوان جس کے صرف ایک ہی نسخے کا اس وقت تک پتا ملا ہے، سنہ ۱۹۳۶ ع میں انجمن ترقی اُردو کی طرف سے چھپ کر شائع ہوجائے گا۔ ذیل میں تذکرۂ عشقی عظیم آبادی سے ان کا ترجمہ نقل کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد اشعار ہیں جو براہ راست دیوان سے ماخوذ ہیں —

"جوشش تخلص اسمش محمد روشن برادر عینی محمد عابد دل تخلص مردے خوش اخلاق و گرم جوش از ریختہ گویان با استعداد عظیم آباد است۔ در علم تیر اندازی و بعضے قواعد ضروریۂ عروض و قوافی و فن ستار نوازی دستے دارد۔ بالجملہ احوال جوہر ذاتی، و صفاتی او بر جمیع صغیر و کبیر روشن و ہویدا است": —

احوال دیکھ کر مری چشم پر آب کا　دریا سے آج ٹوٹ گیا دل حباب کا
آزردہ ایک آن میں سو بار ہوچکا　وہ ترک تند خو تو مرا یار ہوچکا

عیش سے بے بہرہ ہیں اور درد و غم سے بے نصیب　خلق ہوتے ہیں جہاں میں کوئی ہم سے بے نصیب

نہ شکل شیشہ آتی ہے نظر نے جام کی صورت　رہی زیر فلک پھر کون سی آرام کی صورت

جو نہ گزرا نہ ہوا نوح کے طوفان کے بیچ　دیکھ تو آج مرے اشک کے طغیان کے بیچ
نے وہ کعبے میں ہے اے شیخ نہ بتخانے میں　ہم نے دیکھا ہے جسے حضرت انسان کے بیچ
شور بلبل ہے گلستان میں اور خندۂ گل　کیا مزا صبح کو ہے چاک گریبان کے بیچ
آہ اس اشک کے سیلاب میں بہتے بہتے　آگئے خار مژہ ساحل داماں کے بیچ
مصرع ابروے خوباں کے مقابل جوشش　ایک مصرع بھی نہ دیکھا ترے دیوان کے بیچ

اہل جہاں کے ملنے سے ہم احتراز کر　بیٹھے ہیں گوشہ گیر ہو اس دل سے ساز کر
صورت اسی کی ہے متجلی ہر ایک میں　دیکھے جو کوئی چشم حقیقت کو باز کر
جوشش ہو جب تلک کہ حقیقت سے تجھ کو راہ　تب تو برائے شغل تو سیر مجاز کر

دیدار کی ترے نہ گئی آرزو ہنوز　ہم مرگئے پر آنکھوں میں پھرتا ہے تو ہنوز

زلف رکھ دل کو نہ چشم سیہ یار کے پاس　کوئی رکھتا نہیں بیمار کو بیمار کے پاس
صیقل عشق سے دل صاف اگر ہوجائے　مثل آئینہ رہا کیجیے اس یار کے پاس

سینے میں غم عشق نے کی مشتعل آتش　اے اشک بجھانا کہ لگی متصل آتش

گلزار محبت میں نہ پھولے نہ پھلے ہم　مانند چنار آگ میں اپنی ہی جلے ہم
لوہو کی طرح جم گئے تلوار کے منہ پر　ٹکڑے ہوئے پر آگے سے اس کے نہ ٹلے ہم
آزردہ عبث ہوتے ہو تم نالہ کشی سے　تم خوش رہو اے ہم نفساں یاں سے چلے ہم

اے وعدہ غلط تو نہیں آنے کا پھر ایدھر سمجھے ہیں ترے خوب یہ آرے و بلے ہم

بے رحم کسی نے نہ خبرلی ترے در پر جوں نقش قدم رل ہی گئے پاؤں تلے ہم

محفوظ رکھا عشق نے ایذائے اجل سے کلنجشک تھے پر چنگل شاہیں میں پلے ہم

جب عشق کی آتش دل افسردہ میں بھڑکی پتھر تھے یہ سوسے ہی کے مانند گلے ہم

انکھوں میں خلائق کی برے ٹھہرے ہیں جوشش اس هستی موهوم میں آئے تھے بھلے هم

لذت وصل تصور میں اٹھا رهتے هیں گوکہ ظاهر میں سدا اس سے جدا رهتے هیں

کیا گنہ هم نے کیا کون سی تقصیر هوئی اس قدر آپ جو اب هم سے خفا رهتے هیں

ان جفا کاروں کی میں کس کئے فریاد کروں بھولے بھٹکے جو مری قبر پرآ رهتے هیں

غیر همراہ هیں سے نوشی هے بد مستی هے مرگیا هوں یہ مجھے اب بھی ستا رهتے هیں

جوں آئینہ یہ ستم رسیدہ رهتا هے مدام آب دیدہ

ماتم کدۂ جہاں میں جوں ابر رونے کے لیے هوں آفریدہ

کوچے سے ترے اٹھوں نہ هر گز جوں نقش قدم هوں آرمیدہ

ظالم تری گردش نگہ کو کب پہنچے هے آهوئے رمیدہ

اس شوخ کو جب سے میں دیا دل اک خلق هے مجھ سے یاں کشیدہ

تو نے تو کہی هے اس زمیں میں جوشش یہ غزل به از قصیدہ

جوں گرد کارواں نہیں آرام یاں مجھے کس رہ گزر میں چھوڑ گئے همرهاں مجھے

بے مہری سوپہر بھی شرمندہ هو گئی تجھ سے تویہ امید نہ تھی مہرباں مجھے

جوں گرد باد بیٹھنے دیتا نہ چمن سے گردش هی میں رکھیگا سدا آسماں مجھے

نام و نشاں سے هاتھ اٹھاؤں نہ جب تلک کیونکر ترا نشاں ملے اے بے نشاں مجھے

اظہار اپنی خوبیوں کا اس قدر نہ کر معلوم هو گئیں تری سب خوبیاں مجھے

جوشش سوائے شمع شبستاں ہزار حیف — اس بزم میں ملا نہ کوئی ہمزباں مجھے

اوروں کی سنئے پائے نہ اپنی سنا چلے — کیا آئے اس جہان میں ہم اور کیا چلے

مثل حباب دم میں ہو اس کو شکستگی — اس بحر بے کنار میں جو سر اٹھا چلے

اختیاری کیا ہے یہ آوارگی — وہ مثل ہے بندگی بیچارگی

جی نہیں لگتا کہیں کیا بیٹھیے — اٹھ گیا دنیا سے دل یکبارگی

قتل غیروں کو تو کرتا ہے یہ کیا کرتا ہے — یہ گنہ گار ترا تجھہ کو دعا کرتا ہے

وو بلوانے سے کیا کم ہے جو ایسے دل کو دل جانے — برنگ غنچۂ تصویر جو ہر گز نہ کھل جانے

خطبۂ عبدالحق

(جو مدیر 'اردو' نے ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کی منعقدہ اردو کانفرنس کے صدر کی حیثیت سے ۱۲ جنوری سنہ ۳۶ کو پڑھ کر سنایا) -

جناب صدر! حضرات !!

اردو زبان و ادب کا جدید دور گزشتہ صدی کے آغاز سے شروع ہوتا ہے - اس میں چار بڑی باقاعدہ اور منظم تحریکیں عمل میں آئیں —

۱ - فورٹ ولیم کالج ' کلکتہ —

۲ - دہلی کالج -

۳ - سائینٹفک سوسائیٹی علیگڈہ —

۴ - اورینٹل کالج ' لاہور -

پہلی تحریک جو انیسویں صدی کے آغاز میں شروع ہوئی ملکی ضرورت پر مبنی تھی - انگلستان سے رایٹر (محرر) بالکل نو عمر آتے تھے ' یعنی سولہ سے اٹھارہ برس کی عمر کے - ان میں سے اکثر کی تعلیم بہت محدود اور کم ہوتی تھی اور جو کسی کی تعلیم اچھی بھی ہوئی تو اسے مطالعہ اور تعلیمی ترقی کا موقع نہیں ملتا تھا - دوسرے جب یہ نو عمر پہلے پہل ہندوستان میں آتے تو ان کی حالت لاوارثوں کی سی ہوتی تھی اور ابتداے ملازمت میں کوئی ان کی اخلاقی اور مذہبی

حالت کا نگراں اور رہنما نہیں ہوتا تھا - نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ نا اہل اور کاہل ہوجاتے تھے —

دوسری بڑی بات یہ تھی کہ ملازمین کمپنی کو مختلف السنہ و مذاہب اور اطوار و عادات کے لاکھوں آدمیوں کے عدالتی معاملات فیصلہ کرنے' اور اضلاع کی مال گزاری کا انتظام کرنا اور ان کے جھگڑے چکانا پڑتے تھے - عدالتوں میں وکالت اور تمام ضروری کارروائی دیسی زبان کے ذریعے سے ہوتی تھی - قانون انگریزی نہیں بلکہ یہاں کا قدیم قانون رائج تھا - اس لیے مجسٹریٹوں کے فرائض بہت پیچیدہ اور اہم ہوگئے تھے - معمولی فرائض کے علاوہ ججوں' مجسٹریٹوں کو وقتاً فوقتاً گورنر با جلاس کونسل کے سامنے موجودہ قوانین کے متعلق ترمیمات وغیرہ پیش کرنی ہوتی تھیں جس کے لیے انہیں اہل ملک کی خواہشات اور ضروریات کا جاننا ضروری تھا —

سب سے بڑی چیز تجارت تھی جو ایسٹ انڈیا کمپنی کا اصل منشا تھا - اس سے پہلے یہاں کوئی فرماں روا تاجر کے بھیس میں نہیں آیا تھا - اس لیے کسی کو گمان بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ یہ اجنبی تاجر کوٹھیاں بناتے بناتے قلعے تعمیر کرنے لگیں گے اور بیوپار کرتے کرتے کامرانی فرمانے لگیں گے - تجارت کے فروغ کے لیے ضروری ہے کہ تاجر ملک کی زبان اور حالات سے واقف ہو - اور جہاں تجارت کے ساتھ حکومت کا سایہ بھی ہو تو ملک کی زبان' اہل ملک کے عادات اور رسم و رواج اور ان کے آئین و قوانین کا جاننا لازم ہوجاتا ہے —

اسی زمانے میں ایک آفت اور پیدا ہوگئی تھی اور اس کا انسداد ضروری تھا - انقلاب فرانس نے تمام یورپ میں ہل چل مچا دی تھی' مذہبی

اور سیاسی خیالات میں ہیجان پیدا ہوگیا تھا اور وہ خطرناک اصول رفتہ رفتہ کمپنی کے فوجی اور ملکی ملازمین تک بھی پہنچ گئے تھے۔ اس لیے بڑا اندیشہ تھا کہ کہیں یہ لوگ اس کا شکار نہ ہوجائیں۔ ایسے موقع پر دل و دماغ کو زیر کرنے کے لیے دو قوتوں سے کام لیا جاتا ہے۔ ایک حکومت، دوسری مذہب۔ اس لیے حکومت اور مذہب کے اصول سکھانے ضروری تھے تاکہ نو وارد جوان عام روش سے بھٹکنے نہ پائیں۔ اسی وجہ سے مذہبی تعلیم کالج کا جزو تھی اور کوئی اعلیٰ عہدہ یا پروفیسری یا لکچراری کی خدمت کسی غیر عیسائی کو نہیں دی جاتی تھی، اور ایسے عہدہ دار کو اقرار صالح کرنا پڑتا تھا کہ وہ نجی کے طور پر یا علانیہ ایسے عقائد اور آرا کی تعلیم نہ دے گا جو عیسائی مذہب یا چرچ آف انگلینڈ کی تعلیم و ارکان کے خلاف ہو۔

ان خیالات کو پیش نظر رکھ کر لارڈ ویلزلی نے ۴ مئی سنہ ۱۸۰۰ع کو ایک مدرسہ بنام فورٹ ولیم کالج قائم کیا۔ ویلزلی بڑا اولوالعزم شخص تھا۔ اور اس مدرسے کے متعلق اس کے بڑے بڑے خیالات تھے۔ وہ اس میں قدیم و جدید السنہ، ہندوستان کی دیسی زبانوں، اصول قانون، تاریخ عامہ و تاریخ ہندوستان، نیچرل ہسٹری، کیمیا، معاشیات، ریاضی، نباتات وغیرہ سب کی تعلیم دینا چاہتا تھا۔ مگر "پیسے کے لوبھی" کمپنی کے ڈائرکٹروں کے سامنے اس کی کچھ پیش نہ گئی۔ اس لیے اس کی تعلیم زیادہ تر دیسی اور مشرقی زبانوں تک محدود رہ گئی۔ ڈائرکٹر سرے سے کالج کے مخالف تھے، محض لارڈ ویلزلی کی سینہ زوری سے چند سال تک یہ مدرسہ قایم رہا۔

یہ کچھ بھی سہی لیکن اس میں مطلق شبہ نہیں کہ کالج نے دیسی زبانوں اور خاص کر ہندوستانی زبان کے لیے بہت مفید کام کیا۔ اردو

زبان میں سادہ اور روز مرہ کی زبان لکھنے کا ڈھنگ ڈالا - اور مقفی اور مسجع عبارت ترک کردی گئی - کوئی پچاس سے اوپر کتابیں تیار ہوئیں اور طبع کی گئیں - جن میں کچھ ترجمے تھے، کچھ تالیفات اور کچھ انتخابات - جو قصص و حکایات، تاریخ و تذکرہ، لغات و صرف و نحو اور مذہب وغیرہ کے مضامین پر مشتمل تھے - کالج نے اردو زبان کے حق میں دو بڑے کام کیے - ایک تو روز مرہ کی زبان کو صفائی اور فصاحت کے ساتھ لکھنا سکھایا - دوسرے اس زمانے کے لحاظ سے لغت اور صرف و نحو پر جدید طرز پر کتابیں لکھنے کی کوشش کی گئی - اس میں ڈاکٹر جان گلگرسٹ کا بڑا ہاتھ تھا - اس کی بعض کتابیں اب بھی پڑھنے کے قابل ہیں اور اپنا جواب نہیں رکھتیں - ایک کام اس نے یہ کیا کہ نستعلیق ٹائپ کا مطبع قائم کیا اور کالج کی کتابیں اسی میں طبع ہونے لگیں - یہ مسئلہ اب تک زیر بحث ہے اور اس میں جیسی کہ چاہیے کامیابی نہیں ہوئی - اگر یہ کالج قایم رہتا اور حسب ضرورت اس کے مقاصد میں توسیع ہوتی رہتی تو بڑی قابل قدر خدمت انجام دیتا -

دوسری تحریک دلی میں نمودار ہوئی - دہلی کالج کا ذکر ہندوستان کے نظام تعلیم کے سلسلے میں نیز اردو زبان کی تاریخ میں ہمیشہ کیا جاے گا اور تعریف کے ساتھہ کیا جاے گا - اگرچہ افسوس ہے کہ ہندوستان کی تعلیمی تاریخ کے لکھنے والے اسے اکثر بھول جاتے ہیں - اس کی تین بڑی خصوصیتیں تھیں - ایک یہ کہ یہ پہلی درس گاہ تھی جہاں مشرق و مغرب کا سنگم قائم ہوا اور ایک ہی چھت کے نیچے ایک ہی جماعت میں مشرق و مغرب کا علم و ادب ساتھہ ساتھہ پڑھایا جاتا تھا - اس ملاپ نے خیالات کے بدلنے، معلومات میں اضافہ کرنے اور ذوق کی اصلاح میں بڑا کام دیا - اور ایک

نئی تہذیب اور نئے دور کی بنیاد رکھی اور ایک نئی جماعت ایسی پیدا کردی' جس میں سے ایسے پختہ کار روشن خیال اور بالغ نظر انسان اور مصنف نکلے جن کا احسان ہماری زبان اور سوسائٹی پر ہمیشہ رہے گا۔ دوسری خصوصیت اس کی یہ تھی کہ ذریعۂ تعلیم اردو زبان تھا۔ تمام مغربی علوم اردو ہی کے ذریعے پڑھائے جاتے تھے۔ اور باوجود ان موانعات کے جو معترضین ذریعۂ تعلیم کی بحث میں ہر موقع پر پیش کرتے تھے وہ نہایت کامیاب رہا۔ کالج کے پرنسپل اپنی ایک رپورٹ میں لکھتے ہیں کہ "مشرقی شعبے کا طالب علم اپنے مغربی شعبے والے حریف سے سائنس میں کہیں بڑھا ہوا ہے"۔ علاوہ اس کے جن جن ماہران تعلیم اور قابل اصحاب نے کالج کا معائنہ کیا انہوں نے اس کی تصدیق کی۔ ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن احاطۂ بنگال اپنے تبصرۂ تعلیمی بابت سنہ ۱۸۵۳ ع میں لکھتے ہیں کہ:-

"ایک مدت سے دلی کالج کی ایک خصوصیت ایسی چلی آرہی ہے جو اسے بالائی اور زیریں صوبجات کے دوسرے کالجوں سے ممتاز کرتی ہے اور وہ یہ ہے کہ وہاں دیسی زبان (اردو) کے ذریعے تعلیم دی جاتی ہے اور یہ (امتیازی خصوصیت) خاص طور پر ریاضیات کی تمام شاخوں اور کم و بیش تاریخ اور اخلاق و فلسفہ کی تعلیم سے تعلق رکھتی ہے۔ اس طریقۂ تعلیم پر مسٹر بٹروس نے اپنے زمانۂ پرنسپلی میں استقلال کے ساتھ عمل درآمد کیا اور ان کے جانشین ڈاکٹر سپرنگر نے اسی جوش کے ساتھ اسے جاری رکھا۔ یہ اب دہلی کالج کے نظام تعلیم کا ایک جزو تسلیم کرلیا گیا ہے۔ مناسب یہ ہے کہ اسے آزادی کے ساتھ بڑھنے اور پھولنے پھلنے دیا جائے۔ چند سال بعد ہمیں اس کے نتائج کا دوسرے طریقے کے نتائج سے مقابلہ کرنے کا موقع ملے گا"۔ افسوس یہ موقع کبھی نہ آیا۔

تیسری خصوصیت یہ تھی کہ اس سے متعلق ایک ترانسلیشن سوسائٹی (مجلس ترجمہ) تھی - جو کالج کے طلبہ کے لیے انگریزی سے اردو میں درسی کتابوں کے ترجمے کا کام انجام دیتی تھی - یہ ترجمے سب کے سب کالج کے اساتذہ اور طلبہ کے لیے ہوے ہیں - اس مجلس کے ترجموں اور تالیف کی تعداد قریب سوا سو کے ہے - جو تاریخ ' جغرافیہ ' اصول قانون ' ریاضیات اور اُس کی مختلف شاخوں ' کیمسٹری ' میکانیات ' فلسفہ ' طب ' جراحی ' نباتیات ' عضویات ' معاشیات ' وغیرہ علوم و فنون نیز ادبیات پر مشتمل ہیں - اس کالج نے صحیح طریقۂ تعلیم کو رواج دینے اور اردو کو علمی زبان بنانے میں عظیم الشان خدمت انجام دی اور اس زمانے کے لحاظ سے اس کا یہ کام نہایت قابل قدر ہے - اگر سنہ ۵۷ کی شورش میں اس کا شیرازہ نہ بکھر جاتا اور یہ کالج اسی اصول پر قائم رہتا اور زمانے کی ضروریات کے مطابق اس میں اصلاح و ترقی جاری رہتی تو آج ہماری زبان کہیں سے کہیں پہنچ جاتی —

اس کے بعد سنہ ۱۸۶۴ ع میں سر سید احمد خاں مرحوم نے سائینٹفک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی جس کی غایت یہ تھی کہ علمی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرا کے مغربی لٹریچر اور مغربی علوم کا مذاق اہل وطن میں پیدا کیا جاے - اس سوسائیٹی نے تقریباً چالیس علمی اور تاریخی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرائیں - دہلی کالج کے بعد یہ دوسرا ادارہ تھا جس نے اردو زبان میں علوم جدید کو منتقل کرنے اور اسے علمی زبان بنانے کی سعی کی - سر سید اسے انگریزی تعلیم پھیلانے سے بھی زیادہ ضروری اور مقدم سمجھتے تھے - انسٹیٹیوٹ گزٹ اور تہذیب الاخلاق بھی اس کے بچے تھے جنھوں نے ملک میں علمی ذوق اور روشن خیالی پھیلانے میں بڑا کام کیا —

سنہ ۵۷ کی شورش کے کچھ دنوں بعد جب علمی مرکز دھلی سے لاھور منتقل ھوا تو وھاں اوائل سنہ ۱۸۶۵ ع میں ایک انجمن بنام "انجمن اشاعت مطالب مفیدۂ پنجاب" قایم ھوئی جو بعد میں "انجمن پنجاب" کے نام سے موسوم اور مشہور ھوئی اور اس کی سعی سے اورینٹل کالج کی بنا پڑی جو بعد میں پنجاب یونیورسٹی کالج کے تفویض کردیا گیا۔ یہ تعلیمی ادارہ بھی تھا اور تالیف و ترجمہ کی اکیڈمی بھی۔ مترجم زیادہ تر کالج کے معلمین اور اس کے رفقا تھے۔ ان صاحبوں نے مختلف علوم و فنون پر بہت سی انگریزی کتابوں کے ترجمے کیے۔ چند کتابیں تالیف بھی کیں۔ اور بعض سنسکرت، عربی، فارسی کتابوں کے بھی ترجمے کیے۔ اس میں ڈاکٹر لائیٹنز کی کوشش اور استقلال کا بہت بڑا دخل تھا۔ وہ انجمن پنجاب کے پریزیڈنٹ اور اورینٹل کالج کے پہلے پرنسپل تھے اور سنہ ۱۸۸۶ ع تک اس خدمت پر مامور رھے۔ ان کے جانے کے بعد تالیف اور ترجمے کا کام سست پڑ گیا۔ اگرچہ پہلا سا زور شور اور اهتمام نہیں رها تاهم یہ کالج اردو اور مشرقی زبانوں کی خدمت تعلیم اور امتحانات کے ذریعے سے انجام دے رہا ھے۔ اور گو اب وھاں کوئی شعبۂ تالیف و ترجمہ کا نہیں مگر وہ سنت قدیم پروفیسر شفیع، پروفیسر اقبال اور پروفیسر شیرانی کے دم سے زندہ ھے —

یہ چار تحریکیں جن کا سرسری ذکر میں نے آپ کی خدمت میں کیا ھے، گزشتہ صدی کی ادبی اور علمی ترقی میں بہت بڑی اهمیت رکھتی ھیں۔ فورٹ ولیم کالج، دھلی کالج اور اورینٹل کالج نے اردو زبان کے لیے جو کام کیا وہ خاص ضرورت سے تھا یعنی درسی کتب کا بہم پہنچانا۔ مگر اس میں شک نہیں کہ اس میں بہت سی کتابیں ایسی بھی تھیں جو عام مطالعے کے لیے بھی مفید تھیں اور ان سے علم و ادب کے

شائقین کو بہت فائدہ پہنچا - علاوہ معلومات میں اضافہ کرنے اور خیالات میں انقلاب پیدا کرنے کے سنجیدہ مضامین کے لکھنے کا اسلوب بھی رائج ہو گیا - سائنٹفک سوسائیٹی کا مقصد عام تھا لیکن اس کا کام بھی دہلی کالج ہی کے نہج پر ہوا - ان اداروں کے حالات پر غور کرنے سے البتہ ایک بات کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ ہر ادارے نے از سر نو کام شروع کیا - اور گزشتہ تحریکوں سے کوئی سلسلہ اور ربط قایم نہ ہوسکا - یعنی نہیں دیکھا کہ اس سے پہلے کیا کام ہوا ' کون کون سی کتابیں لکھی اور ترجمہ کی گئیں ' کون کون سے نئے الفاظ وضع کیے گئے اور کون سے ایسے پرانے الفاظ تھے جو نئی اصطلاحات کے لیے استعمال کیے گئے - ان کی کونسی چیزیں اختیار کرنے کے قابل ہیں اور کون سی قابل ترک - اس سے بڑی بصیرت ہوتی ہے اور کام میں آسانی ہو جاتی ہے - جس طرح پچھلوں کے اچھے کام اگلوں کے حق میں مفید ہوتے ہیں اسی طرح ان کی غلطیاں کچھ کم مفید نہیں ہوتیں تاکہ آنے والے ان سے بچیں اور ان کا اعادہ نہ کریں —

میں دیکھتا ہوں کہ اس زمانے میں جو ادارے زبان و ادب کی ترقی و اشاعت کا کام کر رہے ہیں وہ بھی انہیں غلطیوں میں مبتلا ہیں - اور اس سے بھی بڑی غلطی یہ ہو رہی ہے کہ ان کا کام کسی اصول پر نہیں ہو رہا ہے - کوئی کتاب اچھی سی ہاتھ لگ گئی اس کا ترجمہ کر لیا - کسی نے کوئی چیز لکھ کر بھیجی ' کمیٹی نے پسند کی ' چھپ گئی - کوئی تالیف شایع ہوئی ' سفارش کے ساتھ پیش ہوئی انعام دے دیا - کچھ لکچر دلوا دیے ' کچھ جلسے کر لیے اور سب سے بڑا کارنامہ یہ کہ مشاعرے کا اہتمام کر دیا - گویا ہم اندھیرے میں چاند ماری کر رہے ہیں ' لگا تو تیر نہیں تکا - اس طرح سے کام نہیں ہوتے ' ان حرکتوں سے زبان

اور ادب نہیں بنتا، ان طریقوں سے آپ خیالات میں انقلاب اور طبائع میں جدت نہیں پیدا کرسکتے - اس سے بھی بڑی کوتاہی بلکہ معصیت جس کا ارتکاب یہ ادارے کر رہے ہیں وہ یہ ہے کہ ان اداروں میں باہمی اتحاد اور ارتباط نہیں ہے - ہر ایک نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنا رکھی ہے - جب مقصد ایک ہے، کام ایک ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم کبھی کبھی سر جوڑ کر نہ بیٹھیں، اپنے کاموں پر نظر نہ ڈالیں اور آیندہ کے لیے اپنے کام کاکوئی ایسا نقشہ تیار نہ کریں جو حقیقی طور پر ہمارے ادب کے حق میں مفید ہو - اس اتحاد عمل، امداد باہمی اور تقسیم کار سے کام میں سہولت اور توسیع اور عمل میں قوت پیدا ہوگی نیز بہت سے ایسے مسائل حل ہو جائیں گے جو اس وقت ہماری توجہ کے محتاج ہیں - اس طرح سال میں ایک آدہ بار باہم مل بیٹھنے سے اور بہت سی کارآمد باتیں سوجھ جائیں گی جو فرداً فرداً غور کرکے خیال میں نہیں آتیں - لیکن یہ مجلسیں ہنگامے کی خاطر نہیں بلکہ کام کے لیے ہونی چاہیئیں اور ان میں صرف انہیں کو دعوت دی جائے جو اہل نظر اور صاحب رائے ہیں - بعد میں اُن کی تجویزیں اور فیصلے اطلاع عام اور تنقید کے لیے شایع کیے جائیں تاکہ ضرورت ہو تو ان فیصلوں پر نظر ثانی کی جاسکے —

حاشا و کلا، میرا مقصد کسی ادارے کو الزام دینا نہیں - ہر ادارہ اپنی بساط اور فکر کے مطابق کچھ نہ کچھ ضرور مفید کام کررہا ہے - لیکن میرا خیال ہے کہ موجودہ حالت میں جس طرح کام ہو رہا ہے اس میں بہت سا وقت، محنت اور روپیہ رائیگاں جاتا ہے - اگر ہم متفقہ طور پر کام کی نوعیت، کام کی تقسیم، اس کی ترقی و اشاعت اور جدید ضروریات کے

متعلق غور کرکے کچھ امور طے کرلیں گے اور ان کے عمل میں لانے کی کچھ تدبیریں بھی سوچ لیں گے اور ان کے انجام دینے کے وقت کا بھی تعین کرلیں گے تو یقین ہے کہ ہم اتنے ہی وقت میں اُسی قدر محنت اور روپے کے صرف سے بہت بڑا اور بہت بہتر کام کرسکیں گے۔ میں یہ ذاتی تجربے کی بنا پر عرض کرتا ہوں۔ انجمن ترقی اُردو ایک مدت تک اٹکل پچو کام کرتی رہی۔ ایک عرصے کے بعد مجھے تجربہ ہوا کہ اس طرح بے اسلوبی سے کام کرنا کچھ زیادہ مفید نہیں، ایک منظم ادارے کا کام جس کا مقصد زبان و ادب کی ترقی ہے اس سے بہتر و افضل ہونا چاہیے۔ چنانچہ اب ہم نے ایک خاص اصول پر کام کرنا شروع کیا ہے مثلاً ہم نے اردو شعرا کے تذکرے ڈھونڈ ڈھونڈ کر مرتب کیے۔ اور اس وقت تک بہت سے کم یاب اور نادر تذکرے شایع ہو چکے ہیں اور بعض ابھی زیر ترتیب ہیں۔ ان تذکروں سے اردو ادب کا ارتقا اور اس زمانے کی معاشرت کے متعلق بہت سی معلومات حاصل ہوتی ہیں اور بہت سی غلط فہمیاں اور غلط بیانیاں جو اب تک چلی آرہی تھیں ان کی بدولت دفع ہوگئیں۔ چنانچہ ان تذکروں کی اشاعت کے بعد اردو ادب کی تاریخ کے متعلق جو تحریریں اور کتابیں شایع ہوئی ہیں ان کے مولفوں نے ان سے استفادہ کیا ہے۔ اسی طرح انجمن نے قدیم اردو ادب کے متعلق تحقیق و جستجو کا سلسلہ جاری رکھا ہے اور اردو کی بعض قدیم کتب نظم و نثر شایع کی ہیں جن سے ابتداے زبان کی کیفیت معلوم ہوتی ہے۔ نیز انجمن نے ایک سلسلہ لغات کا بھی ترتیب دینا شروع کیا ہے۔ فی الحال انگریزی اردو کی ایک مبسوط اور جامع لغات زیر طبع ہے اور جلد شایع ہو جائے گی۔ انگریزی هندی لغات بھی زیر ترتیب ہے۔ پیشہ وروں کی اصطلاحات بھی مکمل

ہوچکی ہیں اور اب ان کی نظر ثانی کی جا رہی ہے اس میں تقریباً بیس ہزار اصطلاحات مختلف پیشوں کی بڑی تلاش اور محنت سے جمع کی گئی ہیں۔ قدیم اردو کی لغات بھی زیر ترتیب ہے۔ قدیم الفاظ موجودہ لغت کی کتابوں میں نہیں ملتے اس سے ادبی تحقیق میں بہت مدد ملے گی۔ تقریباً ایک سال سے جائزۂ زبان اُردو (اردو سروے) کا کام بھی جاری ہے۔ اکثر صوبوں اور علاقوں سے رپورٹیں وصول ہو چکی ہیں اور باقی مقامات پر کام ہو رہا ہے۔ اس وقت ایک اور تجویز میرے زیر غور ہے۔ یہ ارادہ ہے کہ دنیا کی اعلیٰ زبانوں میں جتنی مہا تصانیف (کلاسکس) ہیں ان سب کا ترجمہ اردو میں کر دیا جائے۔ میں نے اس کی ایک فہرست تیار کی ہے جو خاص خاص اصحاب کی خدمت میں رائے کے لیے بھیجی جا رہی ہے۔ اگر یہ تجویز عمل میں آ گئی تو ہماری زبان میں ایک ایسا عجیب و غریب سامان مہیا ہو جائے گا جو دنیا کا بہترین کارنامہ اور بنی نوع انسان کا افضل ترین اِرث سمجھا جاتا ہے اور اس سے ہماری زبان کو جو بیش بہا فائدہ پہنچیگا وہ محتاج بیان نہیں۔ اس کے علاوہ ہم دنیا کی موجودہ بڑی بڑی تحریکوں پر بعض کتابیں تالیف کرا رہے ہیں جو معلومات کی توسیع میں بڑا کام دیں گی۔ اس بیان سے میرا مطلب انجمن ترقیء اردو کا اشتہار دینا نہیں بلکہ مثال کے طور پر وہ طریقۂ عمل بتانا ہے جس پر انجمن اس وقت کار بند ہے یا جو اس کے پیش نظر ہے —

ادبی اداروں کے اتحاد عمل سے ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوگا کہ اس وقت جو ہمارے ادب میں بے راہ روی پائی جاتی ہے اس کا بھی انسداد ممکن ہے۔ جب ہم متفقہ طور پر اس کے خلاف آواز بلند کریں گے تو ہماری آواز بے اثر نہیں رہے گی۔ آج کل ہمارے ادب میں خیالی یا

اس وقت کے محاورے میں رومانی رنگ غالب ہوتا جاتا ہے - کچھ مدت ادب جدید کا ایک ایسا دور رہا جس کا تعلق زیادہ تر علی گڈہ تحریک سے تھا' اس وقت کے اہل ادب مثلاً سر سید احمد خاں یا مولانا حالی زندگی کے واقعات اور اس کی مشکلات سے بحث کرتے تھے' قومی تنزل کے اسباب' آئندہ ترقی کی تدابیر' تعلیم کی ترغیب' دشواریوں سے مردانہ وار مقابلہ' رسم و رواج اور توہمات کی تنقید' ادب کی اصلاح وغیرہ وغیرہ ایسے مضامین تھے جن پر بحث کرنے سے ان کا قلم نہیں تھکا- مولوی نذیر احمد جیسے عالم نے جتنے ناول لکھے وہ سب اس وقت کی زندگی معاشرت کا آئینہ ہیں - لیکن اس زمانے میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ 'ش اور 'آزاد' کی روح نئے جون میں نمودار ہوئی ہے - ہمارے ادیب اور شاعر عالم خیال میں پرواز کرتے پھرتے ہیں اور روز بروز حقیقت اور زندگی سے دور ہوتے جاتے ہیں- یوں سمجھیے گویا وہ زندگی کی حقیقتوں اور دشواریوں اور ان پر غور و فکر کرنے سے بچنے کی کوشش کر رہے ہیں- لیکن کیا وہ ان حیلوں سے بچ سکتے ہیں؟ ادب کی بنا زندگی پر قائم ہے اور اگر یہ نہیں تو وہ ایک لچر سی کہانی ہے —

یہ جو کہا گیا ہے کہ ادب زندگی کا ایک آئینہ ہے وہ حقیقت پر مبنی ہے- مثلاً عرب جاہلیت کے شعرا کو لیجیے- شاعری ان کی رگ رگ میں بھری ہوئی تھی- معمولی سا معمولی اور جزوی سا جزوی معاملہ بھی ان کی نظر میں ایک بڑا واقعہ تھا' اور تحریک شعر کے لیے کافی تھا- ان کی لڑائیاں ان کی فتح و شکست' عشق و محبت (خیالی نہیں) خوف و خطر' انتقام' مہمان نوازی وغیرہ یہاں تک کہ ایک بچھیرے کی ولادت تک کا نقشہ ان کی نظموں میں زندہ موجود ہے- ان کے کلام

میں تازگی ' آزادی ' مردانہ پن اور ذوق زندگی پایا جاتا ہے - اگر ہم ان کے کلام کا مطالعہ کریں تو اس زمانے کی معاشرت ' رسم و رواج اور خیالات و توہمات کی تاریخ مرتب کر سکتے ہیں - گزشتہ تیس سال میں ہماری زندگی میں بہت کچھ تغیر واقع ہوا ہے - اگر دو ایک شاعروں سے قطع نظر کیا جاے تو کیا ہمارے شعرا کے کلام میں کہیں بھی اس انقلاب کا پتا ہے - ہمارے شاعر یہ سمجھتے ہیں کہ وہ تلامیذالرحمان ہیں - مشاہدہ ' مطالعہ اور حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں' ان کے دلوں پر آسمان سے ہر وقت الہام کا نزول ہوتا رہتا ہے - لیکن اگر انہیں اپنا اور دوسروں کا وقت ضایع کرنا منظور نہیں تو انہیں اپنی ہوائی پرواز سے اس ناپاک زمین پر اُتر آنا پڑے گا - ورنہ ان کی شاعری کو کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا —

ہمارے رسالے اور اخبار بھی بہت کچھ اسی رنگ میں ڈوبے نظر آتے ہیں - وہ دنیا کی ان عظیم الشان تحریکوں پر جنہوں نے دنیا میں ہیجان پیدا کر رکھا ہے بہت کم سنجیدگی سے بحث کرتے ہیں - وہ زیادہ تر ادب لطیف ' معمولی فسانوں ' اور نظم نما نثر کے شائق معلوم ہوتے ہیں - ایک بڑا عیب یہ ہے کہ جب کبھی وہ ملکی معاملات پر بحث کرتے ہیں اس میں فرقہ بندی کی بساندہ آنے لگتی ہے - یا خواہ مخواہ ایسے معاملات کو جن کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں مذہبی رنگ میں پیش کرتے ہیں - یہ عام طور پر ہندی اردو اخباروں اور رسالوں کی حالت ہے - اس سے تنگ نظری اور تعصب پیدا ہوتا ہے - اور یہ ادب کے حق میں زہر ہے - اگر ہمارے ادبی ادارے اور کسی غرض سے نہ سہی ' صرف ادب کی خاطر یہ تصفیہ کرلیں اور متفقہ طور پر ان باتوں سے اپنی بیزاری ظاہر کریں

تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کا اثر نہ ہو - لیکن صرف تجویزیں پیش کر دینا اور قرار دادیں منظور کر لینا کافی نہ ہوگا - ان اداروں کو خود بھی ان پر عمل کرکے دکھانا ہوگا —

اس قسم کے اور بہت سے قصے قضیے ہیں مثلاً ہندی اردو یا رسم الخط کی بحث یا اور چھوٹے موٹے مسائل جن کا تعلق زبان اور ادب سے ہے - ان جھگڑوں کے چکانے کا یہی طریقہ ہوسکتا ہے جو میں نے عرض کیا - اپنی اپنی جگہ پر ہر ایک اپنی رائے کو صائب اور قوی سمجھتا ہے - لیکن باہم مل بیٹھنے اور مشاورت کی بڑی کرامات یہ ہے کہ جن رایوں کو ہم اٹل سمجھے بیٹھے تھے وہ باہم گفتگو کرنے کے بعد چھوٹی چھوٹی معلوم ہونے لگتی ہیں - خلوص نیت شرط ہے —

رسم الخط کا مسئلہ آج کل بہت زیر بحث ہے اور خاصا بڑوں کا چھتا بن گیا ہے - اس میں مشکل یہ آپڑی ہے کہ جیسا ہمارے ہاں عام دستور ہے رسم الخط کو قومی تہذیب اور مذہب کا جز سمجھ لیا گیا ہے - اس لیے موجودہ حالات میں یہ توقع نہیں ہوسکتی کہ لوگ ٹھنڈے دل سے اس پر غور کریں گے - لیکن اس کے یہ معنے نہیں کہ ہم اس پر بحث کرنا ترک کر دیں - غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس مسئلے کو جذبات اور مذہب سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ اقتصادی مسئلہ ہے - جس رسم خط میں صرف کم ہوگا ، وقت کم لگے گا ، جگہ کم گھیرے گی اور جس کے پڑھنے میں آسانی ہوگی اور جو دیکھنے میں بھی خوشنما ہوگا وہی مقبول ہو کے رہے گا - عام طور پر لوگوں نے اسے ہندی اردو سے متعلق کر کے جھگڑے کے لیے ایک نیا شاخسانہ کھڑا کرلیا ہے - اس کا حل آسان ہو لیکن اس کا رواج آسان نہیں - اس کے لیے ایک مدت درکار ہے - فی الحال یہ مناسب معلوم

ہوتا ہے کہ اردو رسم الخط میں جو نقائص ہیں ان کی اصلاح کشادہ دلی سے کی جائے ۔ ہندی سمیلن نے اس کی طرف قدم اٹھایا ہے ۔ اسی طرح اگر کوئی ایسی کمیٹی قرار دی جائے جو اردو رسم الخط پر غور کر کے اس میں مناسب اصلاح عمل میں لائے تو ایک مفید کام ہوگا —

ہندستانی اکیڈمی کا وجود اس صوبے میں بہت غنیمت ہے ۔ وہ اس قسم کے مسائل حل کرنے اور اسی طرح کی اصلاحیں عمل میں لانے کے لیے قایم کی گئی تھی ۔ میں اس وقت اس کے کاموں پر کوئی تبصرہ کرنا نہیں چاہتا ۔ لیکن اکیڈمی کے کار فرماؤں کی خدمت میں اس قدر عرض کرنے کی جرات کرتا ہوں کہ جب اکیڈمی نے ہندستانی کا لقب اختیار کیا ہے اور ہندستانی کے رواج کا بیڑا اٹھایا ہے تو کیوں اب تک ایسی کتابیں تالیف نہیں کرائی گئیں ، اور کوئی رسالہ ایسا شائع نہیں کیا گیا جو ہندستانی زبان میں ہو ۔ اور بجنسہ بغیر کسی تغیر و تبدل کے دونوں رسم الخط میں لکھا جا سکے ۔ اگر یہ ممکن ہو اور اکیڈمی اس کی کوشش کرے تو زبان کی بڑی خدمت ہوگی ۔ اور یہ جو اعتراض ہے کہ ہندستانی کی دوڑ صرف معمولی بول چال اور کاروبار تک ہے اور ادب میں اس کو کوئی حیثیت حاصل نہیں ' بہت کچھہ رفع ہو جائے گا ۔ اور اس سے بھی زیادہ مفید کام جو اکیڈمی کرسکتی ہے وہ یہ ہے کہ اسی زبان میں ریڈریں تیار کرائے جو دونوں رسم الخط میں لکھی جائیں اور مدارس میں رائج کی جائیں ۔ اس سے وہ دو رنگی جو اس وقت اس صوبے کے مدارس میں پائی جاتی ہے خود بخود اٹھہ جائے گی اور لڑکے ابتدا سے ایسی زبان لکھنے اور بولنے کے عادی ہوجائیں گے جو اس علاقے کا ہر شخص سمجھہ سکتا ہے ۔ ہندستانی کے رواج کا سب سے بڑا

ذریعہ یہ مدارس ہو سکتے ہیں —

حضرات ! وقت گزرتا جاتا ہے اور بہت سے ایسے مسائل ادھورے پڑے ہیں - اگر ہم فوراً اور بہت جلد ان کو طے نہیں کرسکتے تو کم سے کم ہمیں ان کے جلد طے کرنے کا سامان فوراً مہیا کرنا چاہیے - جس وقت کوئی ایسی تجویز پیش ہو اور انشاءاللہ اس کا موقع بہت جلد آنے والا ہے تو مجھے امید ہے کہ وہ اصحاب جو اپنی زبان کے سچے بہی خواہ ہیں اپنے تجربے اور مشورے سے مدد دینے میں دریغ نہ فرمائیں گے —

مضامین تیگور

حسن اور ادب

مترجمۂ

جناب پنڈت ونشی دھر صاحب ودیا النکار

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ "احساس حسن" اور "ادبیات عالم" ان دونوں مضامین میں ہم جو کچھہ کہنا چاہتے تھے وہ صاف نہیں ہوا - اس لیے ہم اس مضمون میں حتی الامکان مذکورہ باتوں کے اعادے سے بچتے ہوے اصل مطلب کو صاف کرنے کی کوشش کریں گے - کسی واقعے کے متعلق صرف یہ جان لینا کافی نہیں ہے کہ وہ پیش آتا ہے وہ کیوں پیش آتا ہے؟ اس کی ابتدا اور انتہا کیا ہے؟ دنیا کے دوسرے واقعات کے ساتھہ اس کا کیا تعلق ہے؟ اگر ہم ان سب باتوں کو نہ جانیں تو ہم اُس واقعے کو پوری طرح نہیں سمجھہ سکتے - اسی طرح جس حقیقت کے متعلق ہم صرف یہ جانتے ہیں کہ اس کا وجود ہے لیکن اس سے ہمیں کوئی مسرت حاصل نہیں ہوتی، اس کے متعلق یہی کہنا مناسب ہوگا کہ اس کا وجود ہمارے دل کے لیے ہے ہی نہیں - ہم اتنی وسیع دنیا میں رہ کر بھی اس کے بڑے حصے کو نہ سمجھہ سکے اور اس کا بڑا حصہ ہی ہماری خوبصورت دنیا کے ساتھہ مل کر ہمارا اپنا نہیں بن سکا —

دنیا کے جتنے حصے کو ہم اپنے علم کے ذریعے جانیں گے اور دل کے ذریعے حاصل اکریں گے اسی قدر ہم میں وسعت پیدا ہوگی - دنیا جس قدر ہم سے دور ہے اسی قدر ہم بے حقیقت ہیں - اسی وجہ سے ہمارا دماغ، دل، اور قوت عمل اس پر زیادہ قدرت حاصل کرنا چاہتے ہیں - اس طرح ہمیں حقیقت اور اقتدار میں وسعت حاصل ہوتی ہے --

اس منزل ارتقاء میں ہمارے احساس حسن کا مصرف کیا ہے؟ حقیقت کے جس خاص حصے کو ہم خاص طور پر حسین کہتے ہیں کیا وہ اسی حصے کو ہمارے دل کے سامنے نمایاں کرکے باقی حصے کو غیر اہم بنا دیتا ہے - اس صورت میں تو ہماری ترقی میں حسن ایک رکاوٹ ہے - اس عالم حقیقت میں اگر ہم اپنے دل کو وسیع ہونے دیں تو یہ ہمارے لیے بڑی روک ہے - ایسے حالات میں حسن نے حقیقت کے درمیان بندھیا چل کی طرح کھڑے ہوکر اُسے حسین اور غیر حسین آریہ ورت اور دکن دونوں میں تقسیم کرکے ان کی آمد و رفت کے راستے کو دشوار گزار بنا دیا ہے- ہم نے یہ کہنے کی کوشش کی تھی کہ یہ بات نہیں ہے - جس طرح علم رفتہ رفتہ حقیقت کل کو ہماری قوت عقل کے تحت لانے کے لیے ہمیشہ سے کوشاں ہے اسی طرح احساس حسن بھی رفتہ رفتہ تمام حقیقت کو ہماری مسرت کا ملک کش بنائے گا - احساس حسن کی کامیابی اسی میں ہے- تمام کائنات حقیقت ہے اس لیے کائنات ہی ہمارے علم کا موضوع ہے - تمام کائنات خوبصورت ہے اس کی ہر چیز ہمارے لیے باعث مسرت ہے - کائنات کے لیے گلاب کا پھول اتنا اہم نہیں جتنا کہ وہ احساس جو اسے خوبصورت بنا دیتا ہے —

کائنات میں جس قدر تنوع ہے اُسی قدر کٹھن پابندی ہے- اس کائنات کے مرکز کو عبور کرنے والی طاقت بے انتہا اختلافات کے ذریعے خود کو

چاروں طرف ہزارہا حصوں میں تقسیم کردیتی ہے اور اُس کے مرکز کا طواف کرنے والی طاقت بے انتہا گونا گونی کے حسن میں ارتباط قائم کرلیتی ہے- وسعت اور ضبط کی اس کشاکش میں حسن کا راز مضمر ہے- کائنات میں اسی وسعت و ضبط کے دوامی جلووں میں جمال باری خود کو نمایاں کررہا ہے- ایک جادوگر جب بہت سے گیندوں کو بیک وقت اچھالتا ہے تو ہاتھوں کی عجیب صفائی کے ساتھ وہ حسن کی تخلیق بھی کرتا ہے- اس کھیل میں اگر کسی گیند کی ایک لمحے کی حالت ہی ہمیں دکھائی دیتی ہے تو وہ یا تو اُس کا اٹھنا ہوتا ہے یا گرنا' اور چونکہ ہم اُسے پورے طور پر نہیں دیکھ سکتے اس لیے مسرت کی تکمیل بھی نہیں ہوتی- کائنات کی مسرت کے جلوے کو ہم جس قدر زیادہ کامل طور پر دیکھتے ہیں اتنا ہی ہمیں پتا لگتا ہے کہ نیک و بد' دکھ سکھ' حیات و ممات سبھی کا زیر و بم ایک نغمۂ جہانگیر سنا رہا ہے- اگر ہم کامل طور پر دیکھیں تو یہ راگنی کہیں نہیں ٹوٹتی' کہیں بھی حسن کی کمی نہیں ہے- کائنات میں حسن کا اس طرح کامل طور پر مطالعہ کرنے کا علم ہی احساس حسن کا انتہائی مقصد ہے- انسان اس مطالعے کی سمت میں جتنا آگے بڑھ رہا ہے اپنی مسرت کو اتنا ہی بڑھاتا چلا جارہا ہے- پہلے ہمارے لیے جو چیز بے کار تھی اب وہ کارآمد ہوتی چلی جارہی ہے- انسان پہلے جس چیز سے سے بے پروا تھا آہستہ آہستہ وہ اُسے اپنے ساتھ ملا رہا ہے اور جس چیز کو وہ غیر متعلق سمجھتا تھا اسے وسیع کائنات میں دیکھ کر اس کے رتبے کو سمجھ رہا ہے اور مطمئن ہو رہا ہے- تمام کائنات میں حسن کے اس طرح مشاہدہ کرنے کا بیان اور مسرت کے ذریعے کائنات پر حکومت کرنے کی تاریخ انسانی ادب کی لوح پر اپنا نقش مرقوم کررہی ہے —

لیکن حسن کو ہم اکثر مکمل حقیقت سے الگ کر کے دیکھتے ہیں اور اس غرض سے فرقہ بندی کرتے ہیں - یہ اکثر دیکھا جاتا ہے کہ یورپ میں حسن کی اشاعت اور حسن پرستی مذہبی جنون کی حد کو پہنچ گئی ہے ۔ داد شجاعت دینا گویا خاص طور پر حسن کا مطالعہ ہے - اس ڈھنگ سے ایک جماعت وہاں اپنی فتح کے پھریرے اُڑاتی پھرتی ہے ۔

دیکھا گیا ہے کہ یہ لوگ اس دھن میں خدا کو اپنا ہم جماعت سمجھنے لگتے ہیں اور غیروں سے کھلے بندوں لڑا کرتے ہیں —

یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ حسن کو خاص طور پر حاصل کرنے کے لیے دنیا کی اور تمام چیزوں کی پروانہ کرکے صرف اُس کے پیچھے دوڑتے پھرنا بہت ہی تھوڑے لوگوں کا کام نہیں ہے - ہمیشہ حسین اور غیر حسین سے بچ کر جینی سادھوؤں کے مانند اگر ہم اپنا ہر ایک قدم تول تول کر رکھیں گے تو ہم چل ہی نہیں سکیں گے —

دنیا میں حسن اور نفاست کے باریک بیں شیدائی ان چیزوں کا موٹا حساب کرنے والے لوگوں سے نفرت کرتے ہیں - وہ انھیں غیر مہذب کہتے ہیں - اور موٹا حساب کرنے والے لوگ پس و پیش کے ساتھ اس بے عزتی کو برداشت کرلیتے ہیں —

یورپین ادب میں حسن کے نام پر عام فہم اور فطری عناصر کو بے کار کہہ کر حقارت کے ساتھ دور ہٹادینے کی کوشش کہیں کہیں نظر آتی ہے - یاد پڑتا ہے کہ کئی دن ہوے کسی بڑے مصنف کی لکھی ہوی فرنچ زبان کی ایک کتاب کا انگریزی ترجمہ ہم نے پڑھا تھا - یہ کتاب بہت مشہور ہے - شاعر "سون برن" نے اس کتاب کو (gospel of Beauty.) یعنی انجیل حسن کی سند عطا کی ہے - اس میں ایک طرف ایک مرد نے

اور دوسری طرف ایک عورت نے اپنی زندگی کا نصب العین یہ بنا لیا ہے کہ دنیا کے تمام مرد اور عورتوں میں سے اپنی دلی خواہش کے مطابق حسن کو ڈھونڈ نکالے - دنیا میں جو کچھہ روز مرہ پیش آتا ہے، جو کچھہ سب کا ہے، جو کچھہ "عامیانہ" ہے اس سے خود کو بالکل بچاکر اور اکثر انسانوں کی معمولی زندگی کی قدم قدم پر توہین کرکے تمام کتاب میں حیرت انگیز خوش سلیقگی سے نئے نئے پیرایوں میں حسن کے عروج کے متعلق ایک گہرے استعجاب کا اظہار کیا گیا ہے - ہم تو سمجھتے ہیں کہ ہم نے کوئی ایسی سخت کتاب نہیں پڑھی - ہمارے دل میں صرف یہی خیال پیدا ہوتا تھا کہ اگر حسن کی کشش انسانی دل کو دنیا سے اس طرح الگ کردے، اسے اپنے ماحول سے تعلق نہ رکھنے دے، جو کچھہ معمولی ہے اسے ہیچ کہے اور ہر قسم کی فلاح و بہبود کو حقیر تصور کرکے اس کی ہنسی اُڑائے تو ایسے حسن پر لعنت ہے - یہ وہی بات ہوئی کہ انگوروں کو مسل کر ان کی ساری خوبصورتی، رس اور خوشبو کو پامال کرکے کیمیاوی طریقے سے ان کی شراب بنالی جائے-

حسن ذات پات یا چھوت چھات کا قائل نہیں - وہ مساوات کا علمبردار ہے - وہ ہماری آنی جانی زندگانی میں بقا کو اور ہمارے معمولی رنگ روپ ہی میں غیر محدود حیرت کو منعکس کردیتا ہے- حسن اس صدا سے ہمارے دلوں میں ارتعاش پیدا کرتا ہے جو کائنات کے کانوں میں اول اول گونجی تھی- ہم حسن ہی کی بدولت کامل حقیقت کو صاف طور پر دیکھہ لیتے ہیں- پھاگن کے مہینے میں شام کے وقت میں ایک گانو کے راستے پر چل رہا تھا- لہلہاتے ہوے سرسوں کے کھیت سے آتی ہوئی خوشبو نے اُس اونچے نیچے راستے کو، اُس تالاب کے کنارے کو، اُس جھلملاتے ہوے شام کے وقت کو میرے

دل میں ہمیشہ کے لیے نقش کر دیا - جسے میں کبھی آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھتا
اُسے اُس خوشبو نے مجھے اچھی طرح دکھا دیا ' جسے میں بھول جاتا اُسے بھولنے
نہیں دیا - حسن کے ذریعے ہم جس چیز کو دیکھتے ہیں اس میں صرف ہم
اسی چیز کو نہیں بلکہ اس کے ساتھ کی اور سب چیزوں کو دیکھتے ہیں -
ایک دلکش راگ جل تھل' آکاش اور تمام موجودات میں ایک قسم کی
شان پیدا کر دیتا ہے - ادبیات کے ماہرین نے بھی تمام موجودات کی
آن بان کو آشکار کرنے کی ذمہ داری لی ہے - وہ زبان' بحر اور طرز
تحریر کی نزاکتوں کے ذریعے ایسی تمام چیزیں ہماری نظروں کے سامنے
پیش کر دیتے ہیں جنہیں ہم روز مرہ کی چیز سمجھ کر کبھی آنکھ اٹھاکر
بھی نہ دیکھتے - عادت کی وجہ سے ہم معمولی چیزوں کو سرسری طور
پر دیکھتے ہیں لیکن جب وہ انہیں معمولی چیزوں کو اپنے حسن بیان
کے ساتھ پیش کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ چیزیں معمولی
نہیں ہیں - حسن کے پہراوے میں ان کا رنگ زیادہ نکھر جاتا ہے -
ادب کی روشنی میں ہم روز مرہ کی چیز کو بالکل نئی شکل میں دیکھتے
ہیں اس لیے یہی روز مرہ کی چیزیں ہمارے سامنے حیرت انگیز جدت
کے ساتھ جلوہ فروز ہوتی ہیں —

جب انسان کی عقل میں فتور پیدا ہو جاتا ہے تب وہ حسن کو اُس
کے دایرے سے الگ کرکے اس کے برعکس کاموں میں لگایا کرتا ہے - اس
صورت میں حسن کی بھی یہی حالت ہوجاتی ہے جو جسم سے الگ ہوکر
سرکی - اگر ہم حسن کو معمولی چیزوں سے الگ کرلیں تو گویا ہم اُسے
اُن چیزوں کے خلاف لا کھڑا کرتے ہیں - اُسے ہم حقیقت کا دشمن بنا کر اپنے
ل میں معمولی چیزوں کی طرف سے ایک قسم کی نفرت پیدا کرلیتے

ہیں - تب وہ حسن اپنی اصلیت کو بھول جاتا ہے - خواہ مذہب ہو، خواہ حسن ہو، خواہ اور کوئی بڑی چیز ہو جب ہم انہیں محدود کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو ان کی اصلیت برباد ہوجاتی ہے - ندی کو اپنا بنانے کے لیے اگر ہم اس کے چاروں طرف بند باندھ ڈالیں تو وہ ندی نہیں رہتی، تالاب بن کر رہ جاتی ہے —

اسی طرح دنیا میں بہت سے لوگوں نے حسن کو محدود کر کے اسے عیش و نشاط، پندار اور حظ نفس کی چیز بنا ڈالا ہے - اسی لیے کئی مذہبی فرقے حسن کو ایک خطرناک چیز خیال کرتے ہیں - وہ کہتے ہیں کہ حسن کی سونے کی لنکا صرف خطرے میں ڈالنے کے لیے ہے —

لیکن خدا کے فضل سے خطرہ کس جگہ نہیں ہے - آگ، ہوا، پانی یا مٹی کا کوئی ذرہ خطرے سے خالی نہیں - یہ آفت ہی ہمیں ہر ایک چیز کی اصلی شکل سے واقف کرا کے اس کا ٹھیک استعمال سکھلا دیتی ہے —

اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ پانی، زمین، آگ اور ہوا کے ذریعے ہماری اتنی ضروریات پوری ہوتی ہیں کہ اُن کی غیر موجودگی میں ہم ایک لمحہ بھی زندہ نہیں رہ سکتے اس لیے ان تمام آفتوں کو جھیل کر بھی اُن کا اچھی طرح سے علم حاصل کرنا پڑتا ہے - لیکن حسن سے لطف اندوز ہونا ہمارے لیے بہت ضروری نہیں ہے - اس لیے کہ وہ تو صرف ایک مصیبت ہے - اس کا مقصد یہی معلوم ہوتا ہے کہ خدا ہمارے دلوں کا امتحان لینے کے لیے ہمیں حسن کا ایک سبز باغ دکھا رہا ہے - اس کے لالچ میں پڑکر اگر ہم بے خبر ہو جائیں گے تو ہماری زندگی برباد ہو جائے گی —

خدا ممتحن ہے اور دنیا ایک آزمائش گاہ ہے - یہ تمام چھوٹی اور

خوفزدہ کرنے والی باتیں اب ناقابل برداشت ہیں - اپنی نقلی یونیورسٹیوں کے ساتھ خدا کی سچی یونیورسٹیوں کا مقابلہ مت کرو - خدا کی یونیورسٹی میں نہ تو امتحان ہوتا ہے اور نہ امتحان کی کوئی ضرورت ہے س یونیورسٹی میں صرف تعلیم ہی دی جاتی ہے ' یہاں صرف نشو و نما ہی ہوتی ہے - اسی وجہ سے انسان کے دل میں احساس حسن کی زبردست خواہش ہے ' اسی کے ذریعے ہماری نشو و نما ہوتی ہے - آفتیں آتی ہیں تو آنے دو لیکن اُن کے سبب سے اگر ہم ترقی کا راستہ چھوڑ دیں گے تو ہمارا بھلا نہیں ہوگا —

یہ ہم پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ نشو و نما کے کیا معنی ہیں - جماعت کے ساتھ فرد کے تعلقات جتنے گہرے ہوتے ہیں اسی قدر ہر ایک کی نشو و نما ہوتی ہے - بہشت کے راجا اندر نے اسی ریاضت کے حصول کی غرض سے حسن کو انسانی دنیا میں بھیجا ہے - اگر یہ سچ ہے تو یہ ماننا ہی پڑے گا کہ راجا اندر کی اس دھوکے کی ٹٹی کو دور ہی سے سلام کر کے آنکھیں بند کرلینا مناسب ہے —

لیکن راجا اندر کی طرف سے ہمارے دل میں اس قسم کی ذرا سی بھی بدگمانی نہیں ہے - ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس کے ہر ایک پیغام بر کو نکال باہر کرنا چاہیے - ہم اتنا یقیناً جانتے ہیں کہ حقیقت کے ساتھ گہرا اور غیر منقطع میل کرانے کے لیے ہی احساس حسن ہمارے دل میں جاگزین ہوا ہے - اور یہ اتحاد بالکل بے غرضانہ ہے - یہ محض سکھ کا ملاپ ہے - نیلا آسمان جب ہمارے دل کو متاثر کرکے ہری بھری زمین پر اپنی روشنی کی چادر پھیلا دیتا ہے تو ہم کہہ اٹھتے ہیں کہ کیا اچھا سماں ہے - بسنت میں درختوں کے نئے اور نازک پتے بن کی دیوی کی

انگلیوں کی طرح جب بلا ارادہ ہماری نظروں کو اشارے سے اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں تب ہی ہمارے دل میں حسن کا احساس جاگ اٹھتا ہے —

لیکن اب غور طلب بات یہ ہے کہ کیا احساس حسن ہمارے دل کو صرف حسن کی حقیقت کے ایک ہی حصے کی طرف مائل کرتا ہے اور باقی حصوں کی طرف سے ہٹا دیتا ہے؟ نہیں ایسا نہیں۔ حسن کے متعلق اس طرح کا خیال درست نہیں —

کیا ہماری قوت علم نے دنیا کی تمام حقیقت کا ابھی احاطہ کرلیا ہے؟ کیا ہماری قوت عمل نے دنیا کی تمام طاقت پر آج ہی قبضہ کرلیا ہے؟ ہم دنیا کے ایک عشرعشیر کو جانتے ہیں اس کے بڑے حصے سے بے خبر ہیں۔ قوت عالم کا ایک معمولی حصہ ہمارے کاموں میں لگا ہوا ہے۔ ابھی ہم اس کے بڑے حصے سے کام لینے کے قابل نہیں ہوے۔ پھر بھی ہمارا علم اس دنیاے معلوم اور غیر معلوم کے امتیاز کو کچھ نہ کچھ کم کرتا جا رہا ہے۔ دلائل کا جال پھیلا کر دنیا کی تمام حقیقت کو رفتہ رفتہ ہماری عقل کے تحت لا رہا ہے اور دنیا کو ہمارے دل کی دنیا اور ہمارے علم کی دنیا بنا رہا ہے۔ ہماری قوت عمل دنیا کی تمام قوت کو استعمال کے ذریعے آہستہ آہستہ اپنا رہی ہے اور بجلی، پانی، آگ، ہوا روزانہ ہمارے معاون اور مددگار بنتے چلے جا رہے ہیں۔ ہمارا احساس حسن بھی آہستہ آہستہ تمام دنیا کو ہماری مسرت کی دنیا بناتا جا رہا ہے۔ اس کی حرکت بھی اسی طرف ہے۔ علم کے ذریعے ہمارا دل تمام دنیا میں پھیل جاے گا، عمل کے ذریعے ہماری قوت تمام دنیا میں وسعت حاصل کرلے گی اور احساس حسن کے ذریعے ہماری مسرت تمام دنیا میں ساری ہوجاے گی۔ انسانیت کا یہی مقصد ہے۔ یعنی دنیا کو علم، قوت اور

مسرت کی شکل میں حاصل کرنا ہی انسانیت کی تعریف ہے —

لیکن حاصل شدہ اور غیر حاصل شدہ چیزوں کے تصادم کے بغیر کچھہ حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ مقابلے کے بغیر ترقی نہیں ہو سکتی۔ تخلیق کا ازل سے یہی قانون ہے۔ ایک سے دو ہونا اور دو سے ایک ہو جانا ہی ترقی ہے —

سائنس کی رو سے اب ہم اس پر غور کرتے ہیں - انسان کی ایک دن ایسی حالت تھی کہ وہ درخت، پتھر، انسان، بادل، چاند، سورج، ندی، پہاڑ، جاندار اور بے جان میں کوئی فرق نہیں کر سکتا تھا - اس وقت گویا یہ سب چیزیں اس کے نزدیک مساوی تھیں۔ رفتہ رفتہ اس کی قوت مدرکہ میں جان دار اور بے جان، حساس اور غیر حساس کا فرق محسوس ہونے لگا - اس طرح پہلے پہل ایک ہی قسم کی چیزوں میں فرق پیدا ہوا - اگر ایسا نہ ہوتا تو انسان روح کی اصلی تعریف سے کبھی واقف نہ ہو سکتا - ادھر وہ جس تعریف کو جس قدر اصلی شکل میں جاننے لگا - اُسی قدر فرق معدوم ہونے لگا - پہلے حیوانات اور نباتات کی درمیانی کڑی معلوم نہ تھی - نباتات کی انتہا اور حیوانات کی ابتدا کے متعلق صحیح علم حاصل نہ ہوسکا - اس کے بعد آج ہم جن جمادات کو غیر حساس خیال کرکے مطمئن ہیں سائنس کے ذریعے اُن میں بھی زندگی کی موجودگی دریافت کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے - اس لیے جس قوت امتیاز کی مدد سے ہم نے روح کو پہچانا ہے اُسی کی ترقی کے ساتھہ ساتھہ یہ امتیاز آہستہ آہستہ معدوم ہوتا جائے گا - غیر امتیازی سے امتیاز اور امتیاز سے پھر یکتائی نمایاں ہوگی اور آخر میں سائنس ایک دن اُپنشدوں کے رشیوں سے ہم آواز ہو کر کہے گا

"روح سب میں متحرک ہے" —

یہ بات بھی اپنشد نے کہی ہے کہ جس طرح ہر ایک چیز میں روح ہے اسی طرح ہر ایک چیز میں مسرت ہے - دنیا کی اس غیر محدود مسرت کو دیکھنے کے لیے حسین اور غیر حسین کا امتیاز پہلے پہل نمایاں ہوتا ہے - ورنہ حسین کی شناخت ناممکن ہو جاتی ہے --

پہلے پہل جب حسن کا احساس ہوتا ہے تب حسن کا امتیاز ہمارے احساس حسن کو بیدار کرتا ہے - اس کے لیے اس کی ضد ہی اس کا ہتھیار ہوتا ہے - رنگ کی چھب اور اعضا کا تناسب خود کو اپنے ماحول کی پژمردگی میں سے نمایاں کر کے صلائے عام دیتا ہے - موسیقی اپنی بلند آہنگی سے آسمان کو موہ لینے کی کوشش کرتی ہے - آخر کار احساس حسن جس قدر بلند ہوتا جاتا ہے اسی قدر آزادی کے بجائے نظم' زور و جبر کے بجائے قدرتی کشش اور ضبط کے بجائے ربط سے ہمیں مسرت حاصل ہوتی ہے - اس طرح ہم پہلے حسن کو گرد و پیش کی چیزوں سے الگ کر کے جاننے کی کوشش کرتے ہیں - اس کے بعد حسن کو اطراف کی تمام چیزوں سے ملا کر ان سبھی کو حسین کہہ کر پہچان سکتے ہیں —

کسی پوری چیز میں سے تھوڑا سا الگ کرکے دیکھنے میں ہمیں بے قاعدگی نظر آتی ہے اور ماحول کے ساتھ اجتماعی حیثیت سے ملا کر دیکھنے میں ہمیں باقاعدگی کا احساس ہوتا ہے - خواہ دھواں آسمان پر چڑھ جائے اور ڈھیلا مٹی میں گر پڑے - سولا (ایک قسم کی ہلکی لکڑی جس سے ہیٹ بنتے ہیں) پانی میں تیرے اور لوہا پانی میں ڈوب جائے تو بھی ان تمام متضاد شکلوں میں ہم قانون کشش کے ایک ہی سلسلے کو ہر جگہ دیکھتے ہیں —

جس طرح علم کی غلطی کو درست کرنے کا یہ طریقہ ہے اسی طرح اگر ہم مسرت کو بھی صحیح طور پر جاننا چاہیں تو ہمیں اسے اجزا سے الگ کرکے کل سے

ملانا پڑے گا - جس طرح سامنے کی چیز جیسی نظر آے ویسی ہی مان لینے میں سائنس کی رو سے غلط ثابت ہوتی ہے - اس طرح سامنے کی جو چیز ہمیں مبہوت بنادیتی ہے اسی کو حسین مان لینے سے مسرت کی تکمیل نہیں ہوتی - جس طرح ہمیں اپنے مشاہدے کی سچائی کا علم اس وقت ہوتا ہے جب کہ ہم اسے ہر پہلو سے جانچ لیتے ہیں اسی طرح ہم اپنے محسوسات کو اسی وقت باعث مسرت کہہ سکتے ہیں جب وہ دنیا کی سب چیزوں کے ساتھہ ہر طرف سے میل کھاے - ایک شرابی شراب پی کر خواہ کتنا ہی مسرور کیوں نہ ہو لیکن اس کی مسرت کا رد مختلف پہلوؤں سے ہوسکتا ہے - اس کا اپنا سکھہ دوسرے کا دکھہ ہوتا ہے - آج کا سکھہ کل کا دکھہ ہوتا ہے اور اس کی فطرت کے ایک حصے کی خوشی دوسرے حصے کے لیے باعث غم ہوتی ہے - اس لیے اس سکھہ کے ذریعے حسن برباد ہوتا ہے اور مسرت غائب ہوجاتی ہے - قدرت کی کامل حقیقت کے ساتھہ اس کا میل نہیں ہوتا —

طرح طرح کی متضاد چیزوں اور سکھہ دکھہ کے ذریعے انسان حسن اور مسرت کو حقیقت کے چاروں طرف پھیلا کر بڑی شکل میں جاننے کی کوشش کر رہا ہے - اس کا یہ علم کہاں جمع ہو رہا ہے؟ دنیا کے واقعات کے متعلق انسان کا علم ہمیشہ سے بہت سے انسانوں کے ذریعے حافظے میں محفوظ ہوکر سائنس کو مالامال کر رہا ہے - ایک انسان کے علم کو دوسرے انسان کے علم کے ساتھہ، ایک زمانے کے علم کو دوسرے زمانے کے علم کے ساتھہ پرکھہ لینے میں سہولت ہوتی ہے - اگر ایسا نہ ہو تو سائنس کبھی ترقی نہیں کرسکتا - اسی طرح انسان کا حسن اور مسرت کا علم ہر ایک ملک اور زمانے کے ادب میں جمع ہورہا ہے - حقیقت پر انسان کے دل

کا قبضہ کس ذریعے سے کس طرح بڑھتا جاتا ہے — احساس مسرت کس طرح جمعیت احساس سے بالاتر ہوکر انسان کے دل، دماغ اور اخلاقیات پر قبضہ کرتا جارہا ہے، اور اس طرح چھوٹے کو بڑا اور دکھ کو بھی سکھ بنارہا ہے، انسان اپنے ادب میں اسی راستے کے مسلسل نشانات چھوڑتا چلا جاتا ہے - جو ادبیات عالم کے پڑھنے والے ہیں وہ ادبیات میں اسی شاہ راہ پر چل کر، جمعیت کی خواہش اور تمنا کو سمجھ کر اور یہ سمجھ کر کہ حقیقت کس طرح انسان کے نزدیک بہبودی اور مسرت کی شکل میں نمایاں ہوتی ہے، کامیابی کے زینوں پر چڑھتے ہیں —

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ انسان کا علم اس بات سے نہیں معلوم ہوتا کہ وہ کیا جانتا ہے بلکہ اس بات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس چیز سے خوش ہوتا ہے - انسان کا علم ہمارے لیے حیرت پیدا کرتا ہے- جب ہم دیکھتے ہیں کہ کسی نے حق کی خاطر جلا وطنی کی سزا منظور کرلی ہے تب اس بہادر آدمی کا معیار مسرت ہمارے سامنے نمایاں ہوجاتا ہے - ہم دیکھتے ہیں کہ اس مسرت نے اتنی وسیع جگہ پر قبضہ کرلیا ہے کہ جلا وطنی کے رنج کی تکلیف قدرتاً ہی اس کا ایک جز بن گئی ہے - اس تکلیف ہی سے مسرت کی عظمت ثابت ہوتی ہے - جن کی مسرت صرف دولت ہی میں محدود ہے وہ مالی نقصان کے ڈر سے جھوٹ اور بے عزتی کو منظور کرلیتے ہیں - وہ اپنی نوکری کے لیے بے انصافی کرنے میں بھی نہیں جھجکتے، وہ خواہ کتنے ہی امتحانات کیوں نہ پاس کرلیں، خواہ کتنے ہی عالم کیوں نہ بن جائیں، ان کی حقیقت کا پتا اس سے چلتا ہے کہ وہ کن سطحی چیزوں سے شادماں ہوتے ہیں- مہاتما بدھ کی مسرت کا دائرہ کس قدر وسیع تھا کہ حکومت کے عیش کی مسرت بھی

انھیں نہ روک سکی - جب ایک انسان انسانی مسرت کے دائرے کی وسعت کو دیکھتا ہے تب گویا وہ اپنی پوشیدہ دولت کا امانت دار دوسروں کو سمجھنے لگتا ہے اور اپنی ہی شکل کو چار سو دیکھتا ہے - اس طرح کی عظیم الشان زندگیوں میں اگر ہم مسرت محسوس کریں تو ہم خود کو پہچان سکتے ہیں —

اس لیے انسان اپنی مسرت کی نمائش کے ذریعے ادبیات میں صرف اپنی ہی دوامی اور بہترین شکل کو نمایاں کیا کرتا ہے —

ہم جانتے ہیں کہ ادبیات میں سے چھوٹے چھوٹے حوالوں کو لے کر ہماری موٹی سی بات کی دھجیاں اُڑا دینا بہت آسان ہے - ادبیات میں جس چیز کو جگہہ ملی ہے اگر اس کی تمام تر ذمہ داری ہمارے سر ڈال دی جاے تو یہ ہمارے لیے کچھہ کم مصیبت نہیں ہے - لیکن انسان کے تمام بڑے بڑے کاموں میں سیکڑوں باتیں ایسے پائی جاتی ہیں جو اسی کی راے کی نقیض ہوتی ہیں - جب ہم یہ کہتے ہیں کہ جاپانیوں نے بے باکی اور دلیری سے جنگ کی تھی تب اگر ہم جاپانی فوج کے ہر شخص کی دلیری کا محاسبہ کریں تو ہمیں بہت سی کمزوریاں مل جائیں گی - لیکن یہ بات سچ ہے کہ جاپانی ان تمام کمزوریوں کو اپنی بہادری میں جذب کرکے قائم ہوے تھے - ادبیات میں انسان اپنے آپ کو بڑی شکل میں نمایاں کرتا ہے وہ رفتہ رفتہ اپنی مسرت کو جز سے کل کی طرف اور چھوٹے سے بڑے کی طرف آگے بڑھا کر ظاہر کرتا ہے - اگر ہم اس بات کو بڑی شکل میں دیکھیں تو ہم پر اس کی حقیقت واضح ہوتی ہے - عیب اور کمزوریاں خواہ کتنی ہی کیوں نہ ہوں تب بھی کامل طور سے دیکھنے پر اس کی حقیقت ثابت ہوتی ہے —

ہمیں ایک اور بات کا خیال رکھنا پڑے گا - ادبیات کے ذریعے ہم دو طرح سے مسرت حاصل کرتے ہیں - ایک تو ادب ہمیں حقیقت کو دلفریب شکل میں دکھاتا ہے دوسرے وہ ہمیں حقیقت کا روبرو درشن کراتا ہے - حقیقت کا درشن کرانا بہت مشکل کام ہے - ہمالیہ کی چوٹی کتنے ہزار فٹ اونچی ہے ' اُس پر کتنی برف گرتی ہے ' اس کے کس حصے میں کس قسم کی نباتات پیدا ہوتی ہے ' یہ باتیں اگر ہمیں تفصیل سے بھی بتائی جائیں تو بھی ہمالیہ کا درشن نہیں ہوتا - جو چند فقروں ہی میں ہمیں ہمالیہ کا درشن کرا سکتے ہیں انہیں ہم شاعر کہتے ہیں - ہمالیہ ہی کو کیوں اگر ایک چھوٹے سے تالاب ہی کو ہمارے دل کی آنکھوں کے سامنے پیش کردیا جائے تو ہمیں بڑی خوشی ہوتی ہے - ہم نے اپنی آنکھوں سے بہت سے تالاب دیکھے ہیں لیکن اگر ہم انہیں زبان کے ذریعے دیکھیں تو ہم انہیں ایک نئی شکل میں دیکھتے ہیں - دل جس چیز کو آنکھوں سے دیکھتا ہے زبان اگر شعور بن کر اُسے دکھا سکے تو اس سے دل ایک نیا رس حاصل کرتا ہے - اس طرح ادب ایک نئے شعور کی شکل حاصل کرکے دنیا کو ہمیں ایک نئی شکل میں دکھاتا ہے - صرف نئی شکل ہی میں نہیں ' زبان کی ایک اور خاصیت بھی ہے ' وہ انسان کی اپنی ملک ہے — وہ بہت کچھہ ہمارے تخیل کی ایجاد ہے — اس لیے باہر کی جس کسی چیز کو بھی وہ ہمارے پاس لاتی ہے اسے خاص طور پر انسان کی اپنی چیز بنادیتی ہے - زبان جو تصویر کھینچتی ہے وہ ہمارے نزدیک صرف اسی لیے عزت حاصل نہیں کرتی کہ وہ بالکل ٹھیک تصویر ہے بلکہ اس لیے کہ گویا زبان نے اس میں انسانی جذبات کا اظہار کیا ہے - یہی وجہ ہے کہ وہ تصویر ہمارے دل میں ایک خاص یگانگت حاصل

کرلیتی ہے - اگر ہم زبان کے ذریعے تمام دنیا کو انسان میں متحرک کردیں تو وہ ہمارے بہت نزدیک آجاتی ہے —

یہی نہیں بلکہ زبان کے ذریعے جو تصویر ہمارے سامنے آتی ہے وہ اپنے تمام عیوب اور کمزوریوں کے ساتھہ نہیں آتی - وہ صرف اتنی ہی آتی ہے جتنے میں وہ ایک خاص تکمیل کو حاصل کرلیتی ہے - اس لیے ہم اسے ایک مکمل رس کے ساتھہ دیکھتے ہیں - کسی غیر ضروری زیادتی کی وجہ سے رس میں کمی نہیں ہوتی - اسی مکمل رس کے ذریعے دیکھنے سے وہ تصویر ہمیں اس قدر بڑی نظر آتی ہے —

" کوی کنکن - چنڈی " میں " بھانڈودت " کا جو کردار بنایا گیا ہے اس کردار میں یہ بات نہیں ہے کہ انسانی کیریکٹر کا ایک زبردست پہلو دکھایا گیا ہے بلکہ اس طرح کے بہت سے چال باز، خود غرض اور لیڈر بازوں کو ہم نے دیکھا ہے - ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ ان سے ہمیں کسی طرح کی مسرت حاصل ہوتی ہے - لیکن " کوی کنکن " اس قسم کے انسانوں کو ہمارے سامنے ایک خاص وجہ سے پیش کرتا ہے - زبان کے حیرت انگیز رس میں وہ اس طرح مشکل ہو گیا ہے کہ وہ صرف " کال کیتو " کے دربار ہی میں نہیں بلکہ اس نے ہمارے دل کے دربار میں بھی آسانی سے جگہ حاصل کرلی ہے - روزمرہ کی زندگی میں " بھانڈودت " ہمیں اس طرح دکھائی نہ دیتا - ہمارے دل کے نزدیک آسانی سے قابل برداشت بنانے کے لیے شاعر نے " بھانڈودت " کو ضرورت سے زیادہ بڑی شکل میں پیش نہیں کیا ہے - لیکن روزمرہ کی زندگی میں نظر آنے والا " بھانڈودت " بالکل ایسا نہیں ہے اس لیے وہ ہمیں اس طرح دکھائی نہیں دیتا - وہ ہمیں کسی حصے میں کامل طور پر دکھائی نہیں دیتا اس لیے ہمیں اس سے کوئی خاص مسرت

حاصل نہیں ہوتی۔ " کوی کلکن - چلڈی " میں " بھانڈودت " اپنی تمام غیر ضروری زیادتی کو چھوڑ کر ایک ھی کامل رس کی شکل میں ھمارے سامنے نمایاں ہوا ھے —

اوپر جس طرح ہم نے " بھانڈودت " کے بارے میں کہا ھے اس طرح تمام کرداروں کے متعلق کہا جا سکتا ھے - رامائن کا رام صرف بڑے ہونے کی وجہ سے ھمیں مسرت دیتا ھے یہ بات نہیں بلکہ وہ ھمارے سامنے اس طرح نمایاں کیا گیا ھے کہ اُسے ہم اچھی طرح سمجھہ سکتے ھیں' یہ بھی اس کا ایک سبب ھے۔ رام جتنا کامل ھمیں اس میں نظر آتا — غیر ضروری باتوں کو الگ کر کے رامائن صرف اتنے ھی رام کی شکل ھمیں دکھاتی ھے - اسی سبب سے ہم اُسے اتنا صاف دیکھتے ھیں اور صاف دیکھنے ھی میں انسان کو ایک خاص مسرت حاصل ہوتی ھے۔ صاف طور پر دیکھنے کا مطلب یہی ھے کہ کسی چیز کو پوری طرح دیکھا جائے - گویا اُس کی اندرونی روح کا مشاھدہ کیا جائے - اس طرح ادب مناسبت کی یکسانیت میں کامل تصویر کو پیش کرتا ھے جس سے ھمیں مسرت حاصل ہوتی ھے۔ یہی یکسانیت حسن ھے —

ایک بات اور قابل غور ھے - ادبیات کا ایک بہت بڑا حصہ اس کے تعمیری اسباب کا محکمہ ھے۔ محکمہ تعمیرات میں صرف عمارت ھی بنتی ھے یہ بات نہیں ھے بلکہ وھاں اینٹوں کی بھٹی بھی تیار کرائی جاتی ھے۔ اینٹیں عمارت نہیں ھے یہ کہہ کر ناواقف لوگ اس بات کی ھنسی اڑا سکتے ھیں لیکن تعمیرات کا محکمہ اس کی قیمت جانتا ھے - ادبیات کی سلطنت میں ادبیات کے ذرائع کی قیمت کم نہیں ھے۔ اسی وجہ سے اکثر زبان کا حسن اور تخلیق کا کمال ادبیات میں قدر حاصل کرتا ھے —

انسان اپنے دلی جذبات کو نمایاں کرنے کے لیے کس قدر بے چین ھے

یہ ناقابل بیان ہے۔ دل کا یہ مسلک ہے کہ اگر وہ اپنے جذبے کو دوسروں کا جذبہ بنا سکے تب ہی وہ زندہ رہ سکتا ہے۔ یہ کام بہت مشکل ہے۔ اسی وجہ سے اس کی بے چینی بھی بہت زیادہ ہے۔ اسی لیے جب ہم دیکھتے ہیں کہ کسی نے کوئی بات کہنے میں جادو بیانی سے کام لیا ہے تو ہمیں بہت زیادہ مسرت ہوتی ہے۔ نمایاں کرنے کی رکاوٹوں کا دور ہونا بھی ہمارے لیے ایک گراں قیمت کام معلوم ہوتا ہے۔ اس سے ہماری قوت بڑھ جاتی ہے۔ جو بات نمایاں ہوتی ہے اگر وہ بہت عمدہ نہ بھی ہو تب بھی اگر اس کے نمایاں کرنے کے طریقے میں کوئی غیر معمولی چیز ہو تو انسان اُسے بڑی عزت کے ساتھ محفوظ کر لیتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ معمولی مضامین کا سہارا لے کر صرف اظہار کرنے کے شوق ہی سے نمایاں کی ہوئی تخلیق بھی ادبیات میں قدر کی نگاہوں سے دیکھی گئی ہے۔ یہ بات نہیں ہے کہ ان کے ذریعے انسان صرف اپنی قوت کو نمایاں کرکے دوسروں کو مسرت بخشتا ہے بلکہ کسی وسیلے سے صرف اپنی قوت اظہار کے ساتھ دل بہلائی کرنے میں اُسے جو مسرت حاصل ہوتی ہے وہ ہمارے اندر ایک بڑی مسرت کی تحریک کر دیتی ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ کوئی انسان کسی کٹھن کام کو آسانی سے کر رہا ہے تو ہمیں مسرت ہوتی ہے۔ لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ بغیر کسی مطلب کے کوئی انسان کسی معمولی شے کے سہارے اپنے پورے جسم کو صفائی سے حرکت دے رہا ہے تب اُس معمولی چیز کی حرکت میں اُس شخص کی پھرتی، مہلت اور حوصلہ نمایاں ہوتا ہے جس سے ہماری روح تڑپ اُٹھتی ہے اور ہم خوش ہو جاتے ہیں۔ ادبیات میں بھی دل کی قوت اظہار کے بلا مقصد متحرک ہونے کی خواہش نے خاطر خواہ جگہ حاصل کر لی ہے۔

ت، ان تھک محنت میں خود کو نمایاں کرتی ہے - اور صحت صرف
ت کی شکل میں بھی بلا ضرورت خود کو نمایاں کیا کرتی ہے- اسی طرح
یہ بات نہیں ہے کہ انسان ادبیات میں اپنے جذبات کی اکثریت ہی کو
نمایاں کیا کرتا ہے بلکہ وہ اپنی قوت اظہار کو بھی نمایاں کرکے خوش
ہوا کرتا ہے کیوں کہ نمود ہی مسرت ہے - اسی لیے "اُپنشد" کہتا ہے
"آنند روپم امرتم ید وبھاتی" جو کچھ نمایاں ہورہا ہے وہ اُسی ہستی
کی مسرت اور بقا کی شکل ہے- ادبیات میں بھی انسان کتنے ہی عجیب و
غریب طریقوں سے اپنی مسرت اور بقا کو نمایاں کر رہا ہے، یہی ہمارے
سمجھنے کی بات ہے —

بادۂ کہن

گلدستۂ رنگین

(یہ مثنوی سعادت یار خاں رنگین کی تصنیف ہے جو اس نے اہلی شیرازی کی مثنوی کے جواب میں لکھی ہے - اس کے ہر مصرع کے قافیے یا ردیف میں صنعت تجنیس سے کام لیا ہے - چونکہ دونوں جگہ الفاظ صورت اور تلفظ میں یکساں ہیں اس لیے ہر لفظ کے نیچے معنی بھی لکھہ دیے ہیں تاکہ سمجھنے میں آسانی ہو) —

ادیٹر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حمد اوسے کہیے جو کہ ہے جاں آفریں — تا کہیں سب تجھکو اے جاں آفریں
(یعنی خدا) — (اے شخص تحسیں)

آوے پھر جس وقت باری نعت کی — نظم ہو مقبول باری نعت کی
(نوبت) — (خدا)

ہے محمد وہ کہ جس کا آستاں — جانتے ہیں قبلہ سارے رستاں
(دہلیز) — (راستباز)

اوس کے رنگ و بو کے آگے ہے گلاب — ہے عرق سے اوس کے شرمندہ گلاب
(پھول) — (گل آب)

تحفہ تو اوس کو درود ارسال کر — دمبدم ہر روز ماہ و سال کر
(بھیج) — (برس)

مدح کہنے میں نہ ہو لاچار یار — تو مدد کو اپنی اب لا چار یار
(مجبور) — (چہار اصحاب)

جس قدر اصحاب ہیں اوس کے تمام — اون میں جو کم ہے وہ ہے مرد تمام
(سب) — (کامل)

کام رکھہ اوس سے اور اوس کی آل سے — تا تیرا مونہہ سرخ ہو خوب آل سے
(دختر و نبیرہ) — (نام رنگ)

آگے تو حیرت میں کیوں بیٹھا ہے سن — کام کی ایک بات ہے وہ مجھہ سے سن
خموش — بشنو

ہے شریعت کی عجب یہ شاہراہ — چل اوسی رستے پہ تو اے شاہ راہ
راہ کشادہ — بادشاہ

کر نہ کوشش خلق کے تاراج میں — کچھہ نہ ہو خطرہ تیرے تاراج میں
لوٹ — سلطنت

اس طرف سے اپنی رکھہ خاطر نشاں — ہے کئی دن کا یہ سب نام و نشاں
خاطر جمع — پتا

ہے یہی خواہش تیری ہر صبح و شام — یعنی ہو ملک عراق و مصر و شام
پگاہ — نام ملک

کیا کرے گا لے کے روم و زنگ کو — دور کر اس اپنے دل کے زنگ کو
نام ملک — زنگار

شرم کر اے شاہ سر کی تاج کی — داد کیوں دیتا نہیں محتاج کی
کلاہ — غریب

ہیں یہ بلبل کے چمن میں پر پڑے — یہ وبال اب دیکھیے کس پر پڑے
بال — برکدام کس

پاس تیرے گرچہ شام و روم ہے — پر تو فعل نیک سے محروم ہے
نام ملک — بے نصیب

سن میرے فرزند اے نواب یار — ہیں تیرے سب خان اور نواب یار
نور چشم — سردار

جانتا دنیا کو ہے خواب و خیال — تو نہ سن نواب تہہ اور خیال
وہم — نام راگ

اس نجس دنیا پہ تو مت لائے جی — تاکہ خوب اس سے تیرا متلائے جی
نہ لا — قے آئے

زال دنیا سخت مردم خوار ہے — مملکت جو اس سے ہے وہ خوار ہے
خورندہ — خراب

اس عروس دھر پر تو دم نہ دے — مجھکو یہ ڈر ہے تجھے یہ دم نہ دے
جان — فریب

دولت اس دنیا کی خالق سے نہ چاہ — کیونکہ راہ دیں میں یہ دولت ہے چاہ
نہ مانگ — کنوا

جو ہے کرنا آج اوس کو کل نہ کر — سر کو میرے مت پھرا کل کل نہ کر
فردا — جنگ

خلق خالق نے کیا گو خوب رو — پر توان فعلوں پر اپنے خوب رو
خوبصورت — خوب گریہ کن

سر کو آرایش نہ دے دستار سے　　ہوگی کیا ذلت تیری دستار سے
پگڑی　　ا تار

کان میں گر تیرے بالا ہوے گا　　کیا تیرا بول اس میں بالا ہوے گا
ہالہ　　ناموری

کیا بنانا زلف کو ہے شانہ سے　　ہاتھہ کو ہونا جدا ہے شانہ سے
کنگھی　　کتف

دل کو دنیا کی طرف سے کر کڑا　　ہاتھہ سے دے پھینک سونے کا کڑا
سخت　　دستوانہ

آج اوتھا ملبوس سے ململ کے ہاتھہ　　ورنہ کل روے گا تو مل مل کے ہاتھہ
پارچہ　　مالیدہ

بنا تو زلف کے اس لام کو　　کر درست اپنے ذرا اسلام کو
تصویر　　دین

زخم عصیاں کے تو کر سینے کی فکر　　رکھہ نہ اس دوش و بر و سینے کی فکر
دوختہ

تجھہ سا دنیا میں اگر ناپید ہے　　آخرش ہونا تجھے ناپید ہے
نایاب　　نیست

جان مت پتلی کا تارا آپ کو　　ہر گھڑی تو دے اوتارا آپ کو
ستارہ　　فروتنی

قصد دل سے دور کر بیوپار کا　　وار مت رہ کر ارادہ پار کا
خرید و فروخت　　عبور دریا

ہے تو دنیا کے پھنسا جنجال میں　　کرلیا ہے اوس نے تجھہ کو جال میں
قصہ

ہے بگڑنا آخر اس اشکال کو　　جان مت آسان اس اشکال کو

مرشد کامل کا یہ ارشاد ہے　　وہاں نہیں ہوگا یہاں جو شاد ہے
حکم پیمبر　　خوش

حق کے واقف گر نہیں انعام سے　　تو تو بس بد تر ہے تو انعام سے
بخشش　　حیوان

سوچ جی میں نر ہے تو مادہ نہیں　　کار دیں پر کیوں تو آمادہ نہیں
عورت　　مستعد

نیکیوں کی بھر کے گاڑی بھیج دے　　اپنے چلنے سے اگاڑی بھیج دے
بہلی　　پیشتر

تجھہ کو لازم ہے کہ در عین شباب جوانی	جاری آنکھوں سے ترے روز و شب آب دن رات
چاہیے یوں آنکھہ ہر شب نم رہے رات	باغ میں نرگس پہ جوں شبنم رہے اوس
چشم سے ایسا رواں خونناب ہو خون جگر	چاہیے سب جسم کا خون آب ہو خون آب
تو جب اپنے دل کو گرمانے لگے گرم کرنے	اشک تب آنکھوں سے گرم آنے لگے آوے
کچھہ طلب تو حق سے بیزاری نہ کر بے گریہ	دیکھہ اپنے حق سے بیزاری نہ کر خفگی
دل ترا جب کشتۂ سیماب ہو پارا	آگے تیرے تب زر و سیم آب ہو چاندی پانی
کب تلک متھرا کے پیڑے کھاے گا نام شیرینی	موت کے آگے تھپیڑے کھاے گا طمانچہ
زہر میٹھا ہے ولے کھانا نہیں غذا	اوس کو میٹھا جان کر کھانا نہیں نخواہی خورد
گر تیری قسمت میں کھانی ہو نہ چاٹ خورش خوب	تو تو خالی اونگلیاں اپنی نہ چاٹ ملیس
پانوں ٹوٹا یا اوتر پہنچا گیا بند دست	رزق تو تیرا تجھے پہنچا گیا رسید
خلق کا بک بک کے بھیجا کھا نہ تو مغز	رزق رازق کا ہے بھیجا کھا نہ تو فرستادہ
تو جو ملگواتا یہ سر کا مول ہے سر کلا بقیمت	سو یہ سر کا تیرے سر کا مول ہے قیمت سر ست
پاس تیرے کو ملوں یاقوت ہو جواہر	کھاے گا وہ جو کہ تیرا قوت ہو خورش قسمت
گر نہ ہو قسمت میں کھانے فالسے نام میوہ	تو نہ کچھہ قرعہ سے ہو نہ فال سے فال نامہ
ہووے آتا یا کہ میدا یا روا قسم آرد	ہاتھہ سے تیرے ہے کھانا ناروا نا مناسب
پھر نہ اس کو پیٹ ہے متکا نہیں باسن	آنکھیں اپنی پھیر کر متکا نہیں پھرا
اس زمین دل میں کرکر کشت کھا زراعت	دہر کی شطرنج میں مت کشت کھا شہ

نفس سرکش کا تو اپنے کھینچ تنگ
زین بند
جہد کر طاعت میں ہرگز ہو نہ تنگ
عاجز

پہلے اوس کو پیٹھ کی دے مار تو
بھوکا رکھو
پھر اوسے سر پر اوٹھا دے مار تو
بر زمین زن

نفس سرکش کو تو اپنے کر نہ زیں
زیں مکن
کر عمل میرے کہے پر بعد ازیں
بعد

شعر تجھہ تک یہ نہیں پہنچا ہے کیا
مگر
سن سمجھہ کر مولوی کہتا ہے کیا
چہ چیز

خواجہ پندارد کہ روزی دہ دھد
قریۂ
ایں نمی داند کہ روزی دہ دھد
روزی دھندہ یعنی خدا

میکدہ میں صبح سے تا شام ہے
جب تجھے دیکھا تو بے آشام ہے
نوشندہ

کیا تو خوش ہوتا ہے پی کر جام کو
ساغر
سوچتا اس کے نہیں انجام کو
آخر

تاک میں بیٹھا ہے کیا انگور کی
درخت
زخم دل کے فکر کر انگور کی
کھورنڈ

کیا غضب ہے خو یہ تیری ہے مدام
ہمیشہ
جا کے میخانہ میں پیتا ہے مدام
شراب

بیٹھتا ہے روز میخانہ میں جم
جام مے کو جانتا ہے جام جم
نام بادشاہ

ہے جہاں کا باغ جیوں شاداب تاک
درخت
پاس مت جا دور سے تو اس کو تاک
بیبں

مجھہ سے سن رکھہ خاکساری خوب ہے
افتادگی
بات آدھی کیا ہے ساری خوب ہے
سب

پھینک دے تروار کو اور ڈھال کو
سپر
آخرش پانی بہے گا ڈھال کو
نشیب

غیر حق سب شے کو لے جا پھونک دے
بیر
نفس دشمن کا کلیجا پھونک دے
جگر

زیست تو لٹو کی سی یک آس ہے
پھرنا
تو ہی کہہ اس آس کی کیا آس ہے
امید

ڈالے پھر پھر چھالے تونے زیر پا
آبلہ
فرش تکیں اب بچھا لے زیر پا
فرش کن

تو خود اس رستے پہ بس چلتا نہیں
هرگز
اور یہ کہتا ہے بس چلتا نہیں
قابو

یہ جو بھائی ہیں تیرے فرزند و زن
عورت
دین کے تیرے یہ سب ہیں راہ زن
قزاق

کوئی تیرا دوست یہاں جانی نہیں
دلی
تونے مطلق بات یہ جانی نہیں
دانست

کون یہاں اب تیری غم خواری کرے
غم خوری
تب کہیں بھائی یہ غم خواری کرے
خرابی

پیٹ کر هاتھوں سے اپنا سر و رو
مونہہ
اپنی اس اوقات پر تو خوب رو
گریہ کن

فرض تجھہ سے ایک گر ہووے قضا
ترک
اس سے بہتر ہے تیری آوے قضا
مرگ

هے بندھا عصیاں سے تیرا بال بال
مو بمو
سر پر اپنے کب تلک لیگا وبال
گناہ

بحر عصیاں کا تیرے گرد آب هے
پانی
فی الحقیقت یہ جہاں گرداب هے
بھنور

آوے گر عصیاں کی جانب تیری دھن
خیال
تو تو توبہ کرکے سر اپنے کو دھن
پیٹ

خلق خالق نے کیا تجھہ کو بشر
آدم
کر بسر اوقات اپنی مت بشر
بہ شر

جب سمجھتا آپ کو تو خاک هے
پر سمجھہ تیری یہ کیا هے خاک هے
کیا هے

غم تجھے گر اپنے کچھہ سر کا نہیں
تو تلے سے تیغ کے سرکا نہیں
هٹا

حلق کے یہاں کیوں گلے کا هار هے
هار گلو
دیکھہ یہاں کی جیت وهاں کی هار هے
نقصان

جب تلک تجھہ کو نہ سودا ہووے گا
دیوانہ پن
تب تلک دل کا نہ سودا ہووے گا
بیع

هے تو خاک اور آسماں پر فرق هے
سر
کیا زمین و آسماں کا فرق هے
تفاوت

چاهیے جو بات تجھہ میں سو نہیں
وہ
جاگنا بہتر هے ناداں سو نہیں
مخواب

کر تو عادی آپ کو کم خواب سے   ہو نہ خوگر بالش کمخواب سے
سونے   پارچہ

تو جواں مرد ایسا کہلاتا ہے یار   نیند میں پھر کیوں تو کہلاتا ہے یار
مشہور ہستی   عاجز می شوی

جاگنے کی ہو اگر قدر اب تجھے   تو ہر یک شب ہو شب قدر اب تجھے
منزلت   لیلۃ القدر

موت کا تیری کمیں میں ہے پلنگ   جاگ ناداں چھوڑ سونے کا پلنگ
چیتا   چارپائی

سر سے اپنے دور کر نخوت کی بو   تخم نیکی مزرع دنیا میں بو
بو باس   بکار

خواہش ہر شے نہ کر تو زینہار   مانگ اس خواہش کی حق سے زینہار
ہرگز   پناہ

گر ہے مسند پر تیری تکیہ لگا   شکر کر بیٹھ اوس پہ تو تکیہ لگا
دھرا   زدہ

درد کے مارے کرا ہے تو کراہ   لیک نا شکری سے ظالم مت کراہ
آہ آہ کن   آہ مکن

بے تردد گر ملے تجھکو گزی   اور گزی ہو وہ کہ جو ہو سو گزی
پارچہ   فی روپیہ سو گز

تو بھی ململ سے نہ رکھ خاصے سے کام   کیا ہے تجھکو بد سے اور خاصے سے کام
پارچہ   اچھے

گر نہیں تجھہ پاس سونے کا پلنگ   تو زمیں کو جان سونے کا پلنگ
پلنگ خواب   پلنگ طلائی

گر میسر ہو نہ تجھکو چاندنی   تو ہے کافی چاند کی یہ چاندنی
فرش   مہتاب

پاس تیرے مشک یا کافور ہو   آخرش سب جائے گا کافور ہو
کپور   برباد

صبح سے لو شام تک گر ہو نہار   تو بھی کر تو شکر ہمت کو نہ ہار
گرسنہ   از دست مدہ

گر میسر تجھکو عطر و گل نہیں   پر چراغ دیں تو تیرا گل نہیں
پھول   بجھا

زخم دل کا آوے گر سینا تجھے   تو کہوں میں بو علی سینا تجھے
دوختن   نام حکیم

مونہہ سے مت گالی کسی کو ایک دو
یک ہم مدہ
کیونکہ دے بیٹھیگا وہ بھی ایک دو
چرا کہ یک دو او ہم خواہد داد

فعل ایسے ہیں بھرے اس چرخ میں
فلک
دیکھہ جن کو عقل آوے چرخ میں
گردش

فخر کیا ہے گر بنارس میں رہے
نام شہر
لطف تب ہے جب بنا رس میں رہے
در خوبی

غم نہ ماضی کا نہ فکر حال ہے
صیغہ
کیا کہوں میں طرفہ تیرا حال ہے
احوال

ہے دروں تیرا سیہ جیسے توا
تابہ
قلب زر ہے دل تیرا اس کو توا
گرم کروا

خواہ سرو اور خواہ جو ہے باغ میں
نہر
ہے خزاں سبکو یہ جو ہے باغ میں
پیدا است

جو کہ گلزار جہاں میں بس گیا
قیام کردہ
وہ یقیں ہے کار دیں سے بس گیا
بالکل

کیا کھڑا ہے بیچ میں لگ کر بدر
دروازہ
آ ادھر باہر سے تو ہو جا بدر
بیرون

بچ جہاں کے اس منقش مار سے
سانپ
تا بچے تو اس جہاں کی مار سے
زدوکوب

سوچ لے یہ جتنی موجودات ہے
کائنات
ایک دن اس سب کی موجودات ہے
حاضری

حال میں حیرت کا کہہ سکتا نہیں
گفتن نمی توانم
یہ مرض ہے عشق کا سکتا نہیں
بیماری

عشق کے مکتب کی بابت اور ہے
الف بے
تو سمجھتا ہے یہ بابت اور ہے
مقدمہ

گر تو علم عشق کا یک لے سبق
تعلیم
جاوے سارے عالموں سے لے سبق
سبقت

کوئی بازی عشق سے جیتا نہیں
بردہ
کس طرح جیتے کوئی جیتا نہیں
زندہ

سنگ ہے وہ دل نہ ہووے جس میں مہر
الفت
یہ فلک بے مہر ہے رکھتا ہے مہر
آفتاب

ختم کر اس مدعا پر لا کلام
باب کر
مولوی نے یوں لکھا ہے لا کلام
بے شبہ

چوں ازو گشتی همه چیز از تو گشت　　چوں ازو گشتی همه چیز ار تو گشت

میں تو ہوسکتا نہ تھا یوں نغمہ ساز　　ہے خدا ساز اب ہوا ہے یہ جو ساز

بجانے والا　　اتفاق

کچھ طبیعت جو میری لہرا گئی　　تو یکایک جی میں یہ لہر آگئی

امنگ　　خیال

صفحۂ کاغذ زر افشاں کر دیا　　اور زر معنی سے افشاں کر دیا

نظم یہ ذنکا بجا میں نے کہی　　بعد اہلی کے بجا میں نے کہی

نواختہ　　درست

مثنوی گلدستۂ رنگیں ہے یہ　　نظم رنگا رنگ سے رنگیں ہے یہ

تخلص

تبصرے

قواعد کلیۂ بہا کہا۔

(تصنیف میرزا خاں ابن فخرالدین محمد - مرتبۂ ایم - ضیاء الدین صاحب معلم فارسی کُلیۂ وشوا بھارتی نکیتان' بنگال) -

یہ کتاب تحفۃ الہند مصنفہ میرزا خاں ابن فخرالدین محمد کے مقدمے کا ایک حصہ ہے جو بالفاظ مصنف " دربیان مصطلحات حروف تہجۂ ہندیہ وعلم خط وذکر اشکال حروف مذکورہ از مفردات و مرکبات و بعضے قواعد کلیۂ بہا کہا " پر مشتمل ہے --

فاضل مرتب نے اصل مقدمۂ فارسی کے ساتھہ اس کا انگریزی ترجمہ بھی دے دیا ہے - نیز کتاب کے متعلق ایک عالمانہ مقدمہ تحریر کیا ہے - یہ کتاب اورنگ زیب کے عہد میں لکھی گئی - اورنگ زیب کی مدح تمام نسخوں میں یکساں پائی جاتی ہے لیکن ایک بات میں اختلاف پایا جاتا ہے - بعض نسخوں میں یہ ہے کہ یہ کتاب شاہزادہ محمد معزالدین جہاندار شاہ

کی سرپرستی میں "رفیع شاہ کوکلتاش خاں" کے اشارے سے لکھی گئی (میرے نسخے میں بھی یہی ہے) اور بعض میں بجاے جہاندار شاہ کے اعظم شاہ کا نام ہے۔ لائق مرتب نے اپنی تحقیق سے یہ ثابت کیا ہے کہ جہاندار شاہ اور کوکلتاش کے نام بعد میں داخل کردیے گئے ہیں، دراصل اس کے سرپرست اعظم شاہ ہیں جو بھاکا زبان اور بھاکا شاعری کے بڑے مربی تھے —

یہ کتاب ایک مقدمے، سات ابواب اور ایک خاتمے پر مشتمل ہے۔ مقدمے میں حروف اور قواعد بھاکا سے بحث کی گئی ہے۔ باقی ابواب کی تفصیل یہ ہے —

باب اول :- در علم پنگل یعنی علم عروض اهل هند —

باب دویم :- در علم تک یعنی علم قوافیء اهل هند —

باب سیوم :- در علم النکار یعنی علم بدیع و بیان اهل هند —

باب چهارم :- در علم سنگار رس یعنی علم عاشقی و معشوقی و بیان احوال عاشق و معشوق —

باب پنجم :- در علم سنگیت یعنی علم موسیقیء اهل هند وغیرہ —

باب ششم :- در علم کوک یعنی علم معرفت انسام زن و مرد و صحبت داشتن و معاشرت و مباشرت بازناں —

باب هفتم :- در علم سامدرک یعنی علم قیافه که علامات خیر و شر در انسان ازاں معلوم شود —

خاتمه :- در ذکر لغات و مصطلحات و کنایات اهل هند —

یہ کتاب اگرچہ سب کی سب نہایت دلچسپ، مفید اور تاریخی لحاظ سے بہت اہم ہے لیکن اس کا مقدمہ اور خاتمہ زبان کے متعلق کے

لیے بہت کار آمد اور بصیرت افروز ہے - رسالہ زیر تبصرہ مقدمے کا شعبۂ دوم ہے جس میں بھاکا کی کیفیت اور اس کے قواعد کا بیان ہے - قواعد کے بیان میں ہندی الفاظ کا صحیح تلفظ مصنف نے بڑی احتیاط اور تفصیل سے لکھا ہے -

بقول ڈاکٹر سنتی کمار چٹرجی کے (جنھوں نے اس رسالے پر دیباچہ لکھا ہے) یہ جدید انڈو ایرین زبان کی سب سے قدیم گریمر ہے - لیکن ڈاکٹر صاحب کا نیز فاضل مرتب کا یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ ہندی زبان کی یہ پہلی ڈکشنری ہے - اس سے بہت قبل پہلے آٹھویں صدی ہجری میں مولانا فضل الدین محمد بن قوام نے ایک کتاب بحرالفضائل فی منافع الافاضل تالیف کی جس کے آخری باب میں وہ الفاظ مع معانی دیے ہیں جو ہندی شاعری میں استعمال ہوتے ہیں -

---

سعیدی ڈکشنری -

(مرتبہ مولوی محمد منیر صاحب لکھنوی' مطبوعہ مطبع مجیدی کانپور - چھوٹی تقطیع' صفحات ۱۳۵۰) -

فاضل مولف نے اس لغت میں اردو زبان نیز فارسی عربی انگریزی وغیرہ کے ضروری الفاظ جو اردو میں مستعمل ہیں - بڑی محنت سے جمع کیے ہیں - اُردو کے مروجہ الفاظ اور محاورے تقریباً سب آگئے ہیں - لغت کی تحقیق سے بحث نہیں کی اور ایسی چھوٹی کتاب میں اس کی گنجائش بھی نہیں ہو سکتی' لیکن "حقہ" کو قلیان کے معنوں میں عربی لکھنا درست نہیں - دوسرے لغات کی طرح الفاظ کی تعریف نہیں کی گئی' لیکن پہلے ہی لفظ "آ" کے معنی "بھاکا ترجمہ" لکھنا مضحکہ خیز

ہے - غیر زبانوں کے لفظ جو ہماری زبان میں مستعمل ہیں اُن کا لکھنا لازم ہے - مگر نیم لس (Nameless) ' یوزفل ' یوٹیلائز - (utilise) ' نیگ ' یوزری' نیرو (Narrow) جیسے الفاظ کا اردو لغات میں داخل کرنا صریحاً غلط ہے ' یہ لفظ ہماری زبان میں ہرگز مروج نہیں - مولف انگریزی نہیں جانتے ' معلوم ہوتا ہے اُن کے کسی نوجوان انگریزی داں دوست نے اس قسم کے الفاظ انہیں لکھہ کر دے دیے ہیں - اسی طرح فارسی کا " کدام " اور عربی کا " معاون " وغیرہ اردو لغت میں جگہ نہیں پاسکتے —

ایک چوک اس کتاب میں یہ ہوئی ہے کہ صحیح تلفظ کے لیے اعراب کا لحاظ نہیں کیا گیا اور نہ خود مولف نے کوئی اعراب قائم کیے ہیں - مثلاً " نوھں " میں واؤ تو ہے ہی اس پر پیش کا بھی اضافہ کیا گیا ہے - " تھوتھہ " میں پہلے حرف کے نیچے زیر لکھا ہے اور " تھیک " پر کوئی اعراب نہیں - اس فروگزاشت سے پڑھنے والے کو صحیح تلفظ کے معلوم کرنے میں بڑی دقت ہوتی ہے —

مولف نے اسما کے ساتھہ تذکیرو تانیث کا التزام نہیں کیا غالباً اس کی وجہ یہ ہوگی کہ اس پر مستقل کتابیں موجود ہیں —

کتاب کے ساتھہ چار ضمیمے بھی ہیں ایک کتاب کے شروع میں جس میں انگریزی کی ضروری اصطلاحات ہیں - تین کتاب کے آخر میں - جن میں سے ایک قانونی اصطلاحات پر ' دوسرا خاص فارسی اردو محاورات و امثال پر ' تیسرا اردو محاورات کے مرادف انگریزی محاورات —

اس میں شک نہیں کہ لایق مولف نے اس لغت کی ترتیب بڑی محنت سے کی ہے اور اردو زبان میں طلبہ کے لیے اس سے بہتر اس وقت کوئی لغت نہیں ہے —

کلام ٹیگور (حصہ اول) -

مترجمہ ایم - ضیاالدین صاحب استاد کلیہ شانتی نکیتان - صفحات ۲۰۰ + ۲۵ - پختہ جلد - دبیز کاغذ - ٹایپ کی دیدہ زیب چھپائی - قیمت دو روپے آٹھ آنے ملنے کا پتا - وشوا بھارتی بک شاپ ۲۱۰ کار نوالس اسٹریٹ - کلکتہ -

ہمیں بارہا یہ محسوس ہوا کہ اردو داں طبقہ ٹیگور کے شاعرانہ کمالات سے سوءظن رکھتا ہے - اس کے اسباب بھی نمایاں ہیں - ایک تو یہ کہ اردو میں ٹیگور کی ترجمانی نہایت غلط طریقے سے کی گئی ہے ۔ اس کی شاعری کی نہج مثالی اور اشاراتی ہے - اس قسم کے پیرایے کو دوسری زبان میں ادا کرنا دشوار امر ہے- تاہم ' اگر اس کی مسلسل نظموں کو اصل زبان سے منتقل کیا جاتا اور دونوں زبانوں کی فطرت کو ملحوظ رکھا جاتا تو ٹیگور ہمیں اتنا ناقابل فہم نہ دکھائی دیتا - لیکن طرفہ یہ کہ وہ اپنے گیتوں کے ذریعے روشناس کرایا گیا اور ستم یہ کہ یہ گیت انگریزی زبان سے لیے گئے اور ایسی ادق اور پیچیدہ عبارت میں پیش کئے گئے جو بنگلہ زبان کی طبعی شیرینی اور ٹیگور کی فطری موسیقیت کی ضد تھی - تمثیلاً ہم گیتان جلی کے اس ترجمے کا ذکر کر سکتے ہیں جو نیاز فتح پوری کا کیا ہوا ہے - بنگلہ کیا ' انگریزی ترجمے کی لطافت کے عشر عشیر بھی نیاز کو میسر نہ آیا اور بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ ٹیگور کی اس سے بھونڈی ہجو نہیں ہو سکتی تھی کہ ایسا سنگلاخ قلم اس کی نظموں کو ضبط تحریر میں لانے کے لیے آمادہ ہو - گیتوں میں شاعری کے مقاصد کا اتنا لحاظ نہیں رکھا جاتا جتنا موسیقیت کا - وہ پڑھنے کے لیے نہیں بلکہ گانے کے لیے لکھے جاتے ہیں —

ٹیگور کے کلام کو براہ راست بنگلہ زبان سے اردو میں منتقل کرنے کی یہ پہلی کامیاب سعی ہے - نظموں کا انتخاب اور ان کے ترجمے کا اسلوب مترجم کے ذوق کا شاہد ہے - ابتدا میں ٹیگور کی شاعری پر ایک مختصر سا دیباچہ ہے جو ترجمے کے اعلیٰ معیار کو دیکھتے ہوئے تشنہ معلوم ہوتا ہے - بعد ازاں مختلف مجموعوں کی منتخب نظموں اور گیتوں کے ترجمے ہیں - ایسی نظمیں نظرانداز کردی گئی ہیں جن کا مدعا تصوف کی بھول بھلیوں میں پھنس کر عنقا ہوجاتا ہے - ہم نے بعض حصوں کو اصل بنگلہ سے ملا کر دیکھا اور بلا تامل کہہ سکتے ہیں کہ ترجمے میں ضرورت سے زیادہ پابندی سے کام لیا گیا ہے - کامیاب ترجمے کے لیے شرط اول یہ ہے کہ دونوں زبانوں کی فطرت اور ماحول کو سمجھا جائے - فی الجملہ ترجمہ بہت شستہ و رفتہ ہے لیکن ایک ایک لفظ کی پکڑ میں اتنی تگ و دو کی گئی ہے کہ کہیں کہیں شگفتگی زائل اور روانی معدوم ہو گئی ہے - مثلاً :

" تونے سنی نہیں ' سنی نہیں ' اس کے پاؤں کی آہٹ نہیں سنی " ۔ (۱۱۹) یہ جملہ یوں لکھا جاتا تو زیادہ رواں ہو جاتا - " تونے نہیں سنی نہیں سنی ' اس کے پاؤں کی آہٹ نہیں سنی " —

" تو راہ گم کیے نہ جانے کہاں ہے - " (۱۲۰) = " تو بھٹک کر نہ جانے کہاں رہ گیا " - " میں اپنے کھوئے ہوئے آپ کی تلاش میں ہوں " - (۱۱۹) = " میں اپنی گم کردہ خودی کی تلاش میں ہوں " —

" اب چلو سکھی گھاٹ پر سے پانی کی ناند بھر لائیں " - (۱۱۴) گھاٹ پر ناند نہیں گگری بھری جاتی ہے —

" رنگ روپ کا یہ اودھم ہے (۱۰۹) " —

اودھم کی جگہ یہاں میلا یا ہجوم زیادہ موزوں ہوتا —

بنگلہ زبان کے لغوی ترجمے کی دھن میں کہیں کہیں ایسی ترکیبیں وضع کی گئی ہیں —

" دے ٹوٹلے دے"- (۱۱۹) اردو میں 'دے' کے استعمال کا یہ کوئی موقع نہیں۔ "ٹوٹلے دے ٹوٹلے دے"۔ کہیں زیادہ فصیح ہوتا۔ اسی طرح ۱۶۹ صفحے پر "نہ سکوگے کہ پھول کھلا سکو" کئی بار آیا ہے۔ پوری کتاب میں 'تلاطم' کے بدلے ہر جگہ 'طلاطم' شایع ہوا ہے —

ایسی چھوٹی موٹی غلطیاں زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں۔ مجموعی طور پر ترجمہ بہت سلیس اور صاف ہے۔ اُمید ہے کہ اس کا دوسرا حصہ بھی جلد شایع ہوگا اور یہ کاوش قدردانی اور حوصلہ افزائی کے فقدان سے ادھوری نہ رہ جائے گی —

"ناخدا"

جوہر آئینہ —

مصنفہ جناب بیخود موہانی ' ایم - اے ' پروفیسر شیعہ کالج لکھنو-
چھوٹی تقطیع ' صفحات ۴۲ - قیمت ۵ آنے - ملنے کا پتا
انوار بک ڈپو لکھنو

چند سال قبل انجمن ترقی اردو نے سید مسعود حسن رضوی (لکھنو یونیورسٹی) کی کتاب "ہماری شاعری" شائع کی تھی۔ اس کتاب کا موضوع تنقید شعر ہے۔ مصنف نے اُسے مولانا حالی کے مقدمۂ شعر و شاعری کو پیش نظر رکھ کر لکھا ہے۔ اِسے دراصل مقدمے کا تتمہ سمجھنا چاہیے۔ مقدمے میں بعض مباحث کسی قدر وضاحت اور تفصیل چاہتے تھے۔ مصنف

نے ان مباحث کو "ہماری شاعری" میں اپنے ذوق اور قابلیت کے اعتبار سے تفصیل کے ساتھ بکثرت مثالیں دے کر پیش کیا ہے لیکن اپنے خیالات کو نافذ کرنے اور ان کے مطابق برجستہ، صحیح اور موزوں اشعار کی مثالیں دینے میں بڑی افراط و تفریط برتی ہے اور بعض اشعار کو اپنے خیال اور مطلب کے مطابق تفسیر و تشریح کا جامہ پہنایا ہے۔ اس کے سوا اُن کی کتاب پر اہل نظر کے گونا گوں اعتراضات ہیں جو اب تک جامعیت کے ساتھ قلم بند ہوکر شائع نہیں ہوے تھے۔ اب جناب بیخود موہانی نے اس طرف توجہ فرمائی ہے۔ انھوں نے اس کتاب پر ڈیڑھ سو صفحوں کی ایک مفصل تنقید لکھی ہے۔ فی الحال جلد اول کی قسط اول چھپ کر شائع ہوئی ہے جس کے ۴۲ صفحے ہیں۔

فاضل تنقید نگار نے تنقید کا جو اصول پیش نظر رکھا ہے اس کا صحیح اندازہ ذیل کے اقتباس سے ہوگا:—

"مجھے ہماری شاعری سے مفصل بحث کرنا ہے اور دکھانا ہے کہ مؤلف علام نے کہاں کہاں خوشہ چینی کی ہے، اور کہاں کہاں نکتہ آفرینی۔ علماے بلاغت کے اقوال کہاں کہاں سنور گئے ہیں کہاں کہاں مسخ ہوگئے ہیں۔ مثالیں تحقیق کی آئینہ دار ہیں یا آئینہ تحقیق کا زنگار۔ مولف بدل کی شگفتہ متانت، سنجیدہ ظرافت، سادہ رنگینی، پرکار سادگی سبھی کی داد دینا ہے مگر احباب مطمئن رہیں جو دل سمجھے گا وہی زبان پر لاؤں گا اور جو آنکھہ دیکھے گی وہی دنیا کو دکھاؤں گا" —

فاضل تنقید نگار نے بیشتر لفظی اور کمتر معنوی اعتراضات کیے ہیں اور قدیم انداز میں مصنف کی غلطیوں اور غلط فہمیوں کی پردہ دری کی ہے لیکن کہیں کہیں انداز بیان میں ہلکی سی تلخی و ناگواری پیدا ہوگئی ہے۔

"ہماری شاعری" میں تنقید شعر کے ابتدائی مسائل بیان ہوئے ہیں اس پر اگر عمومی حیثیت سے تنقیدی نظر ڈالی جاتی تو کافی تھا۔ اِس قدر شرح و بسط کے ساتھ لفظی جرح و تنقید کرنے اور کتاب کے تار و پود بکھیرنے کی ضرورت نہ تھی، تاہم اس مفصل تنقید سے ان طلبہ کو ضرور فائدہ پہنچےگا اور بصیرت حاصل ہوگی جن کے نصاب میں اصل کتاب یعنی "ہماری شاعری" داخل ہے۔ (چ)

تاریخ و سیر

حبش و اطالیہ۔

(مرتبہ سید اختر حسین صاحب بی۔اے، رائے پوری۔
انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن صفحات تقریباً دو سو
قیمت ایک روپیہ چار آنے)

انجمن ترقیء اُردو نے یہ کتاب عین وقت پر شایع کی ہے۔ ہندوستان کی کسی زبان میں حبش کے متعلق ایسی پراز معلومات کتاب اب تک نہیں لکھی گئی۔ اس میں آٹھ باب، ایک ضمیمہ اور تمہید ہے۔ حبش کے جغرافیء حالات، تاریخ، تہذیب و معاشرت، حبش کا دور حاضر، حبش اور عرب کے تعلقات، حبش اور اطالیہ، لیگ استعمار اور حبش اور اس کے مستقبل سے جامع اور مفصل بحث کی گئی ہے۔ ضمیمے میں واردات جنگ اور مجلس اقوام کا میثاق درج کردیا گیا ہے۔ کتاب میں حبش کا نقشہ اور شہنشاہ حبش، مسولینی، جنرل ورجین اور وہیب پاشا کی تصویریں بھی

ہیں - سرورق پر جنگ کی بھیانک تصویر بہت عجیب ہے - یہ کتاب کئی
اہل قلم کی محنت کا نتیجہ ہے جسے اختر حسین صاحب نے بڑی خوبی
سے مرتب کیا ہے - حبش اور موجودہ جنگ کے متعلق اس قدر مستند
حالات کسی دوسری کتاب میں نہیں ملیں گے - کتاب کے شروع میں
قاضی عبدالغفار صاحب مدیر پیام کی بہت دلچسپ تمہید ہے - جو لوگ
دنیا کے حالات اور سیاسی معاملات سے واقف رہنا چاہتے ہیں ان کے لیے
اس کا مطالعہ نہایت ضروری ہے — —)

باپ کے خط بیٹی کے نام -

(از پنڈت جواہر لال نہرو - صفحات ۱۹۰ - کاغذ دبیز -
لکھائی چھپائی دیدہ زیب - قیمت دو روپے - ملنے کا پتا
کتابستان الہ آباد) —

پنڈت جواہر لال نہرو ہندوستان کے سربرآوردہ سیاسی کارکنوں
میں ہیں اور جدید معاشی رجحانات کے تو وہ پیشوا ہیں - لیکن ان کے
طبعی میلان سے جو آشنا ہیں وہ تسلیم کریں گے کہ وہ پہلے مفکر اور بعد
میں قائد ہیں - کچھ عرصے سے وہ تصنیف و تالیف کی طرف رجوع ہوے
ہیں اور ثبوت بتا رہے ہیں کہ ان کے دماغ و قلم دونوں سلجھے ہوے
ہیں اور سنجیدہ مضامین کو سیدھے سادھے ڈھنگ سے لکھنے کا انہیں ایسا
سلیقہ ہے کہ شاذ و نادر دوسری جگہ دیکھنے میں آتا ہے —

یہ کتاب ان خطوں کا مجموعہ ہے جو پنڈت نہرو نے اپنی بیٹی کو
لکھے تھے دراصل ان خطوں کی نوعیت تعلیمی اور غیر شخصی ہے - پنڈت
جی چھوٹی سی چھوٹی بات کو اتنا پھیلا اور سلجھا کر بیان کرتے ہیں کہ

بعض دفعہ الجھن سی ہونے لگتی ہے - یہ اسلوب ان دماغوں کے لیے بہت موزوں ہے جن کی نشوونما شروع ہو رہی ہے - انہیں پڑھنے سے ابتداے آفرینش کے بنیادی مسائل صاف ہوجاتے ہیں اور تاریخ عالم کا ایک مسلسل ڈھانچا ذہن میں آجاتا ہے - اب تک ہماری زبان میں بچوں کی ضروریات کو مد نظر رکھ کر ایسی کتاب نہیں لکھی گئی تھی - اور حق تو یہ ہے کہ اس سے بہت سے بوڑھے بھی استفادہ کرسکتے ہیں - اچھا ہو اگر پنڈت جی کی اس تاریخ عالم کا بھی اردو میں ترجمہ کردیا جاے جو انگریزی میں کافی مقبول ہوچکی ہے - ترجمے میں مولف کی نکتہ رسی اور سادگی کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے - "ناخدا" —!

:*:

مذہب و اخلاق

۱- اساس القرآن- ۲- قوت القرآن-

(مولفہ واحدہ خانم صاحبہ ۱۵۲ جدید بمبو بازار بنگلور سٹی)

یہ دونوں کتابیں واحدہ خانم صاحبہ کی تالیف ہیں - پہلی کتاب سورۂ فاتحہ کی تفسیر ہے - زبان میں جوش اور زور معلوم ہوتا ہے - لیکن زیادہ تر خطابت سے کام لیا ہے —

دوسری کتاب میں مختلف قوتوں سے بحث کی ہے - مثلاً استقامت کی قوت، للہیت کی قوت، معراج کی قوت، کلام کی قوت، ہجرت کی قوت وغیرہ وغیرہ - اس میں طرز بیان وہی ہے —

کلام ربانی -

(مترجمہ یوگی راج نظر سوہانوی - چلدرگھٹ پریس دھلی - صفحات ۲۴۱ - قیمت ایک روپیہ) -

یہ سنسکرت کی شہرۂ آفاق کتاب بھگوت گیتا کا اردو منظوم ترجمہ ہے - گیتا کا ترجمہ دنیا کی ہر شایستہ زبان میں ہوچکا ہے - اردو میں بھی کئی ترجمے نظم و نثر میں ہوچکے ہیں - یہ ترجمہ جو نظر صاحب نے کیا ہے' بلا شبہ دوسرے منظوم ترجموں پر فوقیت رکھتا ہے - مثنوی ھی اس قسم کی کتابوں کے لیے موزوں ہوسکتی ہے - ترجمے میں روانی پائی جاتی ہے اور ادق مسائل کو بھی لائق مترجم نے بڑی خوبی سے اردو زبان میں ادا کیا ہے - ترجمے کی دشواریوں سے جو لوگ واقف ہیں وہ ضرور اس کی قدر کریں گے - یہ دشواری الہامی اور قدیم مستند کتب کے ترجمے میں اور بڑھ جاتی ہے - نظر صاحب کا یہ ترجمہ دیکھہ کر بہت خوش ہوئی - انہیں زبان پوری پرقدرت ہے اور ہر قسم کے خیالات کے اظہار پر قادر ہیں —

متفرقات

شکار -

(مصنفۂ نواب قطب یار جنگ بہادر بی - اے (عاہگ) صفحات ۸۰۰ مجلد - قیمت دس روپے - مکتبۂ ابراھیمیہ حیدرآباد دکن)

قطب الدین احمد مرحوم (یعنی نواب قطب یار جنگ بہادر) علی گڈھ

کالج کے پرانے طالب علموں میں سے تھے - شہسواری اور شکار کی دھت تھی -
زمانۂ طالب علمی میں بھی وہ اِس فن میں مشہور تھے - حیدرآباد کی ملازمت
میں انہیں اپنا شوق پورا کرنے کا خوب موقع ملا - متعدد سال تک
عادل آباد کے تعلقدار رہے جو شکار کا مخزن ہے ۔ یہ کتاب فن شکار پر
بہت ہی مکمل ہے ' اردو زبان میں ایسی کتاب اب تک شایع نہیں
ہوئی - یہ سمجھیے کہ گویا شکار کی ان سائیکلوپیڈیا ہے - ابتدا میں
بندوق چلانے اور نشانہ لگانے پر بہت مفصل اور علمی بحث کی ہے - اس
کے بعد بٹیر اور تیتر سے لے کر شیر ' ہاتھی اور گینڈے تک کے شکار کا
حال لکھا ہے ۔ اس ضمن میں اِن جانورں کے حالات و عادات ' شکار کرنے
کے طریقے ' شکار کی تلاش ' شکار کے سامان وغیرہ کی کیفیت - تفصیل
سے بیان کی ہے - شیر کے شکار کا حال نہایت مفصل لکھا ہے اور پورے ۳۲۲ صفحات
پر آیا ہے - اس بیان میں ضمنی طور پر پرلطف قصے اور واقعات بھی آ گئے ہیں -

کتاب میں بعض بعض مقامات پر بے ضرورت بھی انگریزی لفظ
استعمال کیے گئے ہیں - مثلاً واک ' ترات ' کیمپ ' پرائس لسٹ ' کارتوس
لوڈ کرنا وغیرہ ' حالانکہ ان کے لیے اپنی زبان کے لفظ استعمال ہو سکتے تھے -

یہ کتاب شکار کے شائقین کے لیے نہایت کار آمد اور قابل قدر ہے ۔

رموز تجارت -

(مصنفہ محمد نور اللہ قریشی صاحب ٹونکی - چھوٹی تقطیع - صفحات ۹۹ ۔
قیمت مجلد ایک روپیہ مع محصول ڈاک ۔ مطبوعہ مطبع آگرہ اخبار- آگرہ)

اس مختصر کتاب میں لائق مولف نے ذاتی تجربات و مشاهدات

کی بناء پر تجارت کے متعلق ضروری معلومات سلیقے کے ساتھہ قلمبند فرمائے ھیں - کتاب کے دو باب ھیں جن میں موجودہ تجارت کے تمام رموز و اسرار کھول کر رکھہ دیے ھیں - تجارت میں کامیابی کے لیے جس اخلاقی، جسمانی اور ذھنی و دماغی ضبط و توازن کی ضرورت ھے اس کو دلاویز پیرائے میں پیش کیا ھے اور ساتھہ ھی تاجر کی ناکامیوں کے اسباب کو وضاحت کے ساتھہ موثر انداز میں دکھایا ھے - موجودہ تجارت کے لیے جن جدید معلومات کی ضرورت ھے اور جن کے بغیر کوئی تاجر پنپ نہیں سکتا ان سب کو اس مختصر کتاب میں بقید تبویب درج کیا ھے -

(چ)

اردو کے جدید رسالے

کلیم (ماہ نامہ) -

(زیر ادارت حضرت جوش ملیح آبادی - کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ تقطیع - 'اردو' سے کچھہ بڑی - ایک رنگین اور کئی سادہ تصاویر - صفحات ۹۶ - قیمت سالانہ ۱۰ روپے اور فی پرچہ ایک روپیہ - ملنے کا پتا منیجر کلیم لکھپوری دلی)

اردو صحافت کی کس مپرسی محتاج بیان نہیں اور اب جو ھمارے

شعرا یکے بعد دیگرے اس طرف لطف فرمانے لگے ہیں تو اس کاغذ کی ناؤ کا بس اللہ بیلی ہے —

ادارے کی رائے میں یہ "اردو زبان کا ہر جہت سے سب سے نیشنل "ماہنامہ" ہے - افسوس کہ ہم اس رائے سے اتفاق نہیں کر سکتے - یہ مطلب نہیں کہ اردو کے دوسرے رسالوں سے یہ کسی طرح ہیٹا ہے بلکہ ان خاصیوں کے زمرے میں یہ برگزیدہ ہے - یہ پرچہ اردو ادب میں انقلاب برپا کرنے کی غرض سے نکالا گیا ہے اور اس کے حسن و قبح کا ایک یہی معیار ہوسکتا ہے کہ کس حد تک اس کے مضامین اس غایت کو پورا کرتے ہیں -

اس میں جوش صاحب نے اردو ادبیات میں انقلاب کی ضرورت کے عنوان سے ایک مضمون تحریر فرمایا ہے جسے اس رسالے کا افتتاحیہ سمجھنا چاہیے - اسے پڑھنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ وہ انقلاب کے منشا سے ہی ناواقف ہیں - مضمون کے پہلے حصے میں قدرت کے جبر کے آگے انسان کی بیچارگی کا ذکر کرتے ہوئے صوفیانہ انداز میں اس کی تگ و دو پر تمسخر کیا گیا ہے اور دوسرے حصے میں اسے نظام عالم کی اصلاح کی نصیحت کی گئی ہے - اس تضاد کی وجہ سے پورا مقالہ بے ربط ہوگیا ہے اور اس کی حیثیت نثر نگاری کے عمدہ نمونے سے زیادہ نہ رہی -

زندگی نام ہے حرکت کا اور حرکت کے حقیقی معنے یہی ہیں کہ انسان اپنے سوا کسی دوسری طاقت پر بھروسا نہیں کرتا - جب ماضی کا ایوان بغاوت کے تیشوں سے زخمی ہو کر تخریب کے غار میں گرنے لگتا ہے تو انقلاب کا شہتیر اسے تھام کر نئے نظام زندگی کا حصن حصین بن جاتا ہے - ادب وہ صور ہے جو ایوان زندگی کے معماروں کو ان کے فرائض کی یاد دلاتا رہتا ہے —

دوسرے مضامین کا ادبی انقلاب سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ بال جبرئیل پر اثر لکھنوی کا ناقدانہ مضمون قابل قدر ہے اور غزل گوئی پر جوش صاحب کا مضمون بھی اچھا ہے۔ ان کے علاوہ جو مضامین یا افسانے شایع کیے گئے ہیں وہ کوئی خاص حیثیت نہیں رکھتے اور حسرت ہوتی ہے کہ کیا اسی متاع کے برتے پر یہ رسالہ اپنے ہم عصروں کو صلاے عام دے رہا ہے۔

جوش صاحب کے شاعرانہ کمالات پر ہمیں جیسا ایمان راسخ ہے، ان کی صحافتی قابلیت پر ویسا حق الیقین نہیں۔ ادارت کی معمولی غلطیاں آنکھوں کو کھٹکتی ہیں۔ سر ورق پر کوہ کی ایک شبیہ ہے جسے 'کلیم' کی نسبت سے اگر طور تصور کرلیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہاں پانی کا چشمہ کیوں کر بہنے لگا۔ تصاویر میں سے تقریباً سبھی اردو رسائل میں شائع ہو چکی ہیں۔ پھر اشارات میں مدیر نے صیغۂ واحد متکلم کا استعمال جس کثرت سے کیا ہے وہ ادبی انقلاب کے کسی آرگن کو نہیں پھبتا۔ کاش 'واحد متکلم' اور 'صفت' کے ان دو صیغوں کے استعمال میں احتیاط کی جاے تو ہماری صحافت کے حق میں بہت بہتر ہو۔

یہ دو چار کڑوی باتیں اپنایت میں لکھ دی گئی ہیں۔ یوں 'کلیم' اردو کے بہترین ماہ ناموں میں گنا جا سکتا ہے الا یہ کہ اس کے دام زیادہ ہیں۔ البتہ اگر اس معیار پر جانچا جاے جو جوش صاحب نے قرار دیا ہے تو اس میں ترقی کی بڑی گنجائش ہے اور ادارے پر عظیم الشان ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ 'ناخدا'

ساربان (ماہنامہ)-

(ایڈیٹر غلام محمد خاں صاحب بی-اے- حجم ٥٥ صفحات-

کتابت و طباعت اچھی - سالانہ چندہ ڈھائی روپے- ملنے کا پتا :-

منیجر رسالۂ ساربان آسٹریلیا بلڈنگ لاہور)-

یہ رسالہ خاص مقصد کے تحت جاری کیا گیا ہے- مدیر کے الفاظ میں "تعلیمی' اقتصادی اور اصلاحی تحریکات کو تقویت پہنچانا اور ہندوستان کی مختلف اقوام کو بلند خیالی اور اتحاد و اتفاق کی تلقین کرکے انہیں ترقی کی طرف لے جانا 'ساربان' کا نصب العین ہے"—

اس پرچے کے دو نمبر ہماری نظر سے گزر چکے ہیں اور ہمیں ان میں کئی مفید مضامین نظر آے- جن سے اس دعوے کی تائید ہوتی ہے- رسالے کی اٹھان اچھی ہے اور اگر وہ اسی طرح ترقی کرتا رہا تو اردو صحافت میں اپنے لیے ایک نمایاں جگہ پیدا کرلے گا- وقتی مسائل پر سنجیدہ مضامین شایع ہوا کرتے ہیں- " ناخدا "

طلوع اسلام -

(زیر ادارت سید نذیر نیازی صاحب- حجم ۱۱۲ صفحات-

کتابت و طباعت اچھی- سالانہ چندہ ٥ روپے- ملنے کا پتا :-

منیجر طلوع اسلام قرول باغ' دہلی)-

یہ رسالہ جامعۂ ملیہ کے پڑوس سے وہیں کے ایک سپوت نے شایع کیا ہے' ان تمام ظاہری و معنوی خصوصیات کے ساتھ جو اب اس ادار.

وابستہ ہیں۔ ہمارے پیش نظر رسالے کا پہلا نمبر ہے جس میں اس کے مقصد کی طرف کوئی صریح اشارہ تو نہیں ہے لیکن 'اسلام کے نشاۃ ثانیہ' اور 'ایک خوش گوار رد عمل' کے متعلق جو اشارات کیے گئے ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ اس گنبد میں کونسی آواز پوشیدہ ہے —

ہمیں رسالے کے علمی معیار کے متعلق کچھہ نہیں کہنا ہے - وہ یقیناً بلند ہے اور اسے ہر اعتبار سے 'معارف' کا ضمیمہ کہا جاسکتا ہے ۔ دیکھنا یہ ہے کہ علامہ اقبال کی سرپرستی اور جامعۂ ملیہ کی ہم سایگی کا شرف رکھنے والا جریدہ مسلمانان ہند کے لیے کون سا پیغام لایا ہے —

مسلمانوں کے ماضی کی عظمت کا قصیدہ اور ان کی خستہ حالی کا نوحہ ہر جاہل مولوی بھی پڑھ لیتا ہے اور مستقبل کی کامرانی کے خواب ہر شیخ چلی دیکھا کرتا ہے - یہ ایسی باتیں نہیں کہ انہیں سنانے کے لیے خاص اہتمام کیا جاے —

ہمارے کان یہ سب سنتے سنتے پک گئے ہیں اور ہم اس دن کا انتظار کرتے کرتے بیزار ہو چکے ہیں۔ جب غریب مسلمانوں کو بتلایا جاے گا کہ صوم و صلواۃ اور چندہ و زکواۃ کے علاوہ ان کے فرائض و حقوق کیا ہیں - مانا کہ وہ آزاد ہوں، انفرادیت قایم رکھیں، انگریزوں سے لڑیں، غیر ملکی اسلامی برادری کی رہنمائی کریں - لیکن کوئی لایحۂ عمل، کوئی پروگرام، فوری مسائل کا کوئی حل؟ —

مسلمان کسان اس دن کا بے صبری سے انتظار کررہا ہے جب روح و مادہ کے کارفرماؤں کی چھین سانی سے اسے اتنی فرصت ملےگی کہ وہ بھی تمدن و فلسفہ کی برکتوں سے فیض یاب ہو سکے گا۔ مسلمان مزدور اخوت و مساوات کے دعویداروں کو اپنا خون پیتا ہوا دیکھہ کر وعظ و پند کے ان

دفتروں میں راہ نجات تلاش کرتا ہے - لیکن ان موٹے موٹے جریدوں میں عقل فریب عنوانوں کے نیچے صرف ایک تحریر دکھلائی دیتی ہے - وعدۂ حور! "اور بیچارے مسلماں کو فقط وعدۂ حور!" —

رسالے کے پہلے نمبر میں مستقل عنوانات کے علاوہ' جن میں معلومات کا مفید ذخیرہ مہیا کیا گیا ہے - چار مقالے ہیں۔ ان میں سے "ملت اسلامیۂ ہند" اور "سیاست معاشی" کے متعلق ہم کچھہ عرض کرنا چاہتے ہیں جن میں سے پہلا مدیر کے زور قلم کا نتیجہ اور دوسرا ڈاکٹر ذاکر صاحب کی کاوش فکر کا نمونہ ہے —

نیازی صاحب کا ارشاد ہے کہ "ہمیں اپنی قوم میں ایک ہیئت اجتماعیہ پیدا کرنا ہوگی" - بجا اور درست لیکن اس کے عملی امکانات کیا ہیں۔ مسلمان مزدور اور اس کے مسلمان آقا' مسلمان کسان اور مسلمان زمیندار مسلمان گداگر اور مسلمان سرمایہ دار میں اجتماعیت کی کوئی صورت پیدا ہوسکتی ہے؟ محض نماز اور روزے کی پابندی ان متضاد عناصر میں شیرازہ بندی کرسکتی ہے؟ ۱۳ سو سال کی تاریخ اس نظریے کو غلط ثابت کرتی ہے - تو کیا اس 'ہیئت' کی تشکیل کے لیے اتنا کافی ہے کہ تمام مسلمان کونسلوں' ملازمتوں اور درسگاہوں میں نشستیں محفوظ کرانے کے لیے آڑ جائیں - (یہ مقالہ نگار کا مشورہ ہے) - لیکن ۹۰ فی صدی مسلمانوں کو ان اداروں سے براہ راست کوئی واسطہ نہیں اور مجوزہ 'ہیئت' کا تقاضا تو یہ ہے کہ اجتماعی مفاد کے صدقے ان کو دور ہی سے سلام کیا جائے کیوں کہ مغربی مادیت کی شاخیں یہیں سے تو پھوٹتی ہیں —

'سیاست معاشی' میں فاضل مقالہ نگار نے ہمیں بتایا ہے کہ ہمارے معاشرے کی نجات' الہامی راہ پر چلنے اور غیر عقل طریقوں کے استعمال سے

ہی ممکن ہے۔ اس انوکھی منطق کا مافی الضمیر ہم نہ سمجھ سکے کیوں
کہ جب معمولی درسگاہوں کو چلانے کے لیے لوگ الہام و وجدان نہیں
بلکہ عقل و شعور کی "لعلٹوں" سے کام لیتے ہیں اور ایک مرتب لایحۂ
عمل بنا کر مذہب سے اس کا جواز ثابت کرتے ہیں، تو کوئی وجہ نہیں کہ غریب
مسلمان کوچۂ عشق کی ازان گھاٹیوں میں ہمیشہ مبتلا رہیں۔ انہیں فوری
مسائل سے بے خبر رکھنے، ان کے سیاسی و اقتصادی اغراض پر پردہ ڈالنے
اور اجتماعیت، کے بھرم کو چھپانے کے لیے اکثر ایسے حیلے تراشے جاتے ہیں
لیکن وہ دن دور نہیں جب اس غیر عقلی استبداد کا ناسور پھوٹے گا؛ حقیقت
کا نشتر سماج کے سڑے گلے حصوں کو کاٹ کر پھینک دے گا اور فلسفہ گری
کا کوئی پلاسٹر اسے چھپا نہ سکے گا —

جرمن مفکر 'سومبارت' کی پیروی میں جس کی شاگردی کا فخر
صاحب مضمون کو حاصل ہے، اس مقالے میں اشتراکیوں کی نفسیات پر
بحث کی گئی ہے۔ اس ضمن میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کے معنی تو
یہی ہیں کہ معاشی نظام کو بدلنے کی کوشش کرنے والے سب لوگ عام
اس سے کہ وہ اشتراکی — "زندگی میں ناکامی و نامرادی کے باعث غم
و غصہ سے بھرے ہوتے ہیں اور تاریکیٔ حیات میں شمع محبت کی روشنی
سے محرومی کے باعث ان کا دل نفرت سے لبریز ہوتا ہے"۔ ہم عاجزانہ یہ
کہیں گے کہ اے بے خبر یہ بات پہنچتی ہے دور تک یا پیغمبر اسلام اور ان
کے رفقا بھی نظام زندگی کو بدلنا چاہتے تھے۔ وہ جسے حق و صداقت
تصور کرتے تھے اس کی راہ میں استبداد و ظلم سے لڑتے رہے لیکن
کیا ان کا غم و غصہ اس عالمگیر محبت کا ثبوت نہ تھا جو ان کے
دلوں میں قوم و ملت کی حدوں کو توڑ کر انسانیت کو ایک زنجیر میں

حلقہ گیر کرنے کی آرزو مند تھی - کیا تاریخ یہ درس نہیں دیتی کہ اس کی کج روشی کو سدھارنے کے لیے زیادہ تر وہ لوگ کھڑے ہوے جو نفرت اس لیے کرتے تھے کہ زندگی سر تا سر محبت ہو جائے اور نفرت کا کہیں نام بھی نہ رہے ؟ -

اس مقالے پر بہت کچھ کہنے کی گنجائش تھی لیکن طلوع اسلام کے مدیر نے یہ لکھ کر ہمارے قلم کو روک دیا کہ " چند تیز اشارات کے سوا اصل مبحث پر انہوں نے (ڈاکٹر ذاکر) نے بہت کم اپنے خیالات کا اظہار کیا " -

امید ہے کہ بہت جلد رسالہ اپنے تعریفی انداز کو چھوڑ کر کوئی تعمیری راہ اختیار کرے گا -

"ناخدا"

کامران - (ماہ نامہ) -

(زیر ادارت حاجی نبی احمد صاحب و سید ولایت حسن صاحب -

صفحات ۴۰ - کاغذ ، کتابت و طباعت عمدہ - قیمت

سالانہ ۳ روپے - ملنے کا پتا :- منیجر کامران ، دہلی -

یہ رسالہ " موجودہ دور کے ان علمائے کرام " کی سرکوبی کے لیے نکالا گیا ہے " جو اپنے آپ کو منزل من اللہ (معاذاللہ) محافظ اسلام سمجھتے ہیں - ان کی پیشانی سے خشونت و طبعی کرختگی کے آثار کسی غریب مسلمان کو ایک حرف تک تو پوچھنے کی اجازت نہیں دیتے - عوام الناس سے انکا سلوک کیا سرہ اور سلاطین روم کے جور و استبداد کی یاد تازہ کراتا ہے " —

اس قسم کے روحانی دلالوں کا وجود مسلمانوں کے گلے میں طوق لعنت

بنا ہوا ہے اور ان کی تباہی کا بہت بڑا سبب یہی ناسور ہے - ہر زمانے اور ہر ملک میں رجعت اور وحشت کے یہ پاسبان ترقی کی راہ روکے کھڑے رہتے ہیں ۔ ہماری زبان اور ادب کو ان سے جو نقصان پہنچ رہا ہے وہ ہر ہوشمند کے لیے باعث عبرت ہے - مصیبت یہ ہے کہ یہ کفر گر اخباروں کا پشتارہ باندھے ہوئے ہر جدید تحریک کا گلا گھونٹنے کی کوشش کرتے ہیں اور کسی کی ہمت نہیں ہوتی کہ ان کی گوشمالی کرے - مقام مسرت ہے کہ مسلمان نوجوانوں کے ایک طبقے کو اپنی زبوں حالی کا احساس ہونے لگا ہے ۔ یہ رسالہ اس کی جد و جہد کا ثمر اول ہے ۔ اس کی حوصلہ افزائی ہر آزاد خیال کا فرض ہے - رسالے کا ادبی معیار بلند ہے - امید ہے کہ یہ کوشش ایک منظم تحریک کی شکل اختیار کرلے گی — "ناخدا"

رفیق الطلباء ۔

یہ ششماہی رسالہ پونا سے نکلتا ہے - بظاہر اینگلو اردو ہائی اسکول کے طلباء کے ہاتھ میں اس کی انتظامی و ادارتی باگ ہے - لیکن در اصل پونا کے بعض دیگر تعلیمی ادارے بھی ان کے شریک کار ہیں - رسالے کے دو حصے ہیں یعنی اردو اور انگریزی - نومبر سنہ ۳۵ ع کا نمبر ہمارے پیش نظر ہے - حصۂ اردو ۵۵ صفحوں پر مشتمل ہے' جس میں علمی ' ادبی ' تعلیمی اور تاریخی مضامین کو بقید عنوان علحدہ علحدہ درج کیا گیا ہے ۔ ان کے سوا تقاریر ' نظمیں اور افسانے بھی ہیں - پونے سے ایسے رسالے کا نکلنا بسا غنیمت ہے - وہاں کے طلبہ میں اردو ادب کا خاص ذوق ہے اور وہ گوناگوں موانعات کے باوجود رسالے کو کامیابی کے

ساتھ چلا رہے ہیں۔ مضامین وغیرہ کا معیار بھی قابل تعریف ہے۔ امید ہے کہ پونے کے ذی علم حضرات اس کی اشاعت و ترقی میں ضرور ہاتھ بٹائیں گے۔ رسالہ مسلم یونیورسٹی پریس علی گڈھ میں چھپتا ہے اور اینگلو اردو ہائی اسکول، کیمپ، پونا سے شائع ہوتا ہے۔ قیمت ایک روپیہ — (چ)

جوہر -

یہ رسالہ جامعۂ ملیہ دہلی کے طلبہ کی انجمن اتحاد کا ترجمان ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ طلبہ کی تحریریں اور ان کے خیالات خواص و عوام کی نظروں تک پہنچتے رہیں اور ان میں انشاپردازی کا ذوق اور اپنے خیالات کو صحت و صفائی کے ساتھ ادا کرنے کا سلیقہ پیدا ہو۔ رسالے کی موجودہ قسط تقریباً دو سو صفحوں پر مشتمل ہے جس میں اساتذہ و طلبہ کے مضامین اور نظمیں درج ہیں۔ رسالے کے کارپردازوں وغیرہ کی چند تصویریں بھی ہیں۔ رسالہ کافی بلند معیار ہے، اس کے اکثر مضامین غور سے پڑھنے کے قابل ہیں۔ ملینجر رسالہ جوہر، جامعۂ ملیہ قرول باغ دہلی سے بارہ آنے میں مل سکتا ہے۔ کتابت، طباعت اور کاغذ عمدہ ہے — (چ)

اقتصادی دنیا (لاہور) -

(مدیر مسول، محمد اسمعیل نعیم صاحب۔ سالانہ چندہ تین روپے۔ ششماہی ایک روپیہ بارہ آنے۔ ملینجر رسالہ سے طلب کیا جاسکتا ہے) -

یہ ماہانہ رسالہ مئی ۳۵ ع سے نکلنا شروع ہوا۔ اس کا مقصد جیسا کہ

اس کے نام سے ظاہر ہے اہل ملک کو صنعت و حرفت اور تجارت کی ترغیب دلانا اور ان کے دلوں میں اس کے مفاد کو جاگزیں کرنا ہے۔ اقتصادیات کے متعلق رسالے میں بعض مضامین مفید اور سبق آموز ہیں۔ موجودہ معاشی و اقتصادی ضروریات و حالات کے متعلق بہت سی کارآمد معلومات رسالے میں درج کی جاتی ہیں۔ رسالہ بحیثیت مجموعی مفید ہے اور مزید ترقی کرسکتا ہے۔

(چ)

ادب

(مرتب جناب ناصر لکھنوی۔ صفحات ۹۶۔ سالانہ چندہ ۴ روپے۔ ششماہی دو روپے آٹھ آنے۔ مقام اشاعت :۔ نظامی پریس لکھنو)۔

یہ لکھنو کا مشہور ماہانہ رسالہ ہے جو تقریباً چار سال بند رہ کر نومبر سنہ ۳۵ ع سے پھر جاری ہوا ہے۔ اپنے اس دور جدید میں "ادب" نے اپنی قدیم روایات اور خصوصیات کو بر قرار رکھنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ مضامین متنوع ہیں اور اپنے موضوعات کے اعتبار سے دلچسپ بھی ہیں، لیکن وسعت بحث کے اعتبار سے کسی قدر مختصر اور تشنہ ہیں، تاہم ایک ماہ نامے کی ضخامت کے لحاظ سے غنیمت ہیں۔ رسالے میں غزلیں، نظمیں اور افسانے بھی ہیں۔ قلمی معاونین میں ملک کے بعض مشہور و نامور اہل قلم ہیں۔ رسالے میں ترقی کے کافی امکانات موجود ہیں۔ (چ)

خاص نمبر اور سالنامے

رسالۂ ندیم کا بہار نمبر -

(مرتبہ انجم صاحب - سالانہ چندہ چار روپے - اس نمبر کی قیمت ایک روپیہ ۸ آنے - صفحات ۳۲۰ - کاغذ ' کتابت و طباعت غنیمت - ملنے کا پتا :- منیجر ندیم ، گیا (بہار)

حالانکہ بہار میں اردو کا بڑا چلن ہے اور وہاں کی خاک نے بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں کے منہ دیکھے ہیں لیکن اس بدنصیبی کو کیا کہیے کہ وہاں کی زمین جراید و رسائل کے لیے بنجر ثابت ہوئی اور کوئی ادبی ادارہ نہ پنپ سکا - لہذا ' ندیم ' کے کارکنوں کی تعریف کرنا چاہیے کہ وہ کئی سال سے اس بے رنگ و بو زمین کو ہموار کرنے کی سعی کر رہے ہیں - اس رسالے کا دم غنیمت ہے کہ نہ صرف وہ زبان کی اشاعت میں کوشاں ہے بلکہ اپنے معیار کو بھی عام سطح سے بلند رکھتا ہے —

یہ نمبر صوبۂ بہار کے اہل قلم کے لیے مخصوص ہے اور اگر ایک طرف مولوی سلیمان ندوی اور نواب خیال مرحوم کے تبرکی مضامین کا ہدیہ موجود ہے تو ساتھ ساتھ کئی کارآمد مقالے بھی شایع کیے گئے ہیں - ان میں سید غلام حسین مصنف سیرالمتاخرین خدابخش خاں اور شتاب رائے کے حالات پر از معلومات اور مفید ہیں - ظہور اسلام سے قبل عربی و ایرانی تعلقات پر ایک عمدہ مقالہ چھاپا گیا ہے - ایک ادبی مضمون بعنوان "س ش ص" ادبی اعتبار سے بہت دلچسپ ہے اور اس میں قدیم بہار کی معاشرت اور وہاں کے اہل فن کے متعلق اچھی معلومات جمع کی گئی

ہیں - ایسے ضخیم رسالے میں لامحالہ بھرتی کے مضمون بھی شامل ہو جاتے ہیں - چنانچہ اس نمبر میں کئی بے تکے افسانے بھی شریک ہیں اور تقریباً سب ہی تصاویر ادنیٰ درجے کی ہیں - ان خامیوں کے باوجود مشرقی ہندوستان کی فضا کو دیکھتے ہوئے یہ رسالہ ہر طرح قابل تحسین ہے —

" ناخدا "

شاہجہاں - (سالگرہ نمبر)

(مرتبہ سید وصی اشرف صاحب دہلوی - سالانہ چندہ ایک روپیہ ۸ آنے اس نمبر کی قیمت ۸ آنے - صفحات ۱۰۷ - کاغذ، کتابت و طباعت غنیمت - ملنے کا پتا :- منیجر شاہجہاں دہلی) -

یہ رسالہ بھی اپنے ڈھب کا ایک ہی ہے - " ملسئی خبر " تلاشیں چھاپ کر اس نے اپنی حیثیت بنالی ہے - فی الحال اس کا رنگ خالص ادبی ہے اور اس نے اپنے گرد نوجوان ادیبوں کا ایک حلقہ جمع کر لیا ہے - اس سالنامے کو خوش سلیقگی سے مرتب کیا گیا ہے - اس کے مضامین میں جدت و تنوع کے ساتھ زندگی اور رنگینی ہے - اردو کے کسی اچھے رسالے کے دام اتنے کم نہیں - یہ متاع ان داموں بہت سستی ہے —

" ناخدا "

سالنامۂ نیرنگ خیال -

(مرتبہ حکیم یوسف حسن صاحب - سالانہ چندہ ۴ روپے - سالنامے کی قیمت ایک روپیہ ۸ آنے - جہازی سائز - لکھائی بہت گنجان، چھپائی صاف، کاغذ اچھا - ملنے کا پتا :- منیجر نیرنگ خیال - لاہور) -

نئے نئے رسالے نکلتے ہیں اور بھانت بھانت کی جدتیں کرتے ہیں مگر حکیم یوسف حسن صاحب کو کد ہے کہ ان سے کوئی بازی نہ لے جائے -

اور سچ یہ ہے کہ ان کا پلہ ہمیشہ بھاری رہتا ہے - معمولی نمبروں میں چاہے یہ دوسروں سے پیچھے رہ جائیں لیکن سال بھر اپنے سالنامے کی دھن میں رہتے ہیں ' شہد کی مکھی کی طرح پھول پھول سے رس جمع کرتے ہیں اور وقت آنے پر ایسا بھاری بھرکم رسالہ نکالتے ہیں کہ تعریف کرتے ہی بنتی ہے - اس کا حجم ۱۶۴ کیوں اس سے دوگنا سمجھیے کیونکہ کاغذ کے بہت بڑے تاؤ پر مہین مہین لکھا ہے - مضمونوں کی پوچھیے تو یہ گویا ایک فرش ہے جس پر پچی کاری کی گئی ہے - الگ الگ کرکے دیکھیے تو کوئی ٹکڑا ڈھنگ سے تراشا گیا ہے اور کوئی ٹیڑھا بنگا مگر سب کو ملا کر دیکھیے تو آنکھوں کو راحت ہوتی ہے - تصویروں کا یہ حال ہے کہ مصور اور منتخب نے اپنا اپنا حق ادا کیا لیکن چھاپنے والے بھی اپنی سی کر گئے - آرٹ کی تصویروں کی پشت پر جوتوں کی پریل دیکھ کر ہنسی بھی آتی ہے اور عبرت بھی ہوتی ہے - اوپر سے دیکھیے تو ریلوے گائڈ اور ذرا گھرے جائیے تو علم و ادب کے موتی بکھرے ہوے ہیں —

حکیم صاحب کی جولانی اپنے مظاہرے کے لیے نت نئی ڈگر نکالتی ہے - گزشتہ سال سے اہل قلم کی عزت افزائی کا کام انہوں نے اپنے تفویض کرلیا ہے - ان کی کرشمہ گری ملاحظہ ہو کہ خطابات کی تقسیم میں حکومت سے زیادہ دریا دلی دکھاتے ہیں ' قلم کی ایک جنبش سے ذرے کو آفتاب بناتے ہیں - ' عصر ' و ' ملک ' سب ان کے حضور میں ہاتھ باندھے کھڑے ہیں - معلوم نہیں ہم ان لوگوں سے اظہار ہمدردی کریں یا انہیں مبارکباد دیں جن پر ہر سال اس دربار سے رحمت کی بارش ہوتی ہے - اب حکیم صاحب اس بار کو ایک کمیٹی کے سپرد کرنا چاہتے ہیں - ہماری رائے میں تو ایک کمیٹی صرف اس غرض سے بنانا چاہیے جو ان کے لیے کوئی مناسب

اعزاز تجویز کرے —

بہر حال ' نیرنگ خیال ' کے احسانات اردو صحافت پر بہت زیادہ ہیں - اس کی اشاعت اور مقبولیت ہماری زبان کی ترقی کا باعث ہوگی -

" نا خدا "

سالنامۂ ساقی -

(مرتبۂ نور الحسن صاحب و شاہد احمد صاحب - سالانہ چندہ ۴ روپے ۸ آنے - اس نمبر کی قیمت ایک روپیہ چار آنہ - صفحات ۱۴۰ ' کاغذ ' کتابت و طباعت عمدہ - خوبصورت سرورق اور متعدد تصاویر - ملنے کا پتا - منیجر ساقی کھاری باولی دلی)-

دلی کے رسالۂ ساقی نے اپنے ہم عصروں میں نمایاں جگہ حاصل کر لی ہے اور اس کی ترتیب میں سلیقے اور محنت سے کام لیا جاتا ہے - ہر سال کی طرح اس مرتبہ بھی اس نے بڑی آن بان کے ساتھ اپنا سالنامہ شایع کیا ہے - یہ نمبر جاپان کے لیے مخصوص ہے اور وہاں کی زندگی کے ہر پہلو پر معیاری مضامین جمع کیے گئے ہیں - بڑی بات یہ ہے کہ نہ صرف ان حضرات نے اس کے لیے مضمون لکھے جو جاپان میں مقیم ہیں بلکہ بعض جاپانیوں نے بھی اردو زبان میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے - حیرت ہوتی ہے کہ ادارے کو اس شان کا رسالہ نکالنے کے لیے کیسا اہتمام کرنا پڑا ہوگا - جاپان ہر اعتبار سے ایشیائی ممالک کا پیشوا ہے اور ہمارا فرض ہے کہ وہاں کے حالات سے دلچسپی ظاہر کریں - مقام مسرت ہے کہ اب ہمارے جراید ضروریات وقت کا لحاظ کرنے لگے ہیں - رسالۂ

ساقی نے ایک نئے باب کا آغاز کیا ہے کیونکہ جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے ہمارے کسی مشہور ادبی رسالے نے اس قسم کا نمبر شایع نہیں کیا۔ اس جدت کے لیے مہتمم ساقی مبارکباد کے مستحق ہیں — "ناخدا"

ہمایوں (سالگرہ نمبر) -

(مرتبہ بشیر احمد صاحب بی - اے (آکسن) سالانہ چندہ
پانچ روپے ۶ آنے - اس نمبر کی قیمت ۱۲ آنے - صفحات ۱۲۱ -
کاغذ ' کتابت و طباعت ' اعلیٰ - ملنے کا پتا - مینجر ہمایوں لاہور) -

ادارۂ ہمایوں کی زنبیل میں نہ معلوم کتنے خاص نمبر بند ہیں ہر چھٹے چھماہی ایک نہ ایک منظر عام پر پیش ہو جاتا ہے - اس نمبر میں ویسی لغزشیں نظر نہ آئیں کی جیسی بعض گزشتہ اشاعتوں میں رہ گئی تھیں ' اور جن کی نکتہ چینی کا تلخ فریضہ ان صفحات میں ادا کیا گیا تھا - نثر اور نظم دونوں کے کئی اچھے نمونے جمع کیے گئے ہیں اور ایڈیٹر کی ایک نظم بعنوان ' قہقہہ ' کے سوا کوئی ایسا نہیں جو ذوق پر گراں گزرے - اس نظم کے بھونڈے پن کو زیادہ نمایاں کرنے کے لیے ایک فوٹو شایع کیا گیا ہے جس میں کچھ گمنام حضرات قہقہہ مار رہے ہیں - ہنسی کا انداز اتنا غیر شاعرانہ ہے کہ ان لوگوں پر ہمیں اہل ادارہ کا شبہہ نہیں ہو سکتا —

رسالہ وقت پر شایع ہوتا ہے اور اس لائق ہے کہ ناظرین کے مطالعے میں رہے —　　　　" ناخدا "

ادب لطیف (سالنامہ) -

(مرتبۂ چودھری برکت علی بی-اے و میرزا ادیب بی-اے
سالانہ چندہ تین روپے - اس نمبر کی قیمت ایک روپیہ -
صفحات ۲۰۰ - کاغذ' کتابت و طباعت نہایت عمدہ - ملنے کا پتا
پنجاب بک ڈپو ۵ لوئیر مال لاہور -)

یہ رسالہ کچھہ عرصے سے شایع ہو رہا ہے لیکن اس کی پرورش ایسے ہاتھوں ہوئی کہ یہ اپنی برادری میں بہت جلد سرخرو ہو گیا اور اس کے ثبوت میں یہ نمبر پیش کیا جا سکتا ہے - عموماً سبھی مضامین نثر و نظم اچھے ہیں اور کئی مشاہیر نے اس کی تدوین میں حصہ لیا ہے - غرض کہ ظاہری و معنوی خوبیوں کے لحاظ سے یہ رسالہ قدر دانی کا مستحق ہے- آرٹ کی کئی اچھی تصویروں سے اس ادب پارے کو چار چاند لگ گئے ہیں - ادارے سے ہم یہ ضرور عرض کریں گے کہ خطابات کی تقسیم میں اعتدال سے کام لینا چاہیے - اگر اس کے کہے پر ہم یقین کرلیں تو معلوم یہ ہوگا کہ ہمارے اہل قلم میں ایسے بدنصیب کم ہیں جو علامہ' پروفیسر یا ادیب الملک نہ ہوں —

" نا خدا "

هندستانی اکیڈمی کی چوتھی کانفرنس -

(از ڈاکٹر سید محی الدین قادری 'زور' ایم اے - پی ایچ ڈی (لنڈن)

اس سال جنوری کی بارہ' تیرہ اور چودہ تاریخوں میں ہندستانی اکیڈمی کی چوتھی ادبی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں حصہ لینے کے لیے ایک عرصہ قبل ہی سے ہندی اور اردو کے مشاہیر علم و ادب کو دعوت نامے ارسال کیے گئے تھے - چنانچہ ان دونوں شعبوں کے جلسوں میں متعدد قابل ذکر اصحاب نے شرکت کی - اس کانفرنس کا مقصد یہ تھا کہ ہندی اور اُردو کے اہل علم جمع ہوکر باہمی تبادلۂ خیالات کے علاوہ موجودہ لسانیاتی مسائل پر غور و فکر کریں اور اسی کے ساتھ اس سوال پر بھی غور کریں کہ ہندستانی اکیڈمی کس نہج سے دونوں زبانوں کی ترویج و ترقی میں مدد دے سکتی ہے —

اکیڈمی کی طرف سے اس سے قبل اس قسم کے تین ادبی جلسے منعقد ہوچکے ہیں' لیکن پچھلے چار سال میں اس کو چند در چند مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ان میں سب سے بڑی روپے کی قلت تھی - اس لیے یہ اکیڈمی سنہ ۱۹۳۲ ع کے بعد کوئی اور کانفرنس منعقد نہ کرسکی - مگر اس کے یہ معنے نہیں ہیں کہ اس طویل عرصے میں ارباب اکیڈمی بالکل خاموش ہی رہے - اس کے صدر رائٹ آنریبل ڈاکٹر سرتیج بہادر سپرو نے اپنے خطبۂ افتتاحیہ میں اس کی کارگزاری کے متعلق بالکل صحیح لکھا ہے کہ

> "بایں ہمہ ہم اپنے مقصد سے غافل نہیں رہے - یعنے باوجود ان دقتوں کے اس چار سال میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ برابر جاری رہا اور اس عرصے میں اکیڈمی نے ہندی اور

اُردو کے دو رسالے بھی جاری کیے جو بہ ادارت مولوی اصغر حسین صاحب 'اصغر' اور مسٹر رام چندر ٹنڈن ہر تین ماہ کے بعد شایع ہوتے ہیں - ان میں ملک کے مشہور ادیبوں کے مضامین نکلتے رہتے ہیں اور ان مضامین کے تذکرے اور حوالے دیگر کتب و رسائل میں بھی پائے جاتے ہیں- جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان رسالوں کا پایہ بلند اور ادبی دنیا میں ان کو خاص وقعت حاصل ہے" —

گزشتہ کانفرنس کی صدارت سر شیخ عبدالقادر نے کی تھی اور وہی شعبۂ اردو کے بھی صدر تھے - اس سال اکیڈمی نے صوبۂ بہار کے ماہر قانون مسٹر سچدانند سنہا کو صدارت کے لیے مدعو کیا تھا - سنہا صاحب قانونی اور سیاسی معاملات میں شہرت رکھنے کے علاوہ علم و ادب کے بھی خدمت گزار ہیں - چنانچہ پٹنہ میں انہوں نے ایک عظیم‌الشان کتب خانہ قوم کے نذر کیا ہے - شعبۂ اردو کی صدارت کے لیے انجمن ترقیء اردو کے سرگرم معتمد اور اردو زبان کے بلند پایہ محقق مولوی عبدالحق صاحب کو ' اور شعبۂ ہندی کے لیے جامعۂ الہ آباد کے سابق امیر جامعہ مہامہواپادھیا ڈاکٹر گنگا ناتھہ جھا کو مدعو کیا گیا تھا —

یکشنبہ ۱۲ جنوری کو ساڑھے گیارہ بجے وجیانگرم ہال میور کالج میں کانفرنس کا افتتاحی جلسہ منعقد ہوا - پہلے سر تیج بہادر سپرو نے اردو میں اپنا خطبۂ افتتاحیہ پڑھا - جس میں شرکائے کانفرنس کا خیر مقدم کرنے اور سنہ ۱۹۳۵ ع میں فرانسیسی اکیڈمی کے تیسرے صد سالہ جلسے میں اپنی شرکت ' اور اس اکیڈمی کی اہمیت اور مقبولیت کے تذکرے کے بعد ملک کے دولت مند اصحاب کو اس امر کی طرف متوجہ کیا کہ

جس طرح فرانسیسی اکیڈمی تمام قوم کی فراخ دلی اور فیاضی سے بہرہ ور ہوئی ہے۔ ہندستانی اکیڈمی بھی اس قسم کی امداد کی بنیاد ہی پر مستحکم ہوسکتی ہے —

خطبۂ افتتاحیہ کے بعد مسٹر سنہا نے اپنا خطبۂ صدارت انگریزی زبان میں سنایا کیونکہ انہیں اندیشہ تھا کہ اگر اُردو میں پڑھیں تو ہندی والے ناراض ہوجائیں گے اور ہندی میں پڑھیں تو اُردو والے۔ انہوں نے خود کو دو بیویوں والا ایک ایسا خوش قسمت یا بدقسمت شوہر قرار دیا جس کو دونوں کی خوشی مدنظر تھی اور جو ان دونوں کی خاطر ایک تیسری کے استعمال پر مجبور تھا --

خطبۂ صدارت کے بعد ڈاکٹر تارا چند معتمد اکیڈمی نے ہندی میں اکیڈمی کی کارگزاریوں کی رپورٹ سنائی۔ اگرچہ اس رپورٹ کی عبارت کو سادہ اور سلیس بنانے کی کوشش کی گئی تھی لیکن اکثر جگہ سنسکرت کے ایسے الفاظ بھی شامل ہوگئے تھے جن کا سمجھنا اُردو بولنے والوں کے بس کی بات نہ تھی۔ اس رپورٹ کے ختم پر پنڈت گنگا ناتھ نے اپنا ہندی خطبہ اورمولوی عبدالحق صاحب نے اُردو خطبہ سنایا —

اُردو کے خطبۂ صدارت کا وہ حصہ جس میں موجودہ اداروں کے کام اور طرز روش پر تبصرہ کیا گیا ہے اور مستقبل کے متعلق تجویزیں درج ہیں، نہایت پسندیدگی اور دلچسپی سے سنا گیا۔ مولوی صاحب موصوف نے بعض ایسی پتے کی، باتیں کہی ہیں کہ اہل اردو اور اہل ہندی دونوں اس سے متاثر ہوئے —

ان صدارتی خطبوں کے بعد ہندی اور اردو کا مشترکہ اجلاس شروع ہوا جس میں اردو کے بھی متعدد مضامین پڑھے گئے۔ جن میں حسب

ذیل خاص کر قابل ذکر ہیں —

۱ - مولانا سیماب اکبر آبادی — ہندستان کی تربیت جدید میں اردو شاعری کا حصہ -

۲ - ڈاکٹر سید حسن برنی — شاہ دولہ -

۳ - ڈاکٹر بنارسی پرشاد سکسینہ ایم اے- پی ایچ ڈی لندن - — دور سلطانی کے امرا

۴ - مولوی محمد اجمل خاں شانتی نکیتان بنگال — لاطینی رسم الخط کے ذریعے سے ہندی اور اردو کا ملاپ -

۵ - پنڈت کشن پرشاد کول — اردو اور ہندی زبانیں ۔

اس اجلاس کے ختم پر سر تیج بہادر سپرو کی طرف سے شرکائے مجلس کو عصرانے کی دعوت تھی جو خاص اہتمام اور سلیقے کے سے ترتیب دی گئی تھی - رات میں مشاعرہ بھی ہوا جس کے لیے صوبۂ متحدہ کے اکثر شعرا خاص طور پر مدعو تھے - چنانچہ حضرت سائل دہلوی ' جعفر علی خان اثر لکھنوی ' جوش ملیح آبادی ' سیماب اکبرآبادی ' ظریف لکھنوی ' افسر میرٹھی اور دیگر متعدد شعرا نے اس مشاعرے کو کامیاب بنایا —

دوسرے روز یعنی ۱۳ جنوری کو دن کے تین بجے سے اردو اور ہندی کے شعبوں کے جداگانہ اجلاس منعقد ہوے اردو کے شعبے میں اس اجلاس میں جو مضامین پڑھے گئے ان میں حسب ذیل قابل ذکر ہیں : —

۱ - مولانا عبدالسلام ندوی — اردو شاعری کے جدید انتخابات کی ضرورت -

۲ - مولوی مہیش پرشاد — غالب کے خطوط -

۳ - خان صاحب سید افضل حسین — نفیس لکھنوی -

۴ - آفاق حسین ایم اے قدیم اردو ادب -

تیسرا اجلاس ۱۴ جنوری کو ایک بجے سے شروع ہوا - اس میں بھی اردو کے بعض دلچسپ مضامین اور مقالے سنائے گئے مثلاً :—

۱ - مولانا عبدالماجد دریا بادی　　اردو کا واعظ شاعر

۲ - مولوی نعیم الرحمن ایم اے -　　اردو کے اعراب -

۳ - ڈاکٹر زبید احمد ایم اے - پی ایچ ڈی　　اردو قواعد -

۴ - ڈاکٹر سید محی الدین قادری -　　دکن کی اردو شاعری عہد آصفی میں -

۵ - مسٹر ریاض الحسن ایم اے -　　آرٹ اور حقیقت -

۶ - حاجی غلام محمد صاحب ایم اے -　　ایتھر -

۷ - مقبول احمد صاحب صمدنی -　　خسرو -

اس اجلاس میں مضامین نمبر ۲ اور ۳ کے سلسلے میں بعض دلچسپ اور مفید بحثیں بھی ہوئیں ' جن میں ڈاکٹر صدیقی صاحب اور دیگر اصحاب نے حصہ لیا - آخر میں صدر شعبہ مولوی عبدالحق صاحب نے مقالہ پڑھنے والوں اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا - اس طرح سے اکیڈمی کی چوتھی کانفرنس کی ادبی مصروفیتیں - ختم ہوئیں - سب کے آخر میں ہندستانی اکیڈمی کی کونسل کا اجلاس ہوا —

اکیڈمی کی چوتھی ادبی کانفرنس اس لحاظ سے بے حد کامیاب رہی کہ اس میں اردو اور ہندی کے اکثر مایۂ ناز خدمت گزار شریک تھے اور اس میں بعض نہایت مفید اور دلچسپ مقالے پڑھے گئے - لیکن یہ نہ معلوم ہو سکا کہ ارباب اکیڈمی نے اپنے دعوت نامے میں جن مقاصد کا اعلان کیا تھا کہ —

۱ - موجودہ لسانیاتی مسائل پر غور و فکر کرنا -

۲ - اس سوال پر بھی غور کریں کہ ہندستانی اکیڈمی کس نہج سے دونوں زبانوں کی ترویج و ترقی میں مدد دے سکتی ہے؟ ان کے متعلق کہاں تک کامیابی ہوئی - جہاں تک شعبہ جاتی جلسوں کا تعلق ہے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اہل ہندی نے اپنے شعبے میں جس جوش اور خلوص کے ساتھ حصہ لیا اہل اردو اس سے محروم تھے۔ یوں بھی ہندی سے شغف رکھنے والوں کی تعداد زیادہ تھی - اہل اردو اپنی زبان سے برابر غافل نظر آتے ہیں - اردو شعبے کے صدر مولوی عبدالحق صاحب کی یہ تجویز نہایت اہم اور قابل توجہ ہے کہ اردو سے متعلق جملہ کام کرنے والے پہلے ایک جا جمع ہوکر تبادلۂ خیالات کریں اور پھر اپنی زبان کی ترقی اور اصلاحات کے متعلق ایک ایسا لایحۂ عمل یا پروگرام تیار کریں جس پر عمل کرنا اردو کے ہر خدمت گزار کا فرض اولین ہو -

سائنس

انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ

جس کا مقصد یہ ہے کہ سائنس کے مسائل اور خیالات کو اردو دانوں میں مقبول کیا جائے۔ دنیا میں سائنس کے متعلق جو نئی بحثیں یا ایجادیں اور اختراعیں ہو رہی ہیں یا جو جدید انکشافات وقتاً فوقتاً ہوں گے ان کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے۔ ان تمام مسائل کو حتی الامکان صاف اور سلیس زبان میں بیان کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس سے اردو زبان کی ترقی اور اہل وطن کے خیالات میں روشنی اور وسعت پیدا کرنا مقصود ہے —

رسالے میں متعدد بلاک بھی شایع ہوتے ہیں —

سالانہ چندہ سات روپے سکۂ انگریزی (آٹھ روپے سکۂ عثمانیہ) نمونے کی قیمت ایک روپیہ بارہ آنے سکۂ انگریزی (یا دو روپے سکۂ عثمانیہ) - طلباء کے ساتھ یہ رعایت کی جاتی ہے کہ یہ رسالہ بہ تصدیق پرنسپل صاحب (یا ہیڈ ماسٹر صاحب) انھیں پانچ روپے چار آنے سکۂ انگریزی (چھ روپے سکۂ عثمانیہ) سالانہ چندے میں دیا جاتا ہے —

اُمید ہے کہ اُردو زبان کے بہی خواہ اور علم کے شائق اس کی سرپرستی فرمائیں گے —

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن

VOL. 16 JANUARY 1936 No. 61

The Urdu

The Quarterly Journal

OF

The Anjuman-i-Taraqqi-e-Urdu

EDITED BY

Abdul Haq, B. A., (Alig.)

HONORARY SECRETARY

Anjuman-i-Taraqqi-e-Urdu, Aurangabad, (Deccan).

اُردو

انجمن ترقی اُردو کا سہ ماہی رسالہ

ایڈیٹر

عبدالحق بی۔اے (علیگ)

آنریری سکریٹری

انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (دکن)

اردو

۱ - یہ انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ جنوری ' اپریل ' جولائی اور اکتوبر میں شایع ہوا کرتا ہے —

۲ - یہ خالص ادبی رسالہ ہے جس میں زبان اور ادب کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر بحث ہوتی ہے - حجم کم از کم ڈیڑھ سو صفحے ہوتا ہے —

۳ - قیمت سالانہ محصول ڈاک وغیرہ ملاکر سات روپے سکۂ انگریزی (مع محصول ڈاک وغیرہ آٹھ روپے سکۂ عثمانیہ) —

۴ - تمام خط و کتابت مولوی عبدالحق صاحب بی اے ' آنریری سکریٹری انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (دکن) سے ہونی چاہیے —

انجمن اردو پریس ' اردو باغ اورنگ آباد دکن
میں چھپا اور دفتر انجمن ترقی اُردو سے شایع ہوا

اردو

جلد ۱۶ | اکتوبر سنہ ۱۹۳۶ ع حصہ ۶۴

انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ

اورنگ آباد (دکن)

اردو

فہرست مضامین

بابت اکتوبر سنہ ۱۹۳۶ ع

بچوں کی کتابیں کس قسم کی ہونا چاہئیں

از

ہاجرہ بیگم صاحبہ - ڈپلوما یافتہ طریقہ تعلیم مانٹیسوری

بچوں کے لیے لٹریچر تین قسم کا ہوسکتا ہے - (۱) اس قسم کی کتابیں جو بچوں کو پڑھنا سکھائیں - یعنی جس میں زیادہ غور زبان اور ادب کے لوازمات (Technique) پر کیا جائے اور کسی مقررہ طریقۂ تعلیم کے مطابق جماعت یا عمر کا لحاظ رکھتے ہوئے سلسلہ وار لکھی جائیں - (۲) وہ کتابیں جو بچوں کے ذاتی مطالعے کے لیے ہوں جس کو وہ بغیر استاد یا نگراں کی مدد کے خود بخود شوق سے پڑھیں - (۳) وہ کتابیں جو خود بچوں کی تصنیف کردہ ہوں اور جس میں ان کے اپنے خیالات اور رائے کا اظہار ہو۔

اردو میں ان تینوں قسم کے ادبوں میں سے تیسری قسم کا ادب سب سے کم ہے - جو تھوڑا بہت لکھا جاتا ہے وہ بچوں کے چند رسالوں مثلاً 'پھول اخبار'، 'بچوں کا اخبار' وغیرہ میں شائع ہوتا ہے - ان رسالوں میں بھی مضامین اول تو ہر عمر کے بچوں کے لکھے ہوئے نہیں ہوتے' عموماً بارہ سے سولہ سال کے بچوں کی کوشش ہوتی ہے - دوسرے والدین اور "اڈیٹر صاحب" کی اس میں اصلاح اس درجہ ہوتی ہے کہ اصلی مقصد اس لٹریچر کا یعنی "بچوں کے خیالات کا اظہار خود ان کی اپنی زبان میں"

تقریباً بالکل مفقود ہو جاتا ہے —

دوسری قسم کا لٹریچر یعنی بچوں کی تفریح کے لیے بڑوں کی لکھی ہوئی کتابیں موجود تو ہیں لیکن نہ تو اُن کی تعداد ہی کافی ہے اور نہ وہ بچوں کی کل ضروریات کو ہی پورا کرتی ہیں - 'دارالاشاعت' لاہور پہلے پباشر تھے جنھوں نے اُردو میں بچوں کے لیے کتابیں شایع کرکے ایک بہت بڑی تحریک کی بنیاد ڈالی - اب 'مکتبۂ جامعۂ ملیہ' وغیرہ بھی اس طرف توجہ کر رہے ہیں - محکمۂ تعلیم کی طرف سے کتابیں نکل رہی ہیں - لیکن ان سب کتابوں میں جہاں تک دیکھا گیا ہے جو کتابیں بچوں میں مقبول ہوئیں وہ صرف قصہ کہانیوں کی ہیں - دستکاری' سیاحت' سوانح عمری - عام معلومات پر اکثر کتابیں لکھی گئیں' لیکن کچھ تو ان کی زبان نامانوس اور غیر دلچسپ ہونے کی وجہ سے اور کچھ اس اعتبار سے کہ ہمارے بچوں کی تربیت ناکافی ہے اپنے مقصد کو پورا نہ کرسکیں —

پہلی قسم کی کتابیں یعنی درسی کتابیں حالانکہ ہر شہر اور شہر کے ہر مدرسے اور اسکول میں پڑھی جاتی ہیں. لیکن کسی صورت سے اطمینان بخش نہیں ہیں - اس کی کیا وجوہات ہیں ؟

اول تو یہ کہ بچوں کی تعلیم اور خاص کر ننھے بچوں کی تعلیم کی خصوصی ضروریات پر ہمارے تعلیمی رہنماؤں نے غور ہی نہیں کیا - تعلیم کی ضرورت محسوس ہوئی' جا بجا اسکول اور مدرسے کھولے گئے لیکن "تعلیم کیسی ہو اور کیونکر ہو" یہ مرحلہ یونہی چھوڑ دیا گیا - اس کے بعد جب غلط طریقۂ تعلیم کے برے نتایج سامنے آئے تو اس طرف توجہ کی گئی اور کچھ سرسری ترمیم نصاب تعلیم میں ہوئی - لیکن نہ تو

پڑھانے والوں کی قابلیت کو کچھہ اہمیت دی گئی اور نہ بچوں کی ضروریات کا لحاظ نصاب کے مرتب کرنے میں رکھا گیا - سلسلہ محکمۂ تعلیم کی تجویز پر جو آسان آسان قاعدے اور کتابیں پیش کی گئیں وہ چن لی گئیں اور اسکولوں میں رایج ہوگئیں —

اب محکمۂ تعلیم پر البتہ یہ بات واضح ہوتی جاتی ہے کہ اگر اعلی تعلیم کو سدھارنا ہے تو ابتدائی تعلیم کی بنیاد ضرور پختہ اور صحیح ہونا چاہیے - ہر سال نصاب میں بھی تبدیلی کی جاتی ہے اور استادوں کے ٹریننڈ ہونے پر بھی زور دیا جاتا ہے ' لیکن نہ تو وہ ٹریننگ ہی کچھہ زیادہ وسیع ہوتی ہے اور نہ ان چھوٹی موٹی تبدیلیوں سے کہ ایک کتاب آسان کردی گئی اور ایک میں ایک آدھہ تصویر چھاپ دی ' کچھہ دایمی فایدہ ہوتا ہے —

ہمیں ضرورت اس وقت اس بات کی ہے کہ ایسے اشخاص جو بچوں کی نفسیات سے بخوبی واقف ہیں ' ہندوستانی بچوں کی زندگی سے مانوس ہیں' سائنٹیفک طریقے سے بچوں کی ذہنی کیفیت سمجھنے کی قابلیت رکھتے ہیں ' وہ ہمارے بچوں کے لیے نصاب مرتب کریں اور کتابیں لکھیں اور ساتھہ ساتھہ ٹریننگ بھی استادوں کو ایسی دی جائے کہ وہ ایسے نصاب کا پورا پورا فایدہ اٹھاکر اپنے تجربے کی بنا پر اس میں اصلاح کرتے رہیں - بچوں کا نصاب کیسا ہونا چاہیے ؟ سب سے ضروری بات تو بچے کی عمر اور (intelligence age) (سن استعداد) * کا لحاظ ہے -

---

* ماہرین تعلیم نے بہت سے معیاروں پر جانچ کر بچوں کی استعداد ذہنی کے اوسط کا اندازہ لگایا ہے جو بعض اوقات عمر کے سن و سال سے مختلف ہوتا ہے -

ہمارے بچوں کی تعلیم کی ابھی تک ابتدا ہوتی ہے تو عموماً قاعدۂ بغدادی سے۔ یورپ کے اسکولوں کے تجربے اور وہاں کی کتابیں اور لوازمات تعلیمی (Apparatus) دیکھنے کے بعد مجھے اکثر حیرت ہوتی ہے کہ ہم نے اور ہمارے یہاں کے بچوں نے لکھنا پڑھنا کیوں کر سیکھا ؟ - اردو اور خاص کر عربی کا پڑھ لینا ایک معجزہ سا معلوم ہوتا ہے - چار یا پانچ سال کے بچے کو کاغذ پر بنی ہوئی لکیروں سے کبھی دلچسپی نہیں ہو سکتی - اس کو ایسی چیز چاہیے جس کو وہ ہاتھ میں پکڑ کر دبا سکے، اٹھا کر اس کا وزن معلوم کر سکے، اس کا رنگ پہچانے، سونگھے، غرض کہ ہر ممکن طریقے سے اس کی جانچ کرنے کے بعد اس کو دماغ پر نقش کر لے اور پھر دوسری چیز کی طرف متوجہ ہو - اب بتائیے قاعدۂ بغدادی یا اور کسی ابتدائی قاعدے سے یہ سب باتیں کہاں پوری ہوئیں؟ ابتدائی مدرسوں میں جب یہ محسوس کیا گیا اور اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی گئی تو ایسے نقشے (Reading Charts) بنائے گئے - جن پر کل حروف تہجی مع تصویروں کے چھاپ دیے گئے - تصویروں کی وجہ سے بچوں کی دلچسپی بڑھتی ہے چاہے حروف ان کو یاد رہیں یا نہ رہیں - تصویروں کو وہ ضرور پہچان لیتے ہیں - لیکن ان نقشوں میں بھی چند خامیاں ہیں - اول تو یہ کہ کتاب کی طرح اس میں بھی بچے کی توجہ صرف ایک خاص چیز پر نہیں ہو سکتی - بیس تیس تصویروں میں وہ کس کس کو دیکھے؟ دوسرے تصویریں بھی اکثر بلا سوچے سمجھے بنا دی جاتی ہیں - مثلاً "ڑ سے ھتوڑا" - اب اس میں دھیان 'ڑ' کی آواز پر ہوگا نہ کہ 'ڑ' کی - یا "ق سے قبر" - ظاہر ہے کہ چار سالہ بچے کے قبر پر غور کرنے سے کیا اثر اس کے دماغ پر ہوگا - اس کے علاوہ تصویر کی شکل اور رنگ

کی صحت کا خیال بھی نہیں کیا جاتا - مثلاً نارنگی گلابی سے لے کر سبز رنگ تک بدلی ہوگی —

بہتر یہ ہے کہ پہلی "مشق" لکڑی کے کٹے ہوئے خوبصورت رنگین حروف ہوں - جن میں اس بات کا ضرور دھیان رکھا جائے کہ ہمزہ 'ء' الف 'ا' کے برابر نہ ہو بلکہ کل حروف کا تناسب قایم رہے - دوسرے مشق کارڈ (Letter cards) ہونے چاھئیں - جن میں ایک ایک کارڈ پر ایک ایک حرف ابھرا ہوا یا ریگ مال یا اور کسی کھردرے کاغذ کا ہو - تصویر جو اس کے ہمراہ ہو وہ اول تو روز مرہ کے استعمال کی چیز کی صحیح تصویر ہو، دوسرے جس حرف کے ہمراہ ہو اس کی آواز کی اس میں فوقیت ہو - تیسرے لفظ خود ایسا آسان ہو کہ آگے چل کر بچہ خود اس کو لکھ سکے - مثلاً 'آ' کے ہمراہ آگ - 'ڈ' کے ہمراہ ڈال —

(یہ ظاہر ہے کہ یہ طریقہ اسی وقت کامیاب ہوگا جب کہ صوتیات (Phonetics) کی رو سے حروف کے ناموں کی بجائے آوازیں سکھائی جائیں) —

ایسے کارڈوں میں اوپر لکھی ہوئی سب باتیں آجاتی ہیں - یعنی ایک وقت میں ایک چیز پر غور کرنا، ہاتھ سے کھردرے کاغذ کو چھونا، آنکھ سے رنگ پہچاننا وغیرہ - ایسے کارڈ نہ ہونے کی وجہ سے میں نے اپنے بچوں کے لیے "ا - ب کی بہار" قاعدہ لے کر اس کے ورق کاٹ کر علاحدہ علاحدہ کارڈ بنا لیے ہیں، جن کو ہم استعمال کرتے ہیں —

ان ابتدائی کارڈوں کے علاوہ اور بیسیوں کارڈ ہوسکتے ہیں - مثلاً مرکب آوازوں کے سکھانے کے لیے جیسے 'بھ' کے لیے بھر 'کھ' کے لیے کھر وغیرہ —

اس ابتدائی مشق کے بعد بچہ کتابوں کے لیے تیار ہوگا - ہمارے یہاں کی کتابیں ایک تو دیکھنے میں ایسی ہوتی ہیں کہ یورپ کا کوئی بچہ ہاتھ بھی

نہ اکائی نہایت خراب کاغذ' معمولی لکھائی چھپائی' تصویر کہیں اِکا دکا تو وہ بھی ایسی کالی کالی کہ بچے مجبور ہو کر اس پر لال چاک مل دیتے ہیں - اور اگر مضمون دیکھیے تو وہ بھی ایسا خشک کہ بڑا آدمی بھی گھبرا جاے - مثلاً "پہلی کیاری" میں اس قسم کے فقرے ہیں - "موسیٰ خدا کے بڑے نبی تھے" - "اساڑھ کے مہینے میں فصل بوئی جاتی ہے" - بھلا بتائیے کہ کنڈر گارٹن کے بچے کو آپ نبی کی تعریف کیسے سمجھائیں گے یا شہر کے رہنے والے بچے کو فصل سے کیا دل چسپی ہو سکتی ہے ؟ یا یہ کہ صبح اٹھنے کا یا صاف رہنے کا سبق ہوگا' وہ بھی کہانی کی شکل میں نہیں بلکہ محض نصیحت۔ حالانکہ یہ سب جانتے ہیں کہ محض کتاب پڑھنے سے کسی بچے کو آج تک نصیحت نہیں ہوئی !

ابتدائی کتاب کس قسم کی ہو؟ یہ مشکل سوال ہے لیکن چند موٹے موٹے اصولوں کا خیال رکھا جاے تو حل ہو سکتا ہے - اول تو یہ کہ کتاب کی شکل ایسی پیاری ہونی چاہیے کہ ننھے طالب علم کا دل خواہ مخواہ اس کے چھونے کو چاہے' کاغذ عمدہ اور مضبوط ضرور ہو - اگر ممکن ہو تو اچھی جلد بندھی ہوئی ہو ورنہ سر ورق تو ضرور رنگین اور باتصویر ہو —

ہر جماعت کے لیے بجاے سال بھر کی ایک کتاب ہونے کے تین چھوٹے چھوٹے حصے ہوں - کون نہیں جانتا کہ بچے پرانی چیز سے کس قدر جلد گھبرا جاتے ہیں اور نئی چیز کو کیسی خوشی خوشی لیتے ہیں - دوسرے یہ کہ جماعت کے تیز بچے عموماً پہلی ہی سہ ماہی میں کتاب شروع سے آخر تک پڑھ جاتے ہیں - اور پھر باقی سال انھیں صرف رٹا ہوا سبق زبانی سنانا ہوتا ہے - اگر ہر سہ ماہی پر نئی کتاب انھیں ملے گی تو ان کا دل لگا رہے گا —

اب کتاب کا مضمون لیجیے - اگر ابتدائی حصوں میں یہ خیال

رکھا جائے کہ اول کے سبق حروف کی پوری شکل، اس کے بعد دو حرفوں کا جوڑ پھر تین کا اور پھر مرکب آوازیں اور مشدد الفاظ ہوں تو پڑھانے کے علاوہ لکھانے میں زیادہ آسانی ہوگی - جہاں کہیں صوتیات یا (Montessori) مونٹیسوری طریقے سے سکھایا گیا ہے وہاں یہ دیکھا گیا ہے کہ بچہ پڑھنے سے پہلے لکھنا سیکھتا ہے، کیونکہ اس میں (Synthesis) یعنی مکمل لفظ بحیثیت مجموعی اس کے دماغ میں ہوتا ہے - اور صرف اس کا (analysis) یعنی تجزیہ ایک ایک آواز کرکے لکھنا ہوتا ہے - برخلاف اس کے پڑھنے میں پہلے تجزیہ (analyse) کرکے یعنی ایک ایک آواز کو پہچاننا اور یاد رکھنا ہوتا ہے اور پھر (Synthesis) یعنی مجموعی تصور لفظ کا ذہن نشین کرنا پڑتا ہے - اس لیے شروع کے الفاظ ایسے ہوں جو پڑھنے میں اور لکھنے میں بھی آسان ہوں - مثلاً آم، آگ، دال وغیرہ اور پھر ایسے جن میں ایک حرف کی، شکل مکمل اور ایک کا حصہ ہو - مثلاً تل، پن، تب، جج وغیرہ - جہاں تک ممکن ہو ہر لفظ کی تصویر ہمراہ ہو - مہمل الفاظ سکھانے کی میں قائل نہیں ہوں - شروع میں جب زیر زبر کا استعمال سکھایا جاتا ہے تو بچے طرح طرح کی آوازیں نکال کر بہت ہنستے اور خوش ہوتے ہیں - لیکن اس کے بعد اگر وہ بے معنی الفاظ سیکھنے جائیں تو کبھی لفظ کے معنی سمجھنے کی کوشش نہ کریں گے —

اس طرز کا ایک قاعدہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے لکھا تھا جس میں ایک اور بات کا بھی خیال رکھا گیا تھا - وہ یہ کہ شروع میں ایسا کوئی لفظ نہیں تھا جس میں کہ ع، ح، ط، ذ یا ض کا استعمال ہو - جب ایک حد تک بچے کو سادہ ہجے سے واقفیت ہوجائے تو پھر یہ حروف پیش کیے جاتے ہیں اور سمجھایا جاتا ہے کہ یہ عربی کے حروف ہیں اس لیے صرف

عربی الفاظ میں استعمال ہوتے ہیں - ایک تجویز اور بھی ہے کہ شروع کی کتابوں میں جہاں کہیں ایسے عربی کے حروف استعمال کیے جائیں تو وہ کسی دوسرے رنگ کی سیاہی سے لکھے جائیں —

دوسری منزل ہے جملہ - میں نے دیکھا ہے کہ اکثر کتابوں میں دو حرفی اور سہ حرفی قاعدے کا خیال جملے میں نہیں کیا جاتا - بلکہ چند لفظ سیکھنے کے بعد 'تھا' 'ہیں' 'نہیں' وغیرہ الفاظ ملا کر جملے لکھہ دیے جاتے ہیں - حالانکہ اس سے ہم بآسانی بچ سکتے ہیں' مثلاً دو حرفی الفاظ کے سبق کے بعد اس طرح کے ایک دو جملے بآسانی آسکتے ہیں "یہ آم ہے"، "آپ کو رس دو" اور اسی طرح بتدریج مشکل الفاظ شامل کیے جاسکتے ہیں - ہر سبق کے بعد ایک جملہ ایسا ہونا چاہیے جو بغیر زیر و زبر کے لکھا گیا ہو تاکہ تحت اللفظ پڑھنے کی مشق بڑھے —

بچوں کو زیادہ تر دلچسپی بچوں میں' اور اپنے لباس میں' کھلونوں میں' اپنے گھر یا اسکول کی چیزوں میں ہوتی ہے - بچہ سب سے بڑا (egoist) خود پسند ہوتا ہے - اس کا برابر خیال رکھنا چاہیے "ماں باپ کا کہا مانو" کا فلسفہ بچے کے دماغ میں نہیں آسکتا' جب تک کہ اس فلسفے کی اچھائی اور برائی وہ روز مرہ کے تجربے سے نہ سمجھے - اس قسم کے جملے کتاب میں لکھنا بالکل بے سود ہیں —

خود اپنے علاوہ بچے جن چیزوں سے خوش ہوتے ہیں وہ جانور اور حرکت کرتی ہوئی یا شور کرتی ہوئی چیز مثلاً ریل' تانگہ وغیرہ ہیں - کس کو یاد نہیں کہ مولوی اسمعیل کی کتابوں میں ہر دلعزیز نظم "ریل گاڑی" اور "جگنو" تھی برخلاف اس کے "ایماندار لڑکا" صرف گالیتے تھے - مہینوں کے نام یا اناج کی فصلیں سکھانا کار آمد ضرور ہیں' لیکن ننھے بچوں کے

ذھن میں ایک مہینے کا تصور بھی مشکل سے آسکتا ھے کہاں ایک سال -

یہاں پر میں ایک بات اور کہنا چاھتی ھوں ' وہ یہ کہ تعجب ھے کہ شہری اور دیہاتی لڑکے کی زندگی اس قدر مختلف ھوتے ھوئے بھی کبھی نصاب میں اس کا خیال نہیں رکھا جاتا ' حالانکہ موٹی سی بات ھے کہ ٹرام کا سبق جو دھلی کا بچہ بہت خوش ھوکر پڑھے گا ' دیہاتی بچے کے لیے بالکل بے معنی ھوگا - اسی طرح کھیت میں بیلوں کی دایں چلنا ' کسان کا ڈھینکلی سے پانی دینا شہری بچے کے تصور سے باھر ھے - ایسا کیوں نہ ھو کہ ایک ھی درجے کے لیے اور ایک ھی استعداد کی دو دو کتابیں ھوں جو شہر اور دیہات کا لحاظ کرکے لکھی جائیں ؟

بچوں کی کتابوں میں دو چیزوں کا ھونا ضروری ھے - ایک تو کہانی اور دوسرے نظم - کہانی سے مطلب یہ نہیں کہ راجا رانی ھی کی کہانی ھو بلکہ تذکرہ ھونا چاھیے '- خیالات میں تسلسل ھو جس کو بچہ پڑھ سکے اور سمجھہ سکے - لیکن اس میں آخر میں نصیحت نہ ھو - اگر کہانی کا مقصد کچھہ اچھی بات بتانا ھے تو بالواسطہ (indirect) طور پر بھی بچہ اس کو سمجھہ لے گا یا استاد زبانی سوالات اور اظہار راے سے ذھن نشین کرواسکتا ھے —

ان قاعدوں کے مطابق نظم کا لکھنا ذرا مشکل ھے - کچھہ ایسا دستور پڑگیا ھے کہ اردو نظم میں غیر زبان کے غیر مانوس الفاظ ضرور استعمال ھوتے ھیں اور قافیے کی رعایت میں محاورے کا خیال نہیں کیا جاتا - یہ سچ ھے کہ نظم ھونے کی وجہ سے یعنی محض الفاظ کے توازن سے بچے مشکل الفاظ بھی جلد سیکھہ لیتے ھیں - لیکن پھر بھی بچوں کی نظموں میں فارسی عربی کے الفاظ آئیں تو ایسے کہ کبھی نہ کبھی ان کے کان میں پڑے ھوں '

ورنہ ان کا دل نہیں لگے گا - اقبال کی نظمیں "بچے کے ہاتھہ میں چاقو دیکھہ کر" یا "پہاڑ اور گلہری" جوکہ بظاہر بچوں کے لیے لکھی گئی ہیں، نہ بچے ہی پڑھتے ہیں اور نہ بوڑھے —

درسی کتابوں میں جو نظمیں لکھی جائیں ان کا مقصد اول تو لغت میں اضافہ کرنا ہے، یعنی دلآویز طریقے سے کسی قدر مشکل الفاظ بچوں کو سکھانا - اس کے لیے بیانیہ (descriptive) مضامین مثلاً ندی، میلا، عید کا روز وغیرہ کا بیان لیے جاسکتے ہیں - دوسرا مقصد (literary style) یعنی ادب کی اصطلاحات اور طرز بیان سکھانا ہے، اور اس کے لیے ضروری ہے کہ مسدس، رباعی، غزل، دوہے وغیرہ کے نمونے بھی بچوں کے سامنے پیش کیے جائیں -

قافیہ (rhyme) سے بڑھ کر بچوں کے لیے ترنم (rhythm) یعنی اشعار کا مناسب توازن ضروری ہے - نظم کا ذکر میں تفریح کی کتابوں میں بھی کروں گی -

ایک اور ضروری چیز جس کو عموماً نظر انداز کردیا جاتا ہے، 'مکالمہ' ہے - 'ڈراما' سمجھنے کے لیے پہلے 'مکالمے' سے واقف ہونا چاہیے 'مکالمہ' لکھتے وقت اگر یہ خیال رکھا جائے کہ گفتگو کرنے والے کئی ایک ہوں، تقریر مختصر ہو، اور صحیح (characterisation) سیرت نگاری ہو تو اس قابل ہوگا کہ طالب علم مختلف حصے لے کر پڑھیں یا ایکٹ کریں —

ایک اور کمی جس کو استاد بہت محسوس کرتے ہیں یہ ہے کہ ہم کتابوں کے ذریعے بچے کو بتاتے بہت کچھہ ہیں لیکن اس سے پوچھتے بہت کم ہیں - ضرورت اس کی ہے کہ ہر سبق کے بعد چھوٹی سی مشق ایسی ہو جس کے کرنے میں طالب علم کے دماغ اور حافظے پر بھی زور پڑے اور استاد معلوم کرسکے کہ کس حد تک شاگرد سبق سیکھنے میں کامیاب ہوا - بالکل ابتدائی مدارج میں اس قسم کی مشق ہوسکتی

ہے - (ا) جو تصویریں بنی ہوئی ہیں، ان کا نام بتانا اور لکھنا، (چھوٹے بچوں کے لیے صرف شروع کی آواز بتانا) (۲) جو حروف لکھے ہیں یا لفظ لکھے ہیں، ان کے ساتھ کی تصویر بنانا - (۳) الگ الگ لکھے ہوئے حروف کو جوڑ کر مکمل الفاظ بنانا - (۴) تصویر کے ہمراہ لکھے ہوے نامکمل لفظ کو پورا کرکے لکھنا - (۵) سبق کے متعلق زبانی سوال- (۶) لکھے ہوئے کو پڑھ کر عمل کرنا - مثال کالا قلم دو- لال قلم دو- کالا قلم لے جاؤ- وغیرہ —

اسی طرح درجہ بدرجہ مشکل سوالات کیے جاسکتے ہیں —

تفریح کی کتابیں یا "خاموش - ریڈریں یوں تو ہر مضمون پر ہوسکتی ہیں- لیکن میں صرف (fiction یا "تخیلی ادب" مثلاً افسانہ اور کہانیوں کا ذکر کروں گی- اس کے ذیل میں تین چیزیں آسکتی ہیں- 'ڈراما' 'نظم' اور کہانی-

ڈراما، اب تک بچوں کے لیے لکھا ہی نہیں گیا اور اگر کچھ ہے بھی تو ایسا کہ پڑھنے سے الجھن ہوتی ہے اور ایکٹ کیا نہیں جاسکتا ہے - چند ڈرامے 'دیانت' 'کھیتی' وغیرہ پروفیسر مجیب صاحب نے لکھے ہیں لیکن ایک تو وہ صرف لڑکوں کے لیے ہیں، اور پھر وہ بھی ذرا بڑی عمر کے لڑکوں کے لیے - بالکل ننھے بچوں کے لیے اب تک میں نے کوئی ڈراما نہیں دیکھا - ڈراما لکھتے وقت چند باتوں کا خیال رکھنا چاہیے- ایک تو یہ کہ (action) یعنی حرکت زیادہ ہو اور تقریر نسبتاً کم ہو، مختصر اور ضرورت سے زاید نہ ہو - تیسرے جہاں تک ممکن ہو پورے ڈرامے کو نیچرل ہونا چاہیے- ڈر، خوشی، غصے جیسے جذبات کا اظہار بچے بآسانی کرسکتے ہیں لیکن اس سے زیادہ پیچیدہ خیالات اگر ان کے ذہن میں آ بھی جائیں تو وہ چہرے سے ان کو ظاہر نہیں کرسکتے —

لکھنے والے اگر روز مرہ کے واقعات کو یا کسی ایسی کہانی کو جو عام

ھو ڈرامے کی شکل دیں تو ان کو لمبی چوڑی تشریحی تقریروں کی ضرورت
بھی نہ پڑے گی- دوسرے بولنے والے کئی ایک ھوں جو مل کر واقعات کا
تسلسل قایم رکھیں- کسی ایک هیرو یا هیروین پر اس کا بار نہ پڑے- اسٹیج
اور (presentation) (تمثیل نمائی) کا بھی خیال رکھنا چاھیے ممکن ھو تو ایک
ھی "سیٹ" (سامان) ھر سین میں کام آئے اور لوازمات میں ایسی چیزیں
نہ ھوں جو آسانی سے دستیاب نہ ھوسکیں —

انگریزی 'اوپرا' کی نقل میں ھمارے یہاں بھی ڈرامے میں بات
بات پر گانا ھوتا ھے اور تقریر بھی نثر نہیں ھوتی بلکہ نظم ھوتی ھے
اور یہ اس حد تک کہ بالکل مضحکہ خیز ھو جاتا ھے - انگریزی میں
بچوں کے لیے 'میوزیکل پلیز' بھی ھوتے ھیں اور بہت خوب ھوتے ھیں-
لیکن نہ ھمارے ڈراما نویس میں اور نہ اتالیق میں موسیقی کی
قابلیت اتنی ھوتی ھے کہ اس قسم کے موسیقی آمیز ڈرامے کامیاب ھوں-
ھاں اگر موقع پر کوئی گیت آ جائے تو وہ دوسری بات ھے - مثلاً گاؤں
کا لڑکا مویشی چرا رھا ھے اور دیہاتی زبان میں ایک گیت گاتا ھے -
یا شہر کی گلی ھے اور 'چنا جور والا' اپنی صدا لگاتا ھوا نکلتا ھے- اس
سے البتہ سین کا لطف دو بالا ھو جائے گا - غلط قسم کے ڈرامے کا نمونہ ثمرۂ
دیانت ھے' جس میں ھر شخص اسٹیج پر آتے ھی گا کر اپنی تعریف
کرتا ھے- اس بات کا بھی خیال رکھنا چاھیے کہ ٹریجڈی (المیہ) سے بچوں
کو ھمیشہ الجھن ھوتی ھے- اور وہ قصے کے اختتام پر ھمیشہ نیک انجام
لگانے کی کوشش کرتے ھیں- اس لیے ڈرامے میں اگر خاتمہ بالخیر نہ بھی
ھو تو بھی کسی قسم کے مایل بہ مسرت اشارے ضرور ھونے چاھیئیں- یہ کہنے کی
شاید ضرورت بھی نہیں کہ ڈراما ھمیشہ مختصر اور ایک ایکٹ کا ھو تو بہتر ھے —

نظم

نظم کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اشعار کے وزن اور قافیے کی وجہ سے بچوں کو یاد بہت جلد ہو جاتی ہے - بچوں کے لیے آسان نظمیں شروع میں ایک تو مولوی محمد اسمعیل صاحب نے لکھیں ، اور دوسرے محترمہ محمدی بیگم نے - محمدی بیگم پہلی خاتون تھیں جنھوں نے ننھے بچے کے لیے کتاب نہ ہونے کی کمی کو محسوس کیا - اور کچھہ تو عام لوریاں اور گیت جمع کرکے ترتیب وار شایع کیے اور کچھہ خود بھی بچوں کی سادہ زبان میں چھوٹی چھوٹی نظمیں لکھیں - پھول اخبار کو ترقی ہوئی تو بہت سے شاعروں نے اس طرف توجہ کی - ان میں حفیظ جالندھری نے خاص کر بہت اچھی اور دلپذیر نظمیں لکھیں - آپ کی نظم "لاهور کا چڑیا گھر" تو گویا کلاسک ہے - آپ نے یہ دکھانے کی بھی کامیاب کوشش کی ہے کہ مصرعے کے چھوٹا بڑا کرنے سے مختلف جذبات کے اظہار میں ہم کیسے مدد لے سکتے ہیں - اور بجاے الفاظ کے آوازیں استعمال کرنے سے کتنی آسانی سے صحیح نقشہ کھینچا جاسکتا ہے —

مذاقیہ نظموں کی ہمارے یہاں بہت کمی ہے -

اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ ہندستان میں 'نرسری رائمس' نہیں ہوتی ہیں - ننھے بچوں کو ہم کیا سکھائیں - مجبوراً اسکولوں میں ہم انگریزی گیتوں کا بے تکا ترجمہ کرکے سکھا دیتے ہیں - یہ سچ ہے کہ پرانی تہذیب کے اور لوازمات کے ساتھہ ہم اپنی لوریاں اور کہانیاں بھی بھول گئے ہیں - لیکن اب بھی کوشش کی جائے اور بڑی بوڑھیوں، ماماؤں، کھلائیوں کے چھوٹے چھوٹے فقرے جو وہ بچوں کو سکھاتی ہیں، جمع کیے جائیں تو کافی ذخیرہ ہوسکتا ہے - اگر الگ الگ صوبے میں یہ کام شروع کیا جائے اور گاؤں کے گیت بھی جمع کیے جائیں تو بہت ہی کارآمد ہو —

'نرسری راھیم' کے لیے مرتب اور با معنی ھونا ضروری نہیں ھے اور نہ اس میں ھمیشہ قافیے کا ھی خیال ھوتا ھے - اس کی بنیاد صدیوں پہلے پڑی ھے - اور اس کی اھمیت کچھہ ادب عوام (Folk Lore) کے واقف کار ھی سمجھہ سکتے ھیں - بعض الفاظ اس میں بظاھر مہمل ھوتے ھیں' لیکن چھان بین کرنے سے اکثر الفاظ کے معنی ھم دریافت کرسکتے ھیں - مثلاً ایک فقرہ بچے اکثر کھیل میں کہتے ھیں - "ھاتھی کا تھان - کھیلے چوگان" - بچے اس کا مطلب نہیں سمجھتے لیکن اگر تھان کا مطلب اصطبل اور چوگان کے معنی پولو بتاے جائیں تو مطلب صاف ھو جائے گا —

نظم کے تحت میں ایک اور قسم کی کتاب ھوسکتی ھے - اور وہ (Anthology) یعنی نظموں کا مجموعہ ھے - یوں تو 'پھول باغ' 'تاج گیت' وغیرہ کئی کتابیں ایسی شائع ھو چکی ھیں - جن میں بچوں کے لیے نظمیں جمع کی گئی ھیں' لیکن میرا مطلب ان کتابوں سے نہیں ھے - اگر ھم مشہور شعرا کا کلام اٹھاکر دیکھیں تو اکثر اشعار' بند اور بعض موقع پر پوری پوری نظمیں ایسی ملیں گی جو لکھی تو گئی ھیں بڑے آدمیوں کے لیے لیکن بچے ان کو بخوبی سمجھہ سکتے ھیں اور لطف اٹھا سکتے ھیں - مثلاً حالی کی نظمیں' اکبر کی چند رباعیات' اقبال کی نظموں کے بعض حصے - میر انیس کے کچھہ مرثیے' غالب کی کچھہ نظمیں وغیرہ - ایسے مجموعے میں پہلے شاعر کا نام' سن اور جاے پیدایش اور پھر کوئی دلچسپ مشہور عام قصہ اس کی بابت اور پھر چند چیدہ اشعار دیے جائیں تو یقیناً دل چسپ ھونے کے علاوہ ایک فایدہ یہ بھی ھوگا کہ بچوں کو شعرا کے نام سے کافی واقفیت ھو جائے گی اور جب بعد کو پورا کلام وہ دیکھیں گے تو قدیمی دوست سمجھہ کر ھاتھوں ھاتھہ لیں گے -

کہانی

کہانی کئی قسم کی ہوسکتی ہے ۔ ایک تو خالصاً ادب عوام یعنی وہ قصے کہانیاں جو کہ نسلاً بعد نسل لوگوں میں چلی آتی ہیں۔ ان کی بنیاد اصلیت پر قایم ہوتی ہے - لیکن وہ اصلیت ہزاروں لاکھوں سال پہلے کی ہوگی - دوسرے تاریخی اور نیم تاریخی روایتیں اور قصے جن کی اصلیت ہم کچھہ نہ کچھہ ثابت کرسکتے ہیں - تیسرے وہ کہانی جس کا مقصد دوسرے علوم مثلاً علم نباتات ' حیوانات یا جغرافیے کی تعلیم ہوتی ہے - اس میں واقعات سب زمانے کے ہوتے ہیں لیکن ان کو کہانی کے دلچسپ پیرایے میں سکھایا جاتا ہے ۔ چوتھے فرضی قصے جو خالصاً من گھڑت ہوتے ہیں —

ادب عوام (Folk lore) کا ذخیرہ ہمارے ملک میں بے پایاں ہے ہر صنف کے قصے اور ہر صنف کی نظم ہندوستان میں ملتی ہے اور یہ ذخیرہ ابھی تک سینہ بہ سینہ چلا ہی آتا ہے اور جس کو ایک نظر دیکھنے سے ہر قصے میں تہہ بہ تہہ مختلف نسلی اور تمدنی اثرات آپ معلوم کرسکتے ہیں ۔ ان قصہ کہانیوں کو محفوظ رکھنا نہ صرف بچوں کے لیے ضروری ہے بلکہ قدیمی تاریخ اور پرانے تمدن کے سمجھنے میں بھی ان سے کافی مدد ملتی ہے - اس کے علاوہ یہ مانی ہوئی بات ہے کہ ہر ملک کے لٹریچر کی بنیاد وہاں کا ادب عوام ہے - اس لیے ہندوستان کے ایسے ادبی خزینوں کو جمع کرنے ترتیب دینے سے مصنفین اور تنقید کرنے والے دونوں کو مدد ملے گی —

ان پرانی کہانیوں کی جان ان کی زبان اور وہ پرانے محاورے اور ترکیبیں ہیں جو ہم بڑی بوڑھیوں کی زبانی سنتے آئے ہیں' حالانکہ ان میں زیادہ تر متروک ہیں اور استعمال میں نہیں آتے - لیکن بچے

ماں کی گود سے سنتے سنتے ان سے کافی مانوس ہوجاتے ہیں اور پڑھ کر جو اثر ان جملوں کا ہوتا ہے وہ شاید اور مرصع افسانہ نگاری کا نہ ہو۔ مثال کے طور پر لیجیے "چندے آفتاب چندے ماہتاب"۔ "ماتھے چاند' تھوڑی ستارہ" راجا کی بیٹی کے حسن کی تعریف ہے' جو ترنم اور سادگی اس فقرے میں ہے' جس قدر جامع تصور خوبصورتی اور دلفریبی کا اس فقرے سے بچے کے ذہن میں آئے گا وہ صفحے کے صفحے لکھنے سے بھی نہیں آسکتا۔ "رانی اٹوانٹی کھٹوانٹی لے کر پڑ گئی"۔ غم' غصہ' رانی کا ناز وغیرہ' راجا سے ناز برداری کی امید' عورت کا فریب اور مرد کا ان چلتروں کے مقابلے میں لاچار ہوجانا' یہ سب باتیں کہہ دی گئیں اور بچہ سمجھ گیا۔ پھر اس کے علاوہ ان قصوں کے مقررہ اصول' چھوٹے بچے کا ہمیشہ ہوشیار ہونا' شہزادے کا بہادر ہونا اور ہر امتحان میں پورا اترنا' شہزادی کا خوبصورت ہونا' آخر میں شہزادہ' شہزادی کا مل جانا' غرض کہ ہزاروں ایسے قاعدے ہیں جو ہر صنف کے لیے مقرر ہیں اس کے علاوہ ان کہانیوں میں ایک ہی بات بار بار دہرائی جاتی ہے —

ان سب باتوں کے ہوتے ہوئے کہانیاں یاد بھی جلدی ہوجاتی ہیں۔ اور بچے ان کو تنہائی میں اپنے جی میں دہرایا کرتے ہیں یا ایکٹ کرتے ہیں ان سب باتوں کو دیکھتے ہوئے ضروری ہے کہ قصہ کہانیوں کو بالکل لفظ بلفظ قلمبند کیا جائے اور ایک لفظ بھی گھٹایا یا بڑھایا نہ جائے —

یہ ظاہر ہے کہ ان کہانیوں میں جن اور پری کا ذکر ضرور آئے گا' جادو بہت ہوگا' انسان نہ صرف کبوتر اور مکھی بنے گا بلکہ مرکر زندہ بھی ہو جائے گا۔ ممکن ہے اس پر اعتراض ہو کہ ایسی کہانیاں سن کر بچوں کے دماغ پر خوف طاری ہوتا ہے' ان کے تخیل میں ہر وقت طرح

طرح کی ڈراونی شکلیں رہتی ہیں اور وہ اپنے آس پاس کی چیزوں کی اصلیت بھول کر ان کو (Symbolise) یعنی کسی چیز کے متعلق اس کے موجودہ اوصاف میں اضافہ کر کے خیالی تصور قایم کرنے لگتے ہیں- لیکن ہم کو یہ نہ بھولنا چاہیے کہ بچہ دراصل پیدا ہی بلند تخیل ہوتا ہے - کس نے چھوٹے بچے کو کھیلتے نہیں دیکھا - ایک ایک گڑیا ' ایک ایک لکڑی کا اور پتھر کا تکڑا اس کے لیے جان رکھتا ہے اور گویا اس سے بولتا ہے ' اس کا کہنا مانتا ہے ' اس سے ناراض ہوتا ہے- اس تخیل کو وسیع کرنا بھی ضروری ہے - موجد ایجاد کو پہلے اپنے دماغ میں سوچتا ہے پھر بعد کو وہ مادی شکل اختیار کرتی ہے- ہاں یہ ضروری ہے کہ وہ فرضی دنیا میں ہی محو ہوکر نہ رہ جائے بلکہ حقیقت بھی اپنے درجے سے نہ گرے —

خوف بچے کے دل میں پیدایشی نہیں ہوتا بلکہ ذاتی تجربے کی بنا پر پیدا ہوتا ہے اور بعد کو دوسروں کے تجربے سے اس میں اضافہ ہوتا رہتا ہے- بچہ آگ سے جب ہی ڈرے گا جب اس کا اپنا ہاتھہ جلے گایا وہ دوسرے کا ہاتھہ جلتا دیکھے گا - دیو کا آدمی کو کھاجانا اس کے لیے خوف کی بات نہیں ہے - بچہ بھی روٹی کھاتا ہے ' مٹھائی کھاتا ہے - موت کا ڈر سمجھانے سے ہی اس کی سمجھہ میں آئے گا- آپ دیکھیں گے کہ موت جب ادب عوام میں آتی ہے تو اس کا ذکر بھی سرسری طور پر ہوتا ہے اور ایسا ہونا بھی چاہیے ' مثلاً "جب لڑکا بارا برس کا ہوا تو اس کے ماں باپ مرگئے ' ہمسایوں نے جب تک اس کا روپیہ رہاکھلایا پلایا پھر ہاتھہ پکڑ کر باہر کردیا" یا "مالا میں شہزادی کی جان تھی ' جونہی کنٹلی کے ہاتھہ میں آئی ' شہزادی مرگئی (یا بے جان ہوکر پڑگئی) ' شہزادہ رویا دھویا پھر صبر کر بیٹھہ گیا" - جزیات کی بے جا آراستگی پر زور اسی وقت دیا جاتا ہے جب یہ کہانیاں

تلمبند کی جاتی ھیں - اور لکھنے والا زبان کی سادگی چھوڑ کر اپنی قابلیت کا اظہار کرتا ھے —

رھا یہ سوال کہ کہانی کہنا بچے سے جھوٹ بولنا ھے ؟ تجربے کی بنا پر ھم یہ کہہ سکتے ھیں کہ بچے جھوٹ اور تخیل میں بخوبی تمیز کر سکتے ھیں - خالص تخیل وہ ھے جس کی کوئی حقیقت نہ ھو لیکن بچے کو اس کے ھونے پر پورا یقین ھو - اور جھوٹ وہ کہ بچہ خود اس پر یقین نہ کرے لیکن آپ کو یقین دلانے کی کوشش کرے - اس لیے بچے کو کہانی اور جھوٹ کا فرق سمجھانا مشکل نہیں ھے - غلطی تو یہہ ھوگی کہ خود کہانی کی اصلیت پر یقین نہ کرتے ہوئے ھم بچے کو یقین دلانے کی کوشش کریں - چاھیے یہ کہ جب اس عمر کو بچہ پہنچے کہ آپ دریافت کرے کہ کیا سچ مچ پری ھوتی ھے؟ کیا سچ مچ شہزادی پھول بن گئی؟ تو اس وقت صاف کہہ دینا چاھیے کہ نہیں یہ تو صرف کہانی ھے اور خیال ھے - اس سے بچے کو آپ کے اوپر بھروسا بھی رھے گا اور کہانی کے لطف میں بھی فرق نہیں آئے گا - پھر ایک وقت آئے گا جب یہ سوال ھوگا کہ اگر سچ مچ پری نہیں ھوتی تو کہانی میں کیوں کہتے ھیں - اگر استاد ادب عوام کے لوازمات سے واقف نہیں ھے تو واقعی ایسے سوالات کا جواب دینا مشکل ھے لیکن واقف کار جانتے ھیں کہ چھان بین کرنے سے ھم ھر بات کی معقول تشریح کر سکتے ھیں -

دوسری قسم کی کہانیاں یعنی بڑے بڑے بادشاھوں ' سورماؤں اور ناموروں کی بابت جو مشہور ھوگئے ھیں ' کچھہ تو ھمیں لوگوں کی زبانی سنے سنائے ملیں گی اور کچھہ تاریخ کے مطالعے سے جمع ھو سکتی ھیں - ان قصوں سے مقصد بچوں کا جوش بڑھانا اور حوصلہ بلند کرنا ھے - ساتھہ ھی تاریخ کا مذاق پیدا کرنا ھے - اس لیے ضروری ھے کہ جس تاریخی دور کے متعلق قصہ ھے اس کی چھوٹی چھوٹی جزیات مثلاً لباس '

آرایش' سواری میں بھی اس کے خصایص کا لحاظ رکھیں —

تیسری قسم کی کہانیاں یا تو غیر ممالک کے بچوں کی بابت یا جانوروں وغیرہ کی ہوتی ہیں - اور ان کا مقصد جیسے کہ پہلے کہا جا چکا ہے' کسی خاص علم کا سکھانا یا اس کے سیکھنے میں مدد دینا ہوتا ہے - یہ کہانیاں کار آمد جب ہی ہوں گی کہ بنیادی واقعات بالکل صحیح ہوں - مثلاً چین کے بچوں کی کہانیاں ہیں تو چین کا موسم' چینی بچوں کے مکان' رہنے سہنے کے طریقے یہ سب بالکل صحیح ہوں - اس کے علاوہ کہانی چاہے کیسی ہو اسی طرح جانوروں یا چڑیوں کی کہانیوں میں' ان کی مخصوص خصلتیں' خوراک' بھٹ یا گھونسلے کا بیان یہ بھی تحقیق کرکے لکھنا چاہیے - انگریزی میں اس کے کئی اچھے نمونے ملیں گے - اردو میں نمونے کے طور پر "بن باسی رستم" ہے - یہ ترجمہ ہے لیکن اصلی قصے سے بہت بہتر ہے - اس میں نیولے' سانپ' شکر خورہ چمگادڑ وغیرہ بیسیوں جانوروں کا ذکر ہے - ساتھ ساتھ باغ کا منظر برسات میں' گرمی میں' چاندنی رات میں' بہت ہی خوبی سے پیش کیا گیا ہے - فطرت کے مشاہدے کے علاوہ کہانی کے سلسلے میں چھوٹے چھوٹے سبق مثلاً دشمن کو کمزور نہ جاننا' کمزوروں کی مدد' احسان نافراموشی ایسے دلکش طریقے سے سکھائے ہیں کہ نصیحت نہیں معلوم ہوتی - جغرافیے کے سلسلے میں "تحفۂ مصر و جاپان" کا سلسلہ ہے' لیکن یہ استادوں کے لیے زیادہ مناسب ہے - "بادل کے بچے" بارش' برف' اوس کے متعلق ایک کتاب ہے جس کی زبان ذرا مشکل ہے - لیکن طرز بیان بہت دلکش ہے —

آخری قسم میں محض فرضی قصے ہیں - زیادہ تر کتابیں بچوں کے لیے ایسی ہی لکھی جاتی ہیں - اس میں کئی طرح کے قصے ہو سکتے

ہیں * (adventure Stories) - † (Stories of daily life) - ‡ (School tales) اور محض ہنسی مذاق کی کہانیاں - ہمارے یہاں کے مصنف جب ایسی کتابیں لکھنے بیٹھتے ہیں تو عام طور پر آسان زبان میں کتاب لکھہ دیتے ہیں مگر کسی خاص عمر کے بچے کا خیال ذہن میں نہیں ہوتا ' حالانکہ اگر وہ کتابوں کا ایسا باقاعدہ سلسلہ شایع کریں جسے لکھتے وقت عمر کا لحاظ ہو تو زیادہ مناسب ہوگا - نگراں کو بھی اندازہ رہے گا کہ کون سی کتاب بچے کے ہاتھہ میں دی جائے اور لکھنے والے کو بھی سہولت ہوگی —

(Adventure Stories) میں ہمارے یہاں زیادہ تر ترجمے ہیں - ' گلیور صاحب کی سیاحت ' ' سند باد جہازی ' وغیرہ - ظفر عمر صاحب نے لڑکوں کے لیے " نیلی چھتری " کا سلسلہ لکھا جو ایک حد تک ترجمہ تھا لیکن بہت خوب لکھا ہے - اسکول کے بچوں کی کہانیاں جہاں تک مجھے معلوم ہے لکھی ہی نہیں گئیں - روز مرہ کے واقعات پر اکثر کتابیں جن کا اچھا نمونہ ' دارلاشاعت ' کی کتاب 'شریف بیٹی' اور ' شریف لڑکا ' ہیں ' سادہ زبان میں گھر کی باتیں' نوکروں کی زبان ' بچوں کی دقتیں لکھی ہیں اور پڑھنے والے کو محسوس ہوتا ہے کہ گویا ہمارا ہی تذکرہ ہے —

دن بدن ایسی کتابوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے - لیکن اب بھی ہماری ضروریات کے لیے کافی نہیں ہیں - دوسرے اس کی بہت ضرورت ہے کہ خاص خاص مضامین پر کتابیں لکھی جائیں - ہر عمر کے بچوں کی لیاقت ' زبان اور ان کی دل چسپی کا خیال رکھا جائے - ساتھہ ساتھہ لکھائی چھپائی کاغذ عمدہ ہو' باتصویر ہوں ' تصاویر صحیح' دلفریب اور موزوں ہوں -

---

* سیر و سیاحت جواں مردی و شجاعت کے قصے - † روز مرہ کے قصے - ‡ اسکول کے اور اسکول کے بچوں کے متعلق قصے —

تیسری قسم کا ادب یعنی خود بچوں کی لکھی ہوئی کہانیاں، نظمیں یا مضامین اردو میں بہت کم ملیں گے جو کچھ ہوں گے وہ بچوں کے رسالوں میں۔ لیکن چونکہ ہم تعلیم ہی ایسی دیتے ہیں کہ قلم پکڑتے ہی لکھنے والا اپنی انفرادیت بھول کر بجائے اپنے خیالات کے بزرگوں کے خیالات کی نقل کرنے کی کوشش کرتا ہے - اس کے مضامین میں تازگی و شگفتگی بالکل نہیں رہتی۔ اور جو کچھ ہوتی بھی ہے وہ استاد کی لال پنسل کے نذر ہوجاتی ہے - بچوں کے ذاتی خیالات معلوم کرنے میں والدین بہت مدد کرسکتے ہیں۔ اکثر بچے چھوٹی چھوٹی نظمیں یا کہانیاں لکھتے ہیں، لیکن وہ نکتہ چینی سے اتنا گھبراتے ہیں کہ ان کو چھپا کر اپنے بستے میں رکھ لیتے ہیں یا اپنی ماں کو دکھاتے ہیں - بچوں کی اس خود داری کا ہمیں بہت خیال کرنا چاہیے اور جب تک ننھے مضمون نگار کی اجازت ہمیں نہ مل جائے ان تصانیف کا تذکرہ یا اشاعت نہیں کرنی چاہیے - بلکہ ان کو اخباروں اور دوسرے بچوں کے مضمون دکھاکر اس بات کی ترغیب دینا چاہیے کہ وہ چھپوانے پر راضی ہو جائیں یا اس عمر کے منتظر رہیں جب ان کو اس پر کچھ اعتراض نہ ہو - اسی طرح خطوں میں بعض اوقات بچے اپنے خیالات کا بڑے پیارے انداز میں اظہار کرتے ہیں یہ بھی جمع کیے جاسکتے ہیں- رسالوں میں دلچسپ عنوان دے کر بھی ہم مضامین اکٹھا کرسکتے ہیں - اس کام میں اسکولوں کے استاد بھی ہماری مدد کرسکتے ہیں - لیکن یہ شرط ہونا چاہیے کہ بچوں کی اپنی تصنیف ہو اور کسی قسم کی خارجی مدد اس میں نہ دی جائے —

ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ ماں یا استاد، جس وقت بچے کوئی دلچسپ کھیل کھیل رہے ہوں، خاموشی سے پنسل کاغذ لے کر بیٹھ جائے -

اور ان کی آپس کی باتیں نوٹ کرتا جائے —

اگر اس طرح کا مسالا جمع کرکے اور ترتیب دے کر هم شایع کریں تو اس سے دو فایدے حاصل هوں گے - اول تو یه که دوسرے بچوں کی لکھی هوئی کتاب دیکھه کر حوصله بہت بڑھے گا اور پڑھنے والے بچے کو بھی اس کا شوق هوگا که وہ بھی کچھه لکھے - دوسرے بچوں کے نگران کو ان کے خیالات اور ان کی نفسیات سمجھنے میں بہت مدد ملے گی - تیسرے یه که جب بچوں کے لیے کتاب لکھی جائے گی تو هم اندازہ لگا سکیں گے که کس عمر کے بچے کی زبان کیا هوتی هے اور استعداد کس قدر هوتی هے —

روسی ڈراما

اوس تروف سکی

از
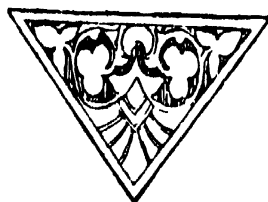
(جناب مولوی محمد مجیب صاحب بی۔اے (آکسن))

فن ڈراما نویسی کا یہ استاد روس کی ان چند ادبی شخصیتوں میں سے تھا جنھیں اطمینان سے زندگی بسر کرنا نصیب ہوا ۔ اور اس کی عمر ایک گہرے دریا کے دھارے کی طرح آہستہ اور خاموش بہتی ہوئی گزر گئی - اس نے شہرت حاصل کی' مگر اس کی کبھی دھوم نہیں مچی' وہ بے چینی کی کیفیتیں جو اس نے اپنے ڈراموں میں انتہائی نفاست اور نکتہ بینی سے پیش کی ہیں - اس کے اپنے روحانی سکون میں کوئی خلل نہیں ڈال سکیں' اور اگر ہم یہ نہ بھی مانیں کہ اس کا دل پیچ و تاب سے بالکل نا آشنا رہا' تو بہرحال اس کی سیرت کا توازن ایسا تھا جس کو درد اور تلخ تجربے بگاڑ نہیں سکے —

وہ ۳۱ مارچ سنہ ۱۸۲۳ ع میں پیدا ہوا - اسکول اور یونیورسٹی میں اس نے کسی غیر معمولی قابلیت کا ثبوت نہیں دیا - دو چار نظمیں جو اس نے اس زمانے میں لکھیں بری نہیں ہیں' مگر اس کے افسانوں کو کسی نے نہیں پوچھا - شاعری اور افسانہ نویسی کے میدانوں میں

طبع آزمائی کرنا اُس نے خود ھی چھوڑ کر ڈراما نویسی کی مشق شروع کی، اور اسی کا اسے سچا شوق بھی تھا - اس کی تعلیم ختم نہیں ہوئی تھی کہ اسے ایک عدالت میں ملازمت مل گئی، جہاں وہ دنیا کے کاروبار کو اپنی آنکھوں سے دیکھہ سکتا تھا، اور یہی مشاھدہ اور معلومات اس کے لیے متحرک ہوئیں اور موضوع فراہم کرتی رھیں -

سنہ ۱۸۴۷ ع میں اس نے "اپنے لوگ ھیں - آپس میں سمجھہ لیں گے" کے عنوان سے ایک مختصر اور نا مکمل منظروں کا مجموعہ ماسکو کے ایک رسالے میں شایع کیا، اور پھر اسے مکمل کرکے اپنے ایک پروفیسر کے مکان پر ایسی محفل میں پڑھ کر سنایا جس میں ماسکو کے بیشتر مشہور ادیب موجود تھے - پروفیسر خود بہت صحیح اور اعلیٰ مذاق رکھتا تھا، اس نے فوراً اوس تروت سکی کی قدر پہچان لی، اور محفل میں کوئی ایسا نہیں تھا جسے یقین نہیں ہوگیا کہ اوس تروف روسی ڈرامے کو ایسی بلندی پر پہنچاے گا جو اسے پہلے کبھی نصیب نہ ہوئی تھی - اور روسی ادب کے باغ میں نئے پھول کھلنے والے ھیں - اوس تروف سکی کا یہ ڈراما شایع تو ہوگیا، لیکن محکمۂ احتساب نے اسے استیج پر دکھانے کی اجازت نہیں دی، پھر بھی نوجوان مصنف نے ھمت نہیں ھاری اور اپنی مشق کو جاری رکھا - "غریب کلواری" "مفلسی عیب نہیں" "پرانی گاڑی میں کیوں بیٹھو" اور "اپنی ھی مرضی پر مت چلو" یکے بعد دیگرے شایع ھوے (۱۸۵۱ - ۱۸۵۴) - ۱۸۵۳ ع میں محکمۂ احتساب سے چلند ترمیموں کے بعد اسے "اپنے لوگ ھیں - آپس میں سمجھہ لیں گے" کو استیج پر دکھانے کی منظوری مل گئی - اس کے بعد سے اوس تروف سکی تقریباً ھر سال ایک نیا ڈراما لکھتا رھا اور وہ تماشائیوں میں اس قدر ھردلعزیز ھوگیا

تھا کہ اس کے ڈرامے تھیٹروں میں دکھائے بھی جاتے رہے۔ تھیٹروں کے مالکوں اور منتظموں سے ناراض ہوکر اس نے کچھہ عرصے تک اپنا خاص طرز چھوڑ دیا اور تاریخی ڈرامے لکھنا شروع کیا، مگر سنہ ۱۸۷۰ ع کے بعد پھر اپنے پرانے ڈھرے پر آگیا، اور آخر تک اسی پر قایم رہا ـــ

۱۸۷۰، ۷۱ میں اوس تروف سکی نے اطالیہ کا سفر کیا - اس ملک کو روسی انشاپرداز باغ ارم سمجھتے آئے تھے، اور اس کی سیر کرنا ان کی معراج تھی، اکثر پر اطالیہ کے مناظر اور آثار قدیمہ نے بہت گہرا اثر کیا اور ان کے دلوں میں ہزاروں نئی امنگیں پیدا کردیں - جرمن شاعر گوئٹے کی زندگی اور فلسفے کا ایک نیا دور اس زمانے سے شروع ہوتا ہے جب وہ اطالیہ گیا اور وہاں کے کھنڈروں سے اس نے انسانیت کی جد و جہد اور سرگزشت کی ایک نئی بصیرت افروز داستان سنی لیکن اوس تروف سکی پر اطالیہ اور اس کے جادو کا مطلق اثر نہیں ہوا - اس نے عمارتیں دیکھیں، سیر کی، مگر سفر کے حالات اور آثار قدیمہ کی تعریف اس نے جس انداز سے اور جن معمولی روز مرہ الفاظ میں کی ہے وہ صاف ظاہر کردیتے ہیں کہ اطالیہ اور یورپ کی قدیم تہذیب اسے گرویدہ نہیں کرسکی - اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ بے حس تھا، یا اطالیہ کے مناظر اور ان کیفیتوں کا جو یہ مناظر پیدا کرتے ہیں پورا حق ادا کرنا اس کی بساط سے باہر تھا - اوس تروف سکی سچا روسی تھا، اور اسے روسی سیرت، طرز معاشرت اور فلسفۂ حیات سے ایسا لگاؤ تھا کہ یورپی تہذیب سے فریفتہ ہونا تو درکنار، اس سے متاثر اور مرعوب ہونے کا بھی کوئی امکان نہیں تھا - اس کا یہ ذہنی رجحان اس کے ڈراموں کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے، اور جب تک اس کا پورا لحاظ کیا جائے، ہم اس کا اصل مطلب اور نقطۂ نظر صحیح

طور پر سمجھہ نہیں سکتے —

اوس تروف سکی نے کل چوالیس ڈرامے لکھے' جو موضوع کے لحاظ سے تین حصوں میں تقسیم کیے جاسکتے ہیں۔ پہلا حصہ وہ ہے جس میں ۱۸۶۱ سے پہلے کا طرز معاشرت اور روسی سیرت کا وہ خاص رنگ جواس معاشرت کا ایک حد تک نتیجہ قرار دیا جاسکتا ہے' دکھایا گیا ہے۔ یہ دور ۱۸۶۰ کے قریب ختم ہوتا ہے۔ اس کے بعد اوس تروف سکی نے حقیقت نگاری ترک کرکے تاریخی ڈرامے لکھنا شروع کیا' اور کوئی دس سال تک زیادہ تر تاریخی سیرتیں اور واقعات اس کا موضوع رہے۔ یہ اس کے ڈراموں کا دوسرا حصہ ہیں۔ ۱۸۷۰ کے بعد پھر وہ معاصر زندگی اور مسائل کی طرف متوجہ ہوا' اور اس کی تصانیف کے تیسرے دور کا پس منظر ۱۸۶۱ کی اصلاحوں کا پیدا کیا ہوا طرز معاشرت اور فلسفۂ حیات ہے اور اس کا موضوع وہ انوکھی طبیعتیں اور نفسیات کے گہرے اور پیچیدہ مسائل ہیں جو اس وقت ظہور میں آئے —

اوس تروف سکی نے جب لکھنے کو قلم اتھایا تو اس کے ذہن پر ان لوگوں کی سیرتیں حاوی تھیں جن سے اس کا ان عدالتوں میں سابقہ پڑا جن میں وہ نوکر تھا' اور سب سے پہلے اس نے انہیں سیرتوں کا عکس بھی اتارا۔ یہ سیرتیں زیادہ تر تاجروں کی تھیں' جن کا ہندوستان کی طرح روس میں بھی عام طور سے سوسائٹی کے بقیہ حصے سے الگ طبقہ تھا' اور ان کا اپنا طرز معاشرت ایک بالکل جداگانہ فلسفۂ حیات تھا۔ یہ طبقہ اب تک انشا پردازوں کی توجہ اور حقیقت نگاروں کی پردہ دری سے بالکل محفوظ رہا تھا' اور جب اوس تروف سکی نے اس کی زندگی پر یکبارگی تیز روشنی ڈالی تو بہت کچھہ نظر آیا جسے دیکھہ کر بھی

یقین کرنا مشکل تھا- اوس تروف سکی کے پہلے ڈرامے پڑھ کر خیال ہوتا ہے کہ اس نے جدت کے شوق میں چلتا رستہ چھوڑ کر ایک نیا ڈھنگ اور تازہ موضوع محض اس نیت سے اختیار کیا کہ لوگوں کی توجہ پہلی طرف جلد منتقل کرلے' اور ان کی ناواقفیت سے فائدہ اٹھا کر اپنے آپ کو تنقید اور اعتراضات سے بچائے رکھے- لیکن اوس تروف سکی کا مقصد اپنے ناظرین اور نقادوں کو حیرت میں ڈالنا نہیں تھا اور اس کے وہ یورپ دوست مداح سمجھ بیٹھے تھے کہ وہ تاجروں کی زندگی اس غرض سے عام نظروں کے سامنے پیش کر رہا ہے کہ ان کی اصلاح کی ترکیبیں سوچی جائیں بہت جلد اپنی غلطی سے آگاہ ہو گئے- اوس تروف سکی کا مقصد صرف زندگی کی تصویریں اور جیتی جاگتی ہستیوں کو ان کے اصل ماحول میں دکھانا تھا' اور اس نے تاجروں کو سب سے پہلے اپنا موضوع اس لیے بنایا کہ کی نظر سب سے پہلے انہیں لوگوں پر پڑی- اس دور کے بعض ڈرامے ایسے ہیں جن میں زمینداروں کی زندگی دکھائی گئی ہے- اور گو وہ انوکھی اور نرالی سیرتیں جو خاص طور پر تاجر طبقے میں پائی جاتی تھیں اوس تروف سکی کے ڈراموں میں آخر تک ملتی ہیں' اس کا ہرگز ارادہ نہ تھا کہ اپنے میدان کو تاجروں کی زندگی تک محدود رکھے-

تاریخی ڈراموں کی تصنیف کے بعد جب اوس تروف سکی نے پھر معاصر حالات کی طرف رجوع کیا تو زندگی کا نقشہ بالکل بدل گیا تھا' کسانوں کے آزاد ہوجانے سے زمینداروں کی آمدنی میں بہت کمی پڑگئی تھی' اور کمی پوری کرنے کے لیے انہیں اپنی نوابی چھوڑ کر کسب معاش کے عام مقابلے میں شریک ہونا پڑا- اسی طرح تاجروں نے بھی نئے حالات دیکھ کر اپنی وضع بدلی اور اپنے کاروبار اور تعلقات کا دائرہ وسیع کیا- یوں ان دونوں طبقوں کے

درمیان جو دیوار حائل تھی وہ گر گئی ' ان کے ایک دوسرے سے مراسم ہو گئے ' آپس میں شادی بیاہ ہونے لگے اور وہ تفریق جسے پہلے دونوں قائم رکھنے پر مصر تھے خود بخود مٹ گئی - اصلاحوں نے انفرادی آزادی اور حقوق میں بھی بہت اضافہ کردیا ' خصوصاً عورتوں کے حقوق میں ' اور پرانا فلسفۂ حیات ' جس نے عورتوں کی زندگی اور دلچسپیوں کو بہت محدود رکھا تھا ' رد کردیا گیا ' مگر اس کے ساتھ ھی بہت سے معمے اور پیچیدگیاں پیدا ہوگئیں جن کے حل کرنے کی کوئی صورت نہ تھی - اس وقت کے اہم معاشرتی اور روحانی مسائل میں سے اوس تروف سکی نے کسی کو نظرانداز نہیں کیا ' اور وہ ہر مسئلے پر اپنی رائے رکھتا تھا ' مگر نصیحت یا کسی خاص خیال کے پرچار کو اپنا فرض نہیں سمجھتا تھا - جس طرح پہلے وہ بغیر اپنی رائے ظاہر کیے اور بغیر کسی کو برا بھلا کہے تاجروں کی معاشرت اور ان بگڑی طبیعتوں کو جو اس معاشرت میں گندے پانی کے کیڑوں کی طرح نمودار ہو رھی تھیں دکھاتا تھا - ویسے ھی اس نے نئے حالات اور نئے ماحول میں جو لوگ اور جو مسائل قابل غور معلوم ہوئے انہیں ہو بہو ناظرین کے سامنے پیش کردیا ' اور اپنی طرف سے ان کی رائے پر اثر ڈالنے کی ذرا بھی کوشش نہیں کی —

اوس تروف سکی کے خیال میں روسی طرز معاشرت کوئی ناپائدار چیز نہیں تھی جس کی طرف زیادہ توجہ کرنا یا جسے زیادہ اہمیت دینا بیکار یا غلط ہو - وہ قوم پرست مگر جدت کے فدائی لوگوں کی طرح صرف اصلاح کی گنجائش نکالنے یا اس کی ضرورت ثابت کرنے کی فکر میں بھی نہیں تھا - اپنے ایک خط میں وہ لکھتا ہے : ' بہتر یہی ہے کہ روسی اپنے ہم شکل اور ہم صفت لوگوں کو اسٹیج پر دیکھ کر خوش ہوں اور اپنی مشاہدے کی خواہش

پوری کریں، مصلح تو انہیں ہمارے علاوہ بھی بہت سے مل جائیں گے، جو کوئی یہ نہ ثابت کرسکے کہ وہ ان کی نسبت اچھی باتیں بھی جانتا ہے اور کہہ سکتا ہے وہ ان کی اصلاح نہیں کرسکتا، صرف توہین کرتا ہے۔"
جیسا کہ اوپر ضمناً بیان ہوا ہے، اوس تروف سکی کو روسی طرز معاشرت اور فلسفۂ حیات سے سچا اور گہرا لگاؤ تھا، اور وہ ان دونوں کی تعظیم کرتا تھا۔ گو اسے روسی طرز معاشرت سے محبت تھی اور وہ ان اصولوں کو مانتا تھا جو صدیوں سے روسی قوم کی رہبری کرتے آئے تھے اس محبت اور عقیدت نے اُسے تعصب، عیب پوشی یا طرفداری پر مائل نہیں کیا۔ اس کی آنکھوں سے نہ وہ داغ دھبے چھپے رہے جو روسی سوسائٹی پر لگ گئے تھے، نہ وہ روگ جنھوں نے روسیوں کو پست اور انسانیت کے فرائض سے غافل کر دیا تھا، اور اس نے اپنے ڈراموں میں صاف گوئی بلکہ عیب نمائی میں کبھی تامل نہیں کیا۔ لیکن اس کا عقیدہ تھا کہ زندگی کی ایک خاص شکل ہونا چاہیے جو قومی سیرت کے مناسب ہو، اور اسی لحاظ سے قدیم روسی طرز معاشرت تشکیل زندگی کی ایک نہایت کامیاب کوشش معلوم ہوئی۔ پیٹر اعظم کی اصلاحوں نے اوس تروف سکی کے زمانے تک قدیم طرز معاشرت اور فلسفۂ حیات بس نام کو باقی چھوڑا تھا، اور وہ بھی تاجروں کے طبقے میں۔ اوس تروف سکی نے اسی کی سرپرستی شروع کی، اور نکتہ چینی کے ساتھ اس کی حمایت بھی کرتا رہا، کیونکہ اپنی برائیوں کے باوجود وہ ایک قدیم مسلک تھا اور روسیوں کے لیے اس پر چلنا بہتر تھا بہ نسبت اس کے کہ وہ اپنی خود داری اور انفرادیت سے ہاتھ دھو کر یورپ کی اندھا دھند تقلید کریں اور بعد کو پچھتائیں۔ اوس تروف سکی اصلاح چاہتا تھا، مگر ایسی نہیں

جو زندگی کو بالکل بے اصول اور بے شغل کردے ' تاریخ اور روایات کا سلسلہ بالکل توڑدے اور سلامت روی بلکہ اخلاق کی تعلیم ھی ناممکن کردے - ۱۸۹۱ کے بعد ' جب پرانی روش ایک بری اس اور تکلیف دہ عادت کی طرح ترک کردی گئی' تو اوس تروف سکی نے کا ماتم نہیں کیا ' نئے حالات سے کوئی نارضامندی نہیں ظاھر کی ' اور نئی فضا کو بلا تکلف اپنی حقیقت نگاری کا موضوع بنالیا - پہلے وہ ذرا تنگ معنوں میں حقیقت نگار تھا ' اور خاص روسی طرز معاشرت کا اپنے ڈراموں میں عکس اتارنا چاھتا تھا ' آخری دور میں وہ وسیع معنوں میں حقیقت نگار بن گیا ' اور بغیر ماحول کی بدلتی ھوئی کیفیتوں کو نظر انداز کیے ' ان مسائل پر بحث کرنے لگا جو انسانی زندگی کا ایک لازمی جزو ھیں ' اور جنھیں قوموں کی تقدیر ٹھیرا یا جائے تو بے جا نہ ھوگا - آخری دور میں نہ کوئی ایسے اصول تھے نہ کوئی ایسا فلسفہ جس کی طرف وہ قلبی یا ذھنی اور اخلاقی گتھیاں سلجھانے کے لیے اشارہ کرتا ' لیکن اس کے ڈرامے دل میں کوئی بے چینی نہیں پیدا کرتے ' اور جہاں اس کی نظر چن چن کر وہ تمام خامیاں نکالتی ھے جو نئے دور کے لوگوں میں تھیں اور اس کی عاقبت اندیشی ان خطروں سے آگاہ کرتی رھتی ھے جن میں نیا طرز معاشرت لوگوں کو ڈال رھا تھا ' وھاں اس کی انسانی ھمدردی کبھی ساتھ نہیں چھوڑتی اور ھر پریشانی اور درد کے لیے وہ کوئی نہ کوئی دوا بھی تجویز کرتا رھتا ھے - اسے نئے دور کے لوگوں سے ' ان سیرتوں سے جو اس وقت ظہور میں آئیں ' اتنی ھی محبت تھی جتنی پہلے دور کے لوگوں سے ' اگرچہ طرز معاشرت اور فلسفہ حیات کی تبدیلی نے دونوں میں زمین آسمان کا فرق پیدا کردیا تھا ؛

اور یہ محبت اس نے ڈرامے آخر وقت تک ظاہر کرتے ہیں —

اوس تروف سکی کے خیالات ' اُس کا اخلاقی اور سماجی فلسفہ اس وجہ سے خاص اہمیت رکھتا ہے کہ اُس کے فن پر اس کا بہت اثر پڑا ۔ کسی ڈرامے کی جب تنقید کی جاتی ہے اور اس کی خوبیوں کا اندازہ لگایا جاتا ہے تو ہم پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ جن مسائل پر اس میں بحث کی گئی ہے ان کی اہمیت کیا ہے ' اور جس طریقے سے وہ پیش کیے گئے ہیں وہ ان کی اہمیت اور مصنف کا مطلب پورے طور پر واضح کر دیتا ہے یا نہیں ۔ سیرتیں اور سیرت کشی ' مکالمے کی دلچسپی اور بقیہ فنی نکات بعد کو دیکھے جاتے ہیں ' مگر اوس تروف سکی کے ڈرامے جانچنے کے لیے ایک اور ہی معیار کی ضرورت ہے ' کیونکہ اس کے ڈراموں میں بظاہر نہ کوئی مقصد نظر آتا ہے نہ کوئی خاص پلاٹ ۔ اگر وہ مصلح ہوتا تو خاص معاشرتی مسائل یا عیبوں کو ڈرامے کی شکل دے کر ناظرین کو حقیقت سے آگاہ کرتا اور انہیں اصلاح پر آمادہ کرتا ' یا وہ شیکسپیر کی طرح انسانی سرگزشت کو جذبات کا کھیل یا تقدیر کا تماشا جان کر سبق آموز اور عبرت انگیز یا پر لطف داستانیں سناتا ۔ اوس تروف سکی کو یہ دونوں طریقے گوارا نہ تھے ' لیکن اس نے جو نرالا طرز اختیار کیا وہ ڈراما نویسی کے عام اسلوب سے ہرگز گرا ہوا نہیں ' اور بعض لحاظ سے بہتر ہی ہے —

اوس تروف سکی مصلح نہیں تھا ' اور جن مسائل پر اس نے جا بجا بحث کی ہے وہ بھی اس طرح سے نہیں پیش کیے گئے ہیں کہ وہ ڈرامے کا مقصد کہے جا سکیں ' کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ زندگی کو تصویر کی طرح چوکھٹے میں رکھنا ' اس کی صورت بگاڑنا ہے ' اور یہ ٹھیک بھی ہے کہ جب ڈراما نویسی کا مقصد کچھ ثابت کرنا یا کوئی خاص نتیجہ نکالنا ہوتا

ہے تو وہ زندگی کی شکل کسی قدر بدل یا بگاڑ دیتا ہے - لیکن اوس ترو‌ف سکی اگر مصلح نہیں تھا، اور اس کے نزدیک ماحول کو درست کرنا اور رکاوٹیں دور کرنا ہی انسان کو بہتر اور زندگی کو زیادہ مفید اور خوش گوار بنانے کی صحیح تدبیر نہیں تھی، تو اس کے معنی یہ نہیں کہ وہ طرز معاشرت اور فلسفۂ حیات کی ہر خصوصیت کو جو پرانی تھی قائم رکھنا چاہتا تھا - اسے ہر طرف عیب نظر آتے تھے، اور زندگی کو سدھارنے اور سنوارنے کی آرزو اس کے دل کو ہر وقت بے تاب رکھتی تھی - اس کے حوصلے وہی تھے جو ہر سچے مصلح کے ہوا کرتے ہیں، صرف طرز عمل جدا تھا، اور وہ اسی چیز کی اصلاح کا قائل تھا جسے عام طور سے مصلح نظر انداز کرتے ہیں یا چھیڑنے کی ہمت نہیں کرتے، یعنی انسان کا دل - اس سے کوئی انکار نہیں کرتا کہ انسان پر جو مصیبتیں آتی ہیں، اور سماجی زندگی میں جو بڑی دشواریاں پیدا ہوتی ہیں وہ صرف دل اور نیت کے بگاڑ سے، اور اگر انسان کا دل اور اس کی نیت درست ہو تو پھر کسی اصلاح کی ضرورت نہیں رہتی - لیکن انسان کے دل کو مخاطب کرنے کی جرأت کسی کو نہیں ہوتی، اور سب زندگی کے خارجی نظام کی مرمت کیا کرتے ہیں، اس لیے کہ وہ بہت زیادہ آسان کام ہے - اوس ترو‌ف سکی نے اصل دشواری سے منہ موڑ کر اپنا کام آسان نہیں کیا، دستہ‌ئف سکی کی طرح وہ بھی مصلح نہیں، ناصح تھا، اس نے ماحول درست کرنے کی ترغیب نہیں دلائی، نیت اور دل کو سدھارنے کی تلقین کی - نصیحت کو آرٹ کا جامہ پہنانا بہت مشکل ہے، کیونکہ اس کوشش میں نصیحت اور آرٹ دونوں کے مضحک بن جانے کا اندیشہ رہتا ہے اوس ترو‌ف سکی ان چند استادوں میں سے ہے جنھوں نے اس کوشش میں نمایاں کامیابی حاصل کی —

دوسری خصوصیت جو اوس تروف سکی کے ڈراموں میں پائی جاتی ہے، یعنی پلاٹ کی عدم موجودگی، وہ بھی اس تامل کا نتیجہ ہے جو ہر سچے آرٹسٹ کو اپنی غرض پوری کرنے کی خاطر زندگی کی صورت بدلنے میں ہوتا ہے - یورپی ڈراما نویسوں کو جو معیار یونانی مصنفوں سے ورثے میں ملا ہے اس میں زندگی کی کشمکش ڈراما کا موضوع مانی گئی ہے، اور اسی کو مدنظر رکھ کر ڈرامے کے پلاٹ کا انتخاب کیا جاتا ہے - یہ کشمکش انسانی سیرت کی خصوصیتیں پیدا کرسکتی ہیں یا معاشرتی رواج اور قانون، یا ایسی قوتیں جو انسان کے قابو سے باہر ہیں مگر اسے زنجیروں کی طرح جکڑے ہوئے ہیں یا طوفان اور بھونچال کی طرح اس کی بے بسی پر ہنستی ہیں - فنی نقطۂ نظر سے بڑی بات یہ ہے کہ ڈرا میں جو کشمکش دکھائی جائے وہ زندگی میں موجود ہو، ڈرامے کی خاطر پیدا نہ کی جائے، لیکن یہ کشمکش ہمیں بہت کم اتنی صاف نظر آتی ہے کہ ہم اس کی تصویر اُتار سکیں - ڈراما نویس اس پر مجبور ہوتا ہے کہ اپنے ادراک اور بصیرت سے دھندھلے نقشوں پر روشنی ڈالے، اور ان کہی باتوں کو کہہ دے - یونانی اصول کے مطابق ڈراما نویس کو اپنا مطلب ادا کرنے کے لیے واقعات کا ایک مکمل مجموعہ تیار کرنا چاہیے، اور جس طرح اسٹیج کا پردہ اٹھنے سے منظر سامنے آتا ہے، اسے تماشائیوں کے سامنے واقعات کا سلسلہ پیش کرکے آہستہ آہستہ ان کے جذبات میں ایسی کیفیت پیدا کرنا چاہیے کہ وہ ڈرامے کے درسی واقعے اور اس حقیقت سے جو اس میں مضمر ہو پورا اثر لے سکیں - اس کے برخلاف وہ طرز ہے جو اوس تروف سکی اور اس کے بعد چیخوف نے اختیار کیا - اس میں کشمکش نام کو بھی نہیں، ڈراما کیفیتوں کا مجموعہ چاہے ہو بھی جائے، واقعات کا

مکمل مجموعہ نہیں ہوتا' اور وہ اس طرح نامکمل چھوڑا جاتا ہے کہ ناظرین جو کچھہ استیج پر دیکھیں اس سے بہت زیادہ ان کا تخیل ڈرامے سے متاثر ہوکر انہیں دکھائے' اور فنی رسموں نے زندگی اور ڈراما کے درمیان جو فرق پیدا کردیا ہے وہ مٹ جائے - اوس تروف سکی کے متعلق ایک روسی نقاد نے لکھا ہے کہ "اس کے ہر ڈرامے کے پلاٹ کی سب سے ممتاز صنف اس کی سادگی ہے ... کسی کسی ڈرامے میں تو خیال ہوتا ہے کہ کچھہ پیش نہیں آتا' ایک منظر کے بعد دوسرا دکھایا جاتا ہے اور سب کے سب ہر خصوصیت سے محروم' معمولی روزمرہ زندگی کا نقشہ ہوتے ہیں - مگر پھر ہم یکبارگی چونک کر اٹھتے ہیں اور ایک دل سوز ڈراما نظروں کے سامنے دیکھتےہیں - واقعی یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہم کو استیج پر اوس تروف سکی کے ڈرامے نہیں دکھائے جاتے بلکہ ہماری زندگی ایک گہرے دریا کی طرح بہتی ہوئی سامنے سے گزرتی ہے اور ہم اس کا گزرنا محسوس بھی نہیں کرتے" - اوس تروف سکی کے کسی ڈرامے کا مقصد بیان کرنا یا یہ بتانا کہ اس میں کیا تعلیم دی گئی ہے مشکل ہوتا ہے' مگر ہمیں اس کا یقین ہوجاتا ہے کہ ہم نے زندگی کا بصیرت افروز مشاہدہ کیا ہے اور ہمارے دل میں وہ درد کچھہ اور شدید ہو جاتا ہے جو سچے علم اور کھری انسانی ہمدردی کی خاص علامت ہے —

ہم عصر روسی نقادوں کو اوس تروف سکی کے ڈراموں کی فنی خصوصیات تو انوکھی یا قابل اعتراض نہیں معلوم ہوئیں' لیکن ان کی نکتہ چینیاں اور تعریفیں دونوں اکثر بے جا ہوتی تھیں' کیونکہ دونوں صورتوں میں ان کی نیت ادبی تنقید نہیں ہوتی تھی - یورپ دوست خیال کے لوگ اوس تروف سکی پر یہ الزام لگاتے رہے کہ وہ قدامت پسند اور روسی قوم کی ذہنی اور معاشرتی اصلاح کا مخالف

ہے، سلاف دوست فرقے نے اسے اپنا ہم خیال اور مغربی تہذیب کا جانی دشمن سمجھ کر اس کے ڈراموں کو اپنے خیالات کی تبلیغ کا ایک ذریعہ فرض کرلیا - اوس تروف سکی کو ہمدردی اسی فرقے سے تھی، اور وہ روسیوں کو اپنی خود داری بھلا کر اور انفرادیت سے ہاتھ دھوکر یورپ کی اندھادھند تقلید کرنے سے روکنا چاہتا تھا، مگر اس کا ہرگز یہ ارادہ نہیں تھا کہ اپنی تصانیف کو سلاف دوست عقیدوں کے پرچار کا ایک ذریعہ بنائے اور جن لوگوں نے اس کے ڈراموں کو یہ معنی پہنائے انہوں نے اس کے ساتھ بہت نا انصافی کی —

اوس تروف سکی کا پہلا موضوع، جیسا کہ بیان ہوچکا ہے، تاجر طبقے کی زندگی تھی، اور اس زندگی کا وہ رخ جس پر عدالت کے ملازم کی حیثیت سے اس کی نظر سب سے پہلے پڑی - عدالتیں اور ہسپتال، یہ دو مقام ایسے ہیں جہاں ہر قوم کی زندگی کا سب سے ناگوار اور قابل اعتراض پہلو ہی دکھائی دیتا ہے، اور اوس تروف سکی نے روسی زندگی کا بھی یہی پہلو دیکھا - چنانچہ "خاندان کی تصویر" میں شرابی، آوارہ اور بدتمیز مردوں اور بدچلن عورتوں کی ایک دن کی کارگزاری سنائی گئی ہے جس سے ان کے باہمی تعلقات اور ان کے ظاہر اور باطن کی حالت معلوم ہو جاتی ہے: مرد دن بھر دوستوں کے ساتھ شراب پیتے پھرا کرتے ہیں، عورتیں اپنی دلچسپی کے لیے دوسرے مردوں سے آشنائی پیدا کرتی ہیں، اور جس طرح مرد انہیں جھوٹ بول کر دھوکا دینا چاہتے ہیں، ویسے ہی وہ بھی انہیں چکمے دیا کرتی ہیں - "اپنے لوگ ہیں - آپس میں لیں گے" تو بدچلنی کی یہ شدت نہیں دکھاتا - لیکن اس میں اور کھولے گئے ہیں جو سماج کے لیے بدچلنی سے کم مضر نہیں کہے جاسکتے - ایک تاجر

اپنے قرض خواہوں کو دھوکا دینے کے لیے دیوالیہ بن جاتا ھے اور ایک کارندے کے ساتھہ اپنی لڑکی کی شادی کرکے کل ملکیت اس کے حوالے کردیتا ھے۔ اس کا کارندہ جو پہلے حلم اور فرماں برداری کی ایک اعلیٰ مثال تھا، دولت پاتے ھی طوطے کی طرح آنکھہ بدل لیتا ھے، اور تاجر کی لڑکی کو بھی دھوکے باز باپ پر ترس نہیں آتا - اس بے ایمان تاجر پر جس نے یوں منہ کی کھائی کچھہ افسوس تو ھوتا ھے؛ ڈرامے کی فضا دل میں جو کیفیت پیدا کرتی ھے، وہ انتہائی مایوسی، بیزاری اور نفرت کی ھوتی ھے؛ لیکن اوس تروف سکی کا یہ ارادہ نہ تھا کہ تاجروں کی طرف سے لوگوں کو بد ظن کرے، یا اس فلسفۂ حیات کی جس کے وہ معتقد تھے اور جو صحیح معنوں میں روسی تھا تحقیر کرے۔ اس نے جو شکایتیں کی تھیں وہ ایک دوست اور ھمدرد کی حیثیت سے، اور اس نے اسی کے بعد ھی ایک دو ڈراموں میں ثابت کردیا کہ وہ اس طبقے کی دل سے قدر کرتا تھا جس میں ایسے لوگ بھی تھے جیسے کہ " اپنے لوگ ھیں - آپس میں سمجھہ لیں گے " کی سیرتیں —

"بڑے منافع کا عہدہ" (۱۸۵۵) اور "لے پالک" (۱۸۵۸) اسی شکایت کو جاری رکھتے ھیں جو " اپنے لوگ ھیں - آپس میں سمجھہ لیں گے " میں شروع کی گئی تھی، پہلا رشوت خور سرکاری ملازموں کا فلسفہ اور طرز عمل بیان کرتا ھے، دوسرا ۱۸۱۱ سے قبل کے ان زمینداروں کا رویہ جو اپنی رعایا کی جان اور عزت کے مالک تھے، دونوں ڈرامے اپنے اپنے رنگ میں بے مثل ھیں۔ دونوں میں کوئی ھیرو نہیں، کوئی مرکزی سیرت یا واقعہ نہیں، اور اسی وجہ سے وہ فضا جو ایک طبقے میں رشوت خوری نے اور دوسری میں بے باک خود مختاری نے پیدا کردی تھی اپنی اصلی صورت میں اور اپنی کل خصوصیات

کے ساتھ نظر آتی ہے، اور جس طرح نیک نیتی اور راست بازی کی خواہشوں اور ارادوں کا اس فضا میں گلا گھونٹا جاتا تھا وہ بھی صاف ظاہر ہوجاتا ہے۔

اسی دور کے دو ڈرامے اور ہیں جن میں زندگی کا تاریک پہلو دکھایا گیا ہے، کو ان میں کسی خاص طبقے کے گمراہوں کی شکایت نہیں۔ "گناہ اور آفتیں سبھی کا حصہ ہیں" ایک غریب مگر محنتی اور نہایت درجہ وفادار اور محبت کیش دکاندار کراس نوف کے گھر کی تباہی کا قصہ ہے۔ کراس نوف نے ایک لڑکی سے شادی کی ہے جس کی پرورش ایک امیر گھرانے میں ہوئی تھی، اور گو وہ ہر طرح سے اس کی دل جوئی کرتا ہے، اس کی بیوی نہ اس کی مطلق قدر کرتی ہے اور نہ اس کی محبت کی۔ اتفاق سے اُسی امیر کا لڑکا جس کے گھر میں کراس نوف کی بیوی نے پرورش پائی تھی، اس شہر میں کسی کام سے آتا ہے، اس عورت کو نہ خود داری کا لحاظ رہتا ہے اور نہ شوہر کے احسانات یاد آتے ہیں، اور وہ اس شریف زادے کے ساتھ بھاگ جانے پر تیار ہوجاتی ہے۔ لیکن انتہائی مکاری اور چال بازی کے باوجود وہ اس میں ناکامیاب ہوتی ہے، اور کراس نوف غصے میں آپے سے باہر ہوکر اسے مار ڈالتا ہے۔ اس ڈرامے میں کراس نوف، اس کی بیوی اور سالی کی سیرتیں، بیوی کی احسان فراموشی اور عیاری، شوہر کی سادہ لوح وفاداری اور بعد کا خونخوار غصہ سب بہت خوبی سے دکھائے گئے ہیں۔ کراس نوف کا اندھا چچا جسے اس کی بیوی کے برتاؤ سے بہت تکلیف پہنچتی ہے، روسی عجز اور انکسار اور قوت اعتقاد کا ایک اچھا نمونہ ہے، اور اس کی گفتگو داستان کو اور بھی عبرت آموز بنا دیتی ہے۔ اسی ڈرامے کی طرح "نازک مقام" روسی زندگی کا تاریک پہلو دکھاتی ہے، اور اس کی مرکزی سیرت ایک کسان ہے جو ایک سرائے کا مالک ہے، اپنا کاروبار بڑھانے

اور مہمانوں کی تعداد میں اضافہ کرانے کے لیے اپنی بیوی کی نیک نامی کا مطلق خیال نہیں کرتا اور اُسے امیر مسافروں اور ہمسایوں کو پھانسنے کے لیے استعمال کرتا ہے - بیوی کو اس میں عذر نہیں' صرف کسان کی بہن اپنی آبرو کا پاس رکھتی ہے' اور اسی کی وجہ سے ڈرامے کے آخر میں کسان کے دل میں کچھ روشنی پہنچتی ہے —

"مفلسی عیب نہیں" اوس تروف سکی کا پہلا ڈراما ہے جس میں اس نے روسی سیرت اور طرز معاشرت کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کی' اور معاصر زندگی سے چند ایسی سیرتیں منتخب کر کے جن کی مثالیں ہر طرف مل سکتی تھیں ایک بصیرت افروز داستان بنائی ہے - تورت سوف ایک دولت مند تاجر ہے جو یورپی وضع پر رہنا چاہتا ہے' اس نے ایک اپنے ہی جیسے امیر کارخانہ دار کورشونوف کو اپنا رہبر بنایا ہے - کورشونوف یورپی تہذیب کی اصلی خوبیوں سے بے بہرہ ہے' صرف چھیلا بننا اور عیاشی کرنا جانتا ہے' اور یہی وہ تورت سوف کو جس میں پہلے سے بہت سے مزاجی عیب موجود تھے سکھادیتا ہے - اسی کورشونوف نے کچھ عرصہ پہلے ماسکو میں تورت سوف کے چھوٹے بھائی لیوبم تورت سوف سے دوستی گانٹھی تھی' جس زمانے میں اسے ورثے میں بہت سا نقد روپیہ ملا تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اسے کیسے صرف کرے - کورشونوف نے اس کا سارا روپیہ خود دھوکے سے حاصل کرلیا یا لٹا دیا' اور جب وہ بالکل کنگال ہو گیا تو اس سے نہایت بے مروتی سے اپنا پیچھا چھڑا لیا - جس وقت ڈرامے کا قصہ شروع ہوتا ہے لیوبم تورت سوف کو اس کے بڑے بھائی نے کورشونوف کے کہنے پر گھر سے نکال دیا ہے' اور وہ مسخرہ پن کی حرکتیں کر کے لوگوں کو ہنساتا ہے اور بھیک مانگ کر گزر کرتا ہے -

اسے رستے سے ہٹاکر کورشونوف ایک قدم اور آگے بڑھتا ہے' اور تورٹ سوف کی لڑکی سے شادی کرنے کی خواہش ظاہر کرتا ہے - تورٹ سوف اس کا ایسا معتقد ہے کہ بیٹی کا اس کے ساتھہ نکاح کردینا اپنی عزت افزائی سمجھتا ہے' گو کورشونوف کی عمر ستّر کے قریب ہے اور اس کی بیٹی نوجوان - خاندان کے لوگ سب اس سے بہت خائف رہتے ہیں' اور شادی کی مخالفت کرنے کی کسی کو بھی ہمت نہیں ہوتی' مگر آخر وقت جب ملگنی کی رسم ادا ہونے والی ہے اور کورشونوف اسی غرض سے تورٹ سوف کے یہاں آیا ہے' لیوبم تورٹ سوف ممانعت کے باوجود گھر میں کورشونوف کی موجودگی میں بھائی کو اپنی ساری سرگزشت سناتا ہے اور آخر میں اس سے التجا کرتا ہے کہ کورشونوف کی بجائے بیٹی کا نکاح اپنے کارندے کے ساتھہ کردے جو مدت سے اس پر عاشق ہے' مفلسی کے باوجود نہایت شریف طبیعت رکھتا ہے' کسی کا احسان نہیں بھولتا اور کسی سے بے مروتی نہیں کرتا - بھائی کی ملتیں بالکل خلاف توقع کار گر ہوتی ہیں' اور ڈراما خوشی کے گیت پر ختم ہوتا ہے' یہ اندیشہ دل میں ضرور باقی رہتا ہے کہ اس کا انجام بالکل برعکس ہوسکتا تھا' بلکہ اس کا برعکس ہونا ہی زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے - تورٹ سوف کی فرعونیت' کورشونوف کی چالیں' اس زندگی کی دل فریبی جس کا لالچ تورٹ سوف کو دیا جارہا تھا' وہ فرماں برداری جو روسی فلسفۂ حیات نے اولاد پر لازم کی تھی' اگر یہ سب مل کر تورٹ سوف کی بیٹی کو قصائی کے کھونٹے سے باندھ دیتیں' اس کی بیوی کا دل توڑ دیتیں اور بھائی سے عمر بھر بھیک منگواتیں تو کوئی تعجب کی بات نہ ہوتی' کیونکہ یوروپی طرز معاشرت یہی فرعونیت' بے مروتی اور بیدردی روسی قوم کو سکھا رہا تھا —

اس ڈرامے میں یورپی اور روسی فلسفۂ حیات کی بے تکی آمیزش کا انجام صرف یہ ہولناک امکانات پیش کرکے نہیں واضح کیا گیا ہے - ڈرامے میں دو چار سین ایسے بھی ہیں جہاں معمولی باتوں میں دونوں کا فرق ظاہر ہوجاتا ہے' اور ساتھہ ہی روسی طرز معاشرت اور ذہنیت کی فضیلتیں بھی دکھائی جاتی ہیں - تورت سوف کی بیوی بہت ملنسار خوش مزاج ' مساوات پسند اور صاحب ذوق ہے - ایک منظر ہے جس میں اس نے گھر میں محلے کی بہت سی لڑکیوں اور لڑکوں کو جمع کیا ہے ' سب گا رہے ہیں اور نہایت بے تکلفی سے مگر انتہائی شائستگی کے ساتھہ گفتگو اور ہنسی مذاق ہو رہا ہے ' کہ یکبارگی تورت سوف اپنے مرشد کورشونوف کو لےکر پہنچتا ہے - کورشونوف کے آتے ہی جلسے کی فضا بالکل بدل جاتی ہے جو لوگ شوق سے گا رہے تھے ان سے روپے کے بدلے گانے کو کہا جاتا ہے ' اور جہاں پہلے بے تکلفی اور معصومیت تھی وہاں کورشونوف کی ذات شہوت کی بو پھیلا دیتی ہے - یہ بری تاثیر روسی سیرت میں دولت اور دولت پرستی نے پیدا کی ہے ' اور لیوبم تورت سوف بالکل ٹھیک کہتا ہے کہ " ارے ' اگر میں غریب ہوتا تو ممکن ہے آدمی انسان بھی ہو جاتا مفلسی عیب نہیں ہے " —

اس کے بعد کا ڈراما ' " اپنی ہی مرضی پر مت چلو " (۱۸۵۴) بے اصول زندگی بسر کرنے کی زیادہ صاف طور پر مخالفت کرتا ہے - اوس تروف سکی نے اپنا خاص طرز چھوڑ کر نصیحت یا تنبیہ نہیں کی ہے ' نہ زندگی کی عام روش یا عام انسانی تجربے کے باہر قدم رکھا ہے ' اور ایسے حالات کو اپنا موضوع بنایا ہے جو روز مرہ پیش آتے ہیں - ایک میاں بیوی ہیں جن کی شادی کو صرف ایک ہی سال گزرا ہے اور جلنوں نے محبت

کی بنا پر شادی کی تھی - ان کے درمیان ناچاقی ہو جاتی ہے ' جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اپنی محبت کے باوجود دونوں ایک دوسرے سے بیزار ہو جاتے ہیں - شوہر اپنا غم غلط کرنے کے لیے گھر میں آنا تقریباً ترک کر دیتا ہے ' اور بیوی اس کی سرد مہری دیکھ کر ایسی برداشتہ خاطر ہو جاتی ہے کہ میکے واپس جانے کی غرض سے گھر سے بھاگ نکلتی ہے - شوہر سے ناچاقی کی خبر اس کے بوڑھے ماں باپ تک پہنچ جاتی ہے ' وہ اسے سمجھانے کے لیے آتے ہیں اور اتفاق سے ان کی رستے ہی میں ملاقات ہو جاتی ہے - اس موقعے پر ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس نوجوان عورت نے ماں باپ کی رضامندی کے بغیر شادی کی تھی ' اور اس خوف سے کہ کہیں وہ مخالفت نہ کریں اپنے محبوب کے ساتھ چھپ کر بھاگ گئی - اس کے ماں باپ ناراض نہیں ہوئے ' گو اس کے رویے سے انہیں صدمہ بہت پہنچا لیکن جس طریقے پر شادی ہوئی تھی ویسی ہی بعد کی زندگی رہی - فرائض کا احترام اور ذمہ داریوں کا احساس نہ ہونے کی وجہ سے ذراسی ناچاقی پر میاں بیوی ایک دوسرے سے بگڑ گئے اور وہ نازک رشتہ جو جوانی کی محبت اور جوش نے قائم کیا تھا ٹوٹ گیا - بیوی کے ماں باپ نے یہ رشتہ پھر قائم کر دیا ' اور اپنی نصیحتوں سے وہ تلون جو جوانی کے جذبات میں ہوتا ہے دور کر کے ان کے رشتے کو استوار کر دیا —

" مفلسی عیب نہیں " میں لیوبیچ تورت سوف اور " اپنی ہی مرضی پر مت چلو " میں نوجوان بیوی کے ماں باپ جس فلسفۂ حیات کے معتقد ہیں اس کا " پرانی گاڑی میں مت بیٹھو " اور " مزاج موافق نہ تھے " میں یوروپی طرز معاشرت اور آئین زندگی سے مقابلہ کیا گیا ہے - " پرانی گاڑی میں میں مت بیٹھو " ایک مالدار تاجر کی لڑکی اندوتیا کی

سرگزشت بیان کرتا ہے جسے "مہذب" بننے کا بہت شوق ہے اور اسی شوق میں وہ ایک فوجی افسر سے شادی کرنا چاہتی ہے - اس کی پھوپھی، جس نے کسی یورپی ڈھنگ کے اسکول میں تعلیم پائی تھی اور تاجروں کے رہن سہن کو نہایت وحشیانہ سمجھتی ہے اپنی ناتجربہ کار بھتیجی کو اور بھی اکساتی ہے، اور اسی کی مدد سے وہ فوجی افسر کے ساتھ فرار ہوجاتی ہے کیونکہ باپ کی منظوری ملنے کی اسے کوئی توقع نہیں۔ لیکن پہلی ہی منزل پر فوجی افسر کو معلوم ہوجاتا ہے کہ تاجر کی بیٹی کے ساتھ تاجر کی دولت کی کوئی امید نہیں، اور چونکہ اسے دولت ہی کی فکر تھی اس وجہ سے وہ محبت جس کا وہ بڑی لسانی اور گرمی کے ساتھ اظہار کیا کرتا تھا سرد پڑگئی، اور اندوتیا کو جب اپنے عاشق کی اصلی نیت معلوم ہوئی تو وہ اپنے باپ کے پاس بھاگ آئی - اس ڈرامے میں روس کے دونوں طبقوں کی کمزوریاں دکھائی گئی ہیں - تاجر شادی بیاہ کے معاملے میں اپنی اولاد کی خواہشوں کا لحاظ نہیں کرتے اور نہ انہیں اتنی آزادی دیتے ہیں کہ وہ اپنی خواہشیں ظاہر کرسکیں یا تجربے کے ذریعے سے صحیح اور غلط میں تمیز کرسکیں - تعلیم یافتہ طبقے کے لوگوں میں آزادی ہے اور سلامت روی کے واسطے جتنے تجربے کی ضرورت ہوتی ہے وہ بھی انہیں حاصل ہے، لیکن ان کے اوچھے فلسفۂ حیات میں عاقبت اندیشی کو کوئی دخل نہیں، وہ تہذیب کے معنی عیش و آرام سے زندگی بسر کرنا سمجھتے ہیں اور انہیں بس اسی کی فکر رہتی ہے کہ ایسی زندگی کے لیے جس سرمایے کی ضرورت ہے وہ فراہم کریں، چاہے اس کوشش میں کتنا ہی جھوٹ بولنا اور دھوکا دینا پڑے - اندوتیا اور اس کی پھوپھی قدیم روسی طرز معاشرت کے ان نمائندوں کی مثالیں ہیں جو تہذیب کے صحیح

مفہوم سے واقف نہیں ہیں، نہ اپنے آئین کی قدر کرسکتی ہیں نہ دوسروں کے' اور اسی قسم کے لوگوں کی گمراہی اور ان کی زندگیوں کی تباہی پر اوس تروف سکی کو سب سے زیادہ رنج ہوتا تھا۔ اس قسم کی شادیاں جن کی آرزو اور ناکامی اس ڈرامے میں دکھائی گئی ہے روس میں بہت ہوا کرتی تھیں، اور اسی طرح لوگ ایک دوسرے کی اصل نیت کو معلوم کرکے پشیمان بھی ہوا کرتے تھے۔ اوس تروف سکی نے وہ غلط فہمی جس میں مبتلا ہوکر نوجوان مرد اور عورتیں اپنی زندگی دوبھر کرلیتی تھیں بتادی اور سیرت اور تربیت کی وجہ سے تاجر اور "مہذب" طبقے کے لوگوں میں جو آگ پانی کی سی عداوت ہونا لازمی تھی اس کی اصلیت بھی ظاہر کردی۔ 'مزاج موافق نہ تھے" اسی حقیقت کو دوسرے لباس میں دکھاتا ہے۔ ایک نوجوان تاجر کی بیوہ مہذب کہلانے کے لالچ میں ایک رئیس زادے سے شادی کرلیتی ہے جس کے پاس ریاست کے حوصلوں کے سوا کچھ بھی نہیں اور جس نے صرف اپنا قرضہ ادا کرنے اور ٹھاٹھ سے رہنے کی نیت سے شادی کی ہے۔ تاجر کی بیوہ کو چند روز ہی میں معلوم ہوجاتا ہے کہ مہذب بننے کے لیے اسے اپنا سارا روپیہ شوہر اور مہذب زندگی کی لوازمات کے نذر کرنا ہوگا، اور وہ اپنے شوہر کو چھوڑ کر میکے میں جا بیٹھتی ہے۔ ایسے ہی حادثوں کو لوگ مزاج کی ناموافقت سے تعبیر کرتے ہیں ــ

فنی کمال اور شاعرانہ خوبیوں کے اعتبار سے اوس تروف سکی کے پہلے دور کے کارنامے "غریب کلواری" اور "طوفان" ہیں "غریب کلواری" ایک مفلس مگر تعلیم یافتہ اور حوصلہ مند لڑکی کے بیاہے جانے کی داستان ہے۔ لڑکی کی ماں ایک کمزور اعصاب کی اور کم عقل عورت ہے جو ہر

وقت پریشان اور مشیر اور مددگار کی تلاش میں رہتی ہے' اور وہ لڑکی کے لیے سہارا ہونے کے بجاے الٹی اس کے لیے ایک مصیبت ہو جاتی ہے۔ لڑکی صورت کی اچھی ہے' اور تین نوجوان اس سے شادی کرنے کے امیدوار ہیں۔ ان میں سے ایک ایسا جھینپو اور دبو ہے کہ اپنی خواہش زبان سے ادا نہیں کر سکتا۔ اور وہ محض ایک دوسرے کو زچ اور مات کرنے کی فکر میں ہیں' لڑکی سے بے دریغ جھوٹ بولتے ہیں' اور اس کی روحانی تکلیف کا مطلق پاس لحاظ نہیں کرتے۔ آخر میں ایک سرکاری ملازم شادی کے آرزو مندوں میں نمودار ہوتا ہے' اور لڑکی کو مجبوراً اس سے شادی کرنا پڑتی ہے کیونکہ زیادہ انتظار کرنے میں بھوکوں مرنے کا اندیشہ ہے۔ سرکاری ملازم خود پرست' بے تمیز اور بد چلن ہے' اس سے پہلے وہ کئی لڑکیوں کو دھوکا دے کر ان کی زندگی برباد کر چکا ہے' لیکن اس کے پاس کھانے پینے کو ہے' اور یہ صفت ان نوجوانوں میں سے کسی میں نہیں جو لڑکی کی نظر میں تھے۔ بھوک سے بچنے کے لیے ایک شریف لڑکی کو اپنی انسانیت اور انسانیت کے حوصلوں سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ اوس تروف سکی نے زندگی کی یہ دل سوز تصویر دکھاتے ہوئے ناظرین پر کسی طرح کا اثر ڈالنے کی تدبیر نہیں کی ہے' ان حالات کی سچائی اور عمومیت خود دل کو تڑپاتی ہے اور آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں —

"طوفان" میں یہی تباہی دوسرے اور زیادہ پر تاثیر رنگ میں نظر آتی ہے۔ قدیم روسی طرز معاشرت نے جو انوکھی صورتیں پیدا کی تھیں اور جن میں سے بعض کا اوس تروف سکی نے اس سے پہلے کے ڈراموں میں عکس اتارا تھا ان سب کی تصویریں "طوفان' میں

ڈراما نویس کا منجھا ہوا قلم ایسی نفاست سے کھینچتا ہے جو پہلی کوششوں میں نہیں پائی جاتی ۔ ڈکوئنی اور کابانووا فرعونیت' بے باکانہ خود مختاری اور خودرائی کے مجسمے ہیں' کابانووا کا بیٹا کابانوف اس بودے پن کا مثالی نمونہ ہے جو والدین کی سختی اور تند مزاجی اولاد میں پیدا کر دیتی ہے : ایک ستر برس کی بڑھیا' جو لوگوں کو عذاب سے ڈراتی پھرتی ہے' اور نوجوان عورتوں کو حکم دیتی ہے کہ خدا سے دعا مانگیں کہ ان سے حسن کی دین واپس لے لے' اس مذہبیت کا عبرت آموز نمونہ ہے جس کا کل سرمایہ عذاب کا خوف ہوتا ہے: کولیگن' ایک مستری' اس خبط میں مبتلا ہے کہ اس نے ایک دائم الحرکت کل ایجاد کرلی ہے' بس ایک پہیے کی کسر اور ہے' بورس گریگوروویچ' ڈکوئنی کا ایک رشتہ دار' ان روسیوں کی ایک مثال ہے جن کے ذہن اور طبیعت میں یورپی تہذیب نے ہر طرح کی نفاست اور شائستگی پیدا کر دی' مگر انہیں ہمت اور ارادے کی قوت سے بالکل محروم کردیا - ڈرامے کی مرکزی سیرتیں کابانوف کی بہن واروورا اور اس کی بیوی کاترینا ہیں - واروورا اپنے بھائی کی طرح ماں سے ڈرتی ہے' اور بلی کی طرح چھپ کر دل کے ارمان پورے کرتی ہے - یوں وہ بزرگوں کے تحکم اور ان کی روکھی اخلاقی تعلیم کو برداشت کرلیتی ہے' کاترینا کو نہ اپنی طبیعت پر اتنا قابو ہے نہ سخت کلامی اور جبر کا جھوٹ اور دھوکے بازی سے جواب دینے کی عادت' اور اسی کی سرگذشت اس ڈرامے کا موضوع ہے - شادی سے پہلے اس نے پرندوں کی سی آزاد اور بے فکر زندگی بسر کی تھی' دل کی ہر خواہش پوری کرتی اور من کی ہر موج کے ساتھ بہہ جاتی - اس کا دل بھی پرندوں کا سا صاف اور معصوم ہے' اس کا تخیل اور تصور شاعرانہ امنگوں سے چور رہتا ہے' آنکھیں آنسو بہانے پر تیار رہتی ہیں' اور عقل

گم ہوجانے پر - اسی وجہ سے وہ کسی قسم کی بے التفاتی یا سرد مہری نہیں سہہ سکتی، مگر قسمت نے اسے ایسا شوہر دیا جس کی محبت اس کو تسلی نہیں دے سکتی، اور ایسی ساس جو ہر وقت اس کے دل کو دکھانا اور تڑپانا اپنا خاص فرض سمجھتی ہے - شوہر اور ساس کی طرف سے بالکل مایوس ہونے کے باوجود کاترینا خاندانی زندگی کے اصولوں کی خلاف ورزی نہیں کرنا چاہتی- لیکن جب اس کی بوریس گریگورووچ سے ملاقات ہوتی ہے اور بوریس کی شرافت اور شائستگی، اور اس کے خوبصورت چہرے کا مایوسانہ انداز اور کمہلائی ہوئی رنگت اسے بتادیتی کہ وہ بھی اسی غم میں مبتلا ہے اور اسے بھی نا قدردانی ہلاک کر رہی ہے تو وہ ہم جنسی کا حق ادا کرنے سے انکار نہیں کرسکتی - بوریس کی محبت کا جذبہ جس قدر قوی ہوتا جاتا ہے اسی قدر کاترینا کا ضمیر روکتا ٹوکتا ہے، مگر آخر میں محبت اسے بے بس کردیتی ہے، اور واروارا کے مشورے پر، اور اسی کی مدد سے وہ چھپ کر بوریس سے ملاقات کرتی ہے- واروارا کا بھی ایک یار ہے، دونوں روز ملتے ہیں اور اپنا راز چھپانے میں اس قدر کامیاب رہے ہیں کہ دوسروں کو ان پر کبھی شبہ نہیں ہوتا - واروارا کا جذبہ محض جسمانی ہے، کیونکہ جسمانی خواہشوں کے سوا اور کچھہ ماحول کی ناموزونیت اور طبیعت کی افتاد نے اس کی سیرت میں باقی نہیں رہنے دیا - ان خواہشوں کو جائز طور پر پورا کرنے کی اسے اجازت نہیں، اس لیے وہ بے دھڑک انہیں چھپ کر پورا کرتی ہے، اور کاترینا سے اس کا اقرار کرتے ہوئے اسے شرم بھی نہیں آتی- کاترینا لذت پرست نہیں ہے، نیک زندگی کا دل میں بہت لحاظ رکھتی ہے - وہی چوری جو واروارا کا معمول بن گئی تھی پہلے تجربے کے بعد کاترینا کے ضمیر کو ایسا پریشان کردیتی ہے کہ وہ ندامت کے جوش میں اپنے شوہر سے ساس کی موجودگی میں جرم کا اقبال کرتی

ہے، اور عشق اور معشوق کو خیرباد کہہ کر دریا میں کود پڑتی ہے - اسی رات کو بڑا زبردست طوفان آتا ہے، اندھیرے میں بہت دیر تک سب اسے اِدھر اُدھر تلاش کرتے رہتے ہیں، اور آخر میں اس کی لاش دریا کے کنارے پر ملتی ہے -

اوس تروف سکی نے ۱۸۵۶ میں قوم پرست عاملوں کی ایک جماعت کے ساتھ وولگا کی وادی میں سیاحی کی، اور وہیں "طوفان" کا موضوع اس کے خیال میں آیا - کاتریدا کے جذبات کی شدید جنگ کے لیے دریا کے طوفان زدہ کناروں سے زیادہ موزوں پس منظر تصور کرنا دشوار، اور درامے کے آخر میں کالی گھٹاؤں کی کڑک اور گرج جو کاتریدا کے دل کو دہلا دیتی ہے اس روحانی ہنگامے کی ایک آسمانی صدائے بازگشت معلوم ہوتی ہے جس میں جذبات کی خانہ جنگی اور آرزوؤں کا تلاطم انسان کو مبتلا کردیتا ہے - لیکن اس طوفان کی اور تشریحیں بھی ہوسکتی ہیں، کاتریدا کی دہشت زدگی اور دردناک موت کو ہر شخص اپنے مذاق اور تجربے اور تعصبات کے لحاظ سے معنی پہناسکتا ہے، وہ عشق کا انجام بھی قرار دی جاسکتی ہے - زمانے کی ناسازگاری سے ایک فریب حوصلوں بھرے دل کا ٹوٹنا بھی، "ناصح" چاہے تو اسے اخلاقی آئین کی خلاف ورزی کی سزا بھی بتا سکتا ہے - اوس تروف سکی کا مقصد صرف ایک منظر زندگی کی ایک تصویر دکھانا تھا —

"طوفان" کے بعد اوس تروف سکی نے کئی درامے لکھے، بعض فرحیہ، بعض المیہ، لیکن "طوفان" کا مرتبہ اس دور کے کسی اور درامے کو حاصل نہیں، اور کوئی تعجب نہیں کہ لوگ یہ سمجھے کہ اوس تروف سکی کا فن انتہا کو پہنچ چکا ہے - بہرحال کچھ نقادوں کی سرد مہری، کچھ تھیٹروں کے منتظموں اور مالکوں کے برتاؤ نے اوس تروف سکی کو تاریخی ڈرامے لکھنے

کی طرف مائل کردیا - شروع کے ڈراموں میں اوس تروف سکی کا یہ مقصد نہیں کہ وہ استیج پر دکھائے جائیں ' وہ صرف روسی تاریخ کے چند واقعات پیس کرنا چاھتا تھا ' مگر ڈرامے کے طرز سے گریز کرنے کی خواهش کے باوجود اوس تروف سکی اپنی طبیعت اور خاص رجحان پر قابو نہ لا سکا ' اور اس کا ڈراما " وسی لی سا مے لنت یف نا " اس فن کا ایک اعلیٰ نمونہ ھے اور استیج پر دکھانے کے واسطے بہت موزوں ھے - اس کی داستان میں کچھہ یونانی المیہ ڈراموں اور کچھہ شیکسپیر کی تصنیف کا رنگ اور ڈھنگ نظر آتا ھے کیونکہ وہ تاریخی واقعات جو اس میں بیان کیے گئے ھیں ان قصوں سے بہت ملتے جلتے ھیں جنھیں یونانی ڈراما نویسوں اور شیکسپیر نے اپنا موضوع بنایا —

۱۸۶۸ سے اوس تروف سکی کی تصانیف کا تیسرا دور شروع ھوتا ھے جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ھے ' ۱۸۶۱ کی اصلاحوں کے بعد روسی معاشرت اور اس کے ساتھہ روسی فلسفۂ زندگی نے ایک پلٹا کھایا ' اور جہاں پہلے چند ادارے اور رواج اصلاح طلب تھے یا چند رسمیں اور تعصبات ترک کردینے کا سوال تھا ' وھاں اب ھزاروں معمے اور پیچیدہ مسائل پیدا ھوگئے جن کا کسی ایک اصول کے مطابق حل کرنا نا ممکن تھا - روشن ضمیر لوگوں کے لیے اس سے بھی زیادہ پریشان کن یہ بات تھی کہ ان مسائل کا حل کرنا ایک انفرادی ذمہ داری کا معاملہ ھوگیا تھا ' گویا ھر مریض پر یہ فرض عائد ھوگیا تھا کہ اپنے مرض کا علاج خود ھی کرے - اوس تروف سکی نے بہت سے مسئلوں پر جو اسے غور کے لائق معلوم ھوئے اپنے ڈراموں میں بحث کی ' اور حسب استعداد گمراھوں کی رہ نمائی کا فرض ادا کیا ' لیکن اپنے خاص انداز سے - اس نے نصیحت کرنا ' تعلیم دینا یا کسی مخصوص

فلسفۂ حیات کا پرچار کرنا اپنا مقصد نہیں بنایا ' ہم کسی خاص ڈرامے کی نسبت قطعی طور سے یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ اس کا موضوع کون سا معاشرتی یا اخلاقی مسئلہ ہے - لیکن جو زندگی ہماری نظروں کے سامنے مشاہدے کے لیے پیش ہوتی ہے ' جن سیرتوں کے تجربے اور سرگزشت سے ہم واقف کرائے جاتے ہیں اس سے کوئی نہ کوئی نتیجہ ضرور نکلتا ہے ' اور ہم اس سے فائدہ بھی حاصل کرتے ہیں ' مگر بغیر یہ محسوس کیے کہ ہماری رہ نمائی کی جا رہی ہے یا ہم کو کسی خاص قسم کی تعلیم دینے کی کوشش کی گئی ہے —

اس دور کے دو چار ڈرامے ایسے بھی ہیں جن میں نئی زندگی کے مسئلے اور پیچیدگیاں نظر انداز کر کے صرف وہ انوکھی سیرتیں دکھائی گئی ہیں جو اس وقت نمودار ہوئیں اور جو اس وقت کے حالات کی بدولت بہت زیادہ نمایاں بھی ہوگئیں - " ہر چالاک آدمی میں کچھہ بھولاپن ضرور ہوتا ہے " (۱۸۶۸) اور " دل سوزاں (۱۸۶۸) " اس سلسلے میں خاص طور سے قابل ذکر ہیں ' اور نئے رنگ کی سیرتوں کا بہترین مجموعہ ان دونوں میں نظر آتا ہے - " ہر چالاک آدمی میں کچھہ بھولاپن ضرور ہوتا ہے " گلو'موف نامی ایک نوجوان کا قصہ ہے جو بہت چلتا ہوا آدمی ہے ' لوگوں کی کمزوریاں معلوم کر کے ان سے فائدہ اٹھانا نے کا گر سمجھتا ہے ' اور چند مہینوں کی کوشش کے بعد سب کی نظروں میں بہت رتبہ حاصل کرلیتا ہے - لیکن ہر شخص کی نسبت اس کی جو اصل رائے ہے ' اور ملازموں وغیرہ کو جو اس نے رشوت دی ہے اس کا سارا حساب وہ ایک روز نامچے میں لکھتا جاتا ہے اور آخر میں اتفاق سے یہی روزنامچہ ان لوگوں میں سے ایک کے ہاتھہ لگتا ہے جنھیں گلو'موف نے الو بنایا ہے اور یوں اس

کا بھانڈا پھوٹ جاتا ھے - ان لوگوں میں اس کا دور کا رشتہ دار ایک مالدار تاجر مامائف ھے، جو ھر دن صبح سے شام تک رھنے کے لیے مکان تلاش کیا کرتا ھے، گو اسے مکان کی ضرورت بالکل نہیں - اس کی بیوی کو حسن کے قدردانوں کی تلاش رھتی ھے، اور وہ منظر بھی عجیب ھوتا ہے، جب مامائف گلوموف سے کنایتاً کہتا ھے کہ اگر تم میری بیوی سے عشق کرو یا اس کے روبرو عاشقوں کا انداز اختیار کرو تو مجھے کوئی شکایت نہ ھوگی، کیونکہ مامائف اپنی بیوی کی کمزوری سے واقف ھے، اسے معلوم ھے کہ کسی نہ کسی سے اس کا یارانہ ضرور رھے گا، اور اس صورت میں گلوموف ھی یہ منصب اپنے ذمے کرلے تو بہتر ھوگا - ان میاں بیوی کے علاوہ اور لوگ جو گلوموف کا شکار بنے کچھ کم دلچسپ نہیں ' تورروسی نا ' ایک نوجوان بیوہ ' وھم پرستی کی انتہا ھے - ڈرامے میں پہلی بار جب اس کا ناظرین سے تعارف کرایا جاتا ھے تو وہ گاڑی پر بیٹھ کر کہیں جانے والی ھے، مگر رستے میں کچھ برے شگون نظر آنے پر وہ واپس آجاتی ھے - اسے رمالوں پر بہت اعتقاد ھے، جو کچھ کرتی ھے فال دیکھ کر، اور گلوموف ایک رمالہ کو رشوت دے کر ' تورروسی نا ' کے مستقبل میں خاص اھمیت حاصل کرلیتا ھے - ' تورروسی نا ' کی ایک رشتہ دار ' ماشن کا ' ھے جو صرف اس نیت سے شادی کرنا چاھتی ھے کہ بھڑکیلے کپڑے پہنے تھیٹر میں سب اسی کو دیکھا کریں اور وہ سوسائٹی کے اعلیٰ طبقے میں شمار کی جائے - اسے مطلق پروا نہیں کہ اس کی شادی کس سے ھوتی ھے، بشرطیکہ اس کے یہ حوصلے پورے ھو جائیں، اور وہ اوچھی طبیعت کی مہذب روسی عورتوں کا ایک مثالی نمونہ ھے - اسی کی طرح ' کورو دولن ' جو اپنے آپ کو اس وقت سے بہت انتہا پسند

سمجھنے لگا ہے جب سے کسی نے اس پر لبرل * ہونے کا الزام لگایا ایسی ذہنیت کا نمونہ ہے جو روس کے سرکاری ملازموں میں بہت پائی جاتی تھی ' اور 'گوروودولن' کے سے لوگ روسی ناولوں میں بہت ملتے ہیں - اوس تروف سکی نے اس آزاد خیالی اور بے باکی کی ' جس پر اس قسم کے لوگوں کو ناز تھا ' ساری کیفیت ظاہر کردی ہے —

" دل سوزاں " روسی سوسائٹی کے اس طبقے کا ایک تصویر خانہ ہے جس پر یورپی تہذیب کا زیادہ اثر نہیں پڑا تھا ' اگرچہ آزادی کی امنگیں نوجوانوں کے دلوں میں پیدا ہو رہی ہیں - اس ڈرامے کی ہیروئن 'پراشا' اپنی سوتیلی ماں اور خبطی باپ سے دبتی اور ڈرتی نہیں ہے ' اور ایک موقع پر جب اسے اندیشہ ہوتا ہے کہ اپنی مرضی کے مطابق شادی نہ کر سکے گی تو بلا تامل گھر چھوڑ کر بھاگ نکلتی ہے - 'پراشا' کی سیرت نہایت پیاری ہے ' اس میں وہ شوخی اور ہمت ہے جو نوجوانی کی خاص شان ہوتی ہے ' اور وہ دل کی نیک بھی بہت ہے - اسے تاجر طبقے کی لڑکیوں کا جن کی صورتیں دکھانے میں اوس تروف سکی نہایت مشاق تھا ' بہترین نمونہ سمجھنا چاہیے - لیکن ڈرامے میں دلچسپی کا مرکز وہ اور اس کی سرگزشت نہیں ' بلکہ اس کا باپ ' کوروسلے پوف ' اور اسی شہر کا ایک اور مالدار تاجر 'خلی نوف کوروسلے پوف' نے بہت سی دولت پیدا کرلی ہے ' اور عمر کے آخری سال چین سے گزارنا چاہتا ہے ' مگر اسے ایک خبط ہوگیا ہے جس کی وجہ سے وہ ہر وقت بے حد پریشان رہتا ہے - اسے اندیشہ ہے کہ قیامت آنے والی ہے ' اور یہ اندیشہ اس کے دل میں ایسی وحشت پیدا کرتا ہے کہ وہ اکثر سوتے سے چونک پڑتا ہے اور باہر جاکر دیکھتا ہے کہ کہیں

* یعنی آزاد خیال - اس زمانے میں آزاد خیال سمجھا جانا بڑے خطر اور بڑے اندیشے کی بات تھی -

آسمان پھٹ تو نہیں گیا ' 'خلی نوف' اس سے بھی زیادہ مالدار ہے ' وہ کسی خاص خبط میں تو مبتلا نہیں مگر اس کے کسی طرح سمجھہ میں نہیں آتا کہ اپنا وقت کیسے کاٹے اور اپنی دولت کیسے صرف کرے - اس نے شرفا کے طبقے سے دو مصاحب نوکر رکھے ھیں ' ایک نئی وضع کی تمام باریکیاں اور نکات سکھانے کے لیے' دوسرا اس لیے کہ وہ وقت گزارنے کی نئی اور دلچسپ ترکیبیں سوچے - زندگی میں لطف پیدا کرنے کی آخری تدبیر جو 'خلی نوف' کا مصاحب سوچتا ہے وہ یہ ہے کہ سب کے سب ڈاکو بن کر شہر کے قریب جنگل میں چھپ کر بیٹھیں ' جو مسافر رستے سے گزریں انھیں زبردستی گرفتار کر کے خوب شراب پلائیں اور پھر رخصت کردیں - انھیں مسافروں میں سے ' پراشا ' بھی ہے' جو اپنے گھر سے بھاگ گئی تھی' اور اسی کی گرفتاری سے ڈرامے کے تمام مسائل حل ہو جاتے ھیں —

"دل سوزاں" لکھنے کے بعد سے اوس ترف سکی نے نئی معاشرت کے معاملات پر غور کرنا شروع کیا ' اور ظاہر ہے کہ سب سے پہلے اسے نئی اور پرانی سیرتوں کا مقابلہ کرنے کا خیال ہوا - "مفت کی دولت" (۱۸۶۹) کا موضوع بھی ہے - وسیل کوف ' مضافات کا ایک تاجر جس نے جدید تجارت کے تمام گُر سیکھہ لیے ھیں اور خاصا روپیہ کمایا ہے شرفا کے طبقے کی ایک لڑکی لدیا پر عاشق ہو جاتا ہے ' لدیا کو وہ پسند نہیں ' لیکن دولت کی ہوس میں وہ اس سے شادی کر لیتی ہے - شادی کے چند روز بعد ھی دونوں میں نا چاقی پیدا ہو جاتی ہے - لدیا کو خیال تھا کہ 'وسیل کوف' بہت مالدار آدمی ہے اور اسے ڈھیروں روپیہ صرف کرنے کو ملے گا ' مگر وسیل کوف ایک بندھی ہوئی رقم سے جو لدیا کو بہت ناکافی معلوم ہوتی ہے زیادہ دینے پر راضی نہیں ہوتا ' اور ماں کے اکسانے پر وہ وسیل کوف کو چھوڑ کر اپنے گھر

واپس چلی جاتی ہے۔ اس کی ماں اپنا کل سرمایہ گنوا چکی ہے تھاتھہ سے رہنے کے واسطے اپنے شوہر کی جائداد تک بکوادی ہے اور چونکہ دونوں کے پاس کچھہ نہیں اور قرض خواہ مکان اور کپڑے تک نیلام کرانے کی دھمکی دیتے ہیں لدیا کو مجبوراً شوہر کے پاس واپس آنا پڑتا ہے۔ لیکن وہ بااصول آدمی ہے، اور لدیا کے واپس آجانے پر وہ اسی وقت راضی ہوتا ہے جب وہ اس کی چند شرطیں منظور کرلیتی ہے، یعنی یہ کہ لدیا دو سال تک گانو میں رہ کر خانہ داری کا فن سیکھے گی، اس کے بعد بھی فضول خرچی نہ کرے گی اور رئیسانہ مشاغل کے بجائے اپنے شوہر اور اپنے گھر بار کو دلچسپی کا مرکز سمجھے گی۔ لدیا کو اپنی تمام مصیبتوں کے باوجود یہ شرائط منظور نہیں، لیکن اس آڑے وقت میں اسے معلوم ہوجاتا ہے کہ شرفا میں سے اس کے جتنے دوست اور اس کے حسن کے مدح سرا تھے وہ سب جھوٹے اور دغاباز ہیں، اور اگر وہ شوہر کے شرائط منظور نہ کرے گی تو اسے فاقہ کرنا ہوگا۔ اسی سلسلے میں اسے یہ بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ مفت کی دولت کسی کے ہاتھہ میں ٹھیرتی نہیں، اور امیر وہی ہوسکتا ہے اور رہ سکتا ہے جو اپنی محنت سے روپیہ کمائے۔ لدیا کا یہ تجربہ حاصل کرکے مجبوراً راہ راست پر آنا ڈرامے کے ناظرین کے لیے خوشی کا باعث نہیں ہوتا۔ لدیا نہایت درجہ بے اصول عورت ہے، نفس پرستی کے سوا اس کے دل میں اور کسی جذبے کا گزر نہیں، اور اسے دولت کی اتنی شدید ہوس ہے کہ وہ اس پر اپنی عصمت اور آبرو تک نثار کرنے کو آمادہ رہتی ہے، ناظرین کے دل میں یہ کھٹکا رہتا ہے کہ اگر 'وسیل کوف' جیسے بااصول اور نیک آدمی کی جگہ اسے اور کوئی صاحب دولت ملتا جسے اس کی زندگی کے بگڑنے اور بننے کی

پروا نہ ہوتی اور وہ صرف اس کے حسن کا خریدار ہوتا تو لدیا اپنے آپ کو بیچ دینے میں تامل نہ کرتی - بے کاری اور مفت کی دولت نے روسی شرفا کو اس حد تک بگاڑ دیا تھا !-

لدیا کی سیرت ڈراما نویس کی ایجاد نہیں - روس میں ایک طرف آزادی' دوسری طرف وہ رئیسانہ عادتیں جو اس دور کے شرفا کو ورثے میں ملی تھیں اور ایک طوق کی طرح ان کے گلے میں پڑی تھیں' ان دونوں نے مل کر بہت سی عورتوں کو لدیا کا سا بنا دیا تھا - اوس تروف سکی کے اس دور کے ڈراموں میں جو لوگ ہماری نظروں کے سامنے آتے ہیں ان کے جذبات میں کوئی شدت ہے نہ شان' ان کی محبت پر یا تو شہوت اور نفس پرستی کا رنگ غالب آجاتا ہے ' یا وہ ادنی اغراض پر نثار کی جاتی ہے' مردوں کے حوصلے یہ ہوتے ہیں کہ عیش کریں' عورتوں کے یہ کہ اپنے حسن اور رئیسانہ لباس اور رہن سہن سے مردوں کے دل لبھائیں اور دوسری عورتوں میں رشک اور حسد پیدا کریں - خانگی زندگی کی کسی کو تاب نہیں' مرد اور عورتیں یکساں اس سے گریز کرتی ہیں اور پناہ چاہتی ہیں' مگر اسی وجہ سے کہ ان میں فرائض کا احساس نہیں' ان کی زندگی بالکل بگڑ جاتی ہے' وہی لطف اندوزی جس کے پیچھے سب کچھ کھویا جاتا ہے ایک نایاب دولت بن جاتی ہے' اور وہی آزادی اور تہذیب جو کسی زمانے میں روسیوں کو جلت معلوم ہو رہی تھی حاصل ہونے کے بعد دوزخ بن جاتی ہے —

" امیر کنواریاں" (۱۸۷۵) اور " بے جہیز والی" (۱۸۷۸) دونوں ڈرامے روسی سماج کی اس کیفیت کو خوب ظاہر کرتے ہیں - پہلے میں ایک لڑکی کی سرگزشت دکھائی گئی ہے جو شروع سے رئیسانہ زندگی کی عادی

بنا دی گئی تھی' اور چونکہ وہ اپنے آپ کو رئیس سمجھتی ہے اسے اس کی بھی فکر نہیں کہ اس کی زندگی کا طریقہ درست ہے یا نہیں اور اس کی اخلاقی حالت کی نسبت نیک چلن لوگوں کی راے کیا ہے - اتفاق سے اس کی ایک نوجوان سے ملاقات ہوتی ہے جو بچپن میں اسے جانتا تھا' وہ لڑکی پر عاشق ہوجاتا ہے' مگر جب اس کے چال چلن کا حال کھلتا ہے تو وہ غصے میں اسے بہت ملامت کرتا ہے' اور یوں لڑکی حقیقت سے آگاہ ہوتی ہے -

"بے جہیز والی" کی ہیروئن 'لاریسا' کو اس طرح بیاہ کرنے والا بھی کوئی نہیں ملتا - اس کی ماں مفلس ہے مگر امیروں کی طرح رہتی ہے' کیونکہ اس کی عادت ایسی ہے' اسے امید ہے کہ کوئی نہ کوئی خوشحال نوجوان 'لاریسا' کے حسن سے فریفتہ ہوکر اس سے شادی کرلے گا - 'لاریسا' کے حسن سے تو بہت سے لوگ فریفتہ ہوتے ہیں' اس سے شادی کرنے کی خواہش کسی کو نہیں ہوتی - اس کے سارے قدردان اسے داشتہ بناکر رکھنا چاہتے ہیں - آخر میں وہ ایک ادنیٰ سرکاری ملازم سے جس کا اس کے یار دوست مذاق اڑایا کرتے تھے' منگنی کر لیتی ہے' کیونکہ وہ عیش اور شراب خواری کی زندگی سے عاجز آگئی ہے' اور سکون کے لیے تڑپنے لگتی ہے - لیکن اسے چین نصیب نہیں ہوتا - وہ اپنے منگیتر سے بالکل محبت نہیں کرتی' اور وہ محبت کے لائق بھی نہیں - شادی سے چند روز پہلے ہی جب اس کا ایک پرانا آشنا 'پراتوف' جس پر وہ اس کی سرد مہری اور لااُبالی پن کے باوجود دل و جان سے فدا ہے' یکبارگی نمودار ہوتا ہے' تو وہ اپنے منگیتر اور اپنے شادی کے ارادوں کو بھول جاتی ہے' اور 'پراتوف' کے ساتھہ ایک ناچ گانے اور شراب خواری کے جلسے میں شریک ہوتی ہے' جہاں جانے سے اس کے منگیتر نے اسے منع کیا تھا - اس کا منگیتر ویسے بھی خبطی اور کمینہ آدمی ہے'

اس واقعے کے بعد رقابت کے جوش میں وہ 'لاریسا' کے پستول مار دیتا ہے - 'لاریسا' کو زندگی کے اس انجام پر بھی افسوس نہیں ہوتا' وہ گولی لگتے ہی اپنے مذگیتر کا شکریہ ادا کرتی ہے' اور اس سے پستول مانگ لیتی ہے' تاکہ سب سمجھیں اس نے خود کشی کرلی ہے —

'لاریسا' کی سیرت میں بہت سی خوبیاں ہیں' اور سب سے بڑی خوبی اس کی گہری اور سچی محبت ہے' جو اس کے لیے ہر ایثار کو آسان بنا دیتی ہے - مگر جس طرز معاشرت میں والدین اپنا کل سرمایہ ٹھاٹھہ سے رہنے میں صرف کریں' اولاد کے لیے گھربار کے بجائے عیش اور آسائش کی امیدیں کریں اور اپنے اور اپنی اولاد کی نیک نامی کی فکر ہی نہ کریں اس میں لاریسا جیسی نازک اور نفیس مذاق رکھنے والی ہستیوں کو موت کے سوا اور کسی نعمت کا شکریہ ادا کرنے کا موقع نہیں ہو سکتا —

" آخری شکار " (۱۸۸۷) اور " حسین مرد " میں اوس تروف سکی نے ثابت کرنا چاہا ہے کہ عورتوں میں آزادی کی خواہش تو پیدا ہوگئی ہے مگر اس کے صحیح استعمال کی وہ اہل نہیں ہیں' کیونکہ وہی ایثار کا جذبہ جو نسوانی سیرت کا زیور اور مایۂ ناز ہے - انہیں چالاک اور بے اصول مردوں کا شکار بناتا ہے - اس کے آخری ڈرامے' " بیگناہ مجرم " (۱۸۸۳) اور "اس دنیا کے لیے نہیں " (۱۸۸۴) اس کے اس عقیدے کو بھی ظاہر کردیتے ہیں کہ معاشرت کے تمام تغیرات کے باوجود اولاد کی محبت اور گھریلو زندگی کی خواہش روسی سوسائٹی میں ناپید نہیں ہوگئی ہے - " بیگناہ مجرم " ایک لڑکی 'لیوبوف اوت راوی نا' کا قصہ ہے جسے ایک نوجوان 'موروف' سے محبت ہوگئی ہے - دونوں میں میاں بیوی کے تعلقات ہوگئے ہیں' ایک لڑکا بھی ہوا ہے مگر نوجوان نے نکاح نہیں کیا ہے - آخر میں

لڑکی کو ایک ہی روز میں یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ اس کا شوہر شادی کرنے والا ہے اور لڑکا جو بیمار تھا، قریب مرگ ہے - وہ بھاگی ہوئی بچے کے پاس جاتی ہے، اور جب موت اس کی آنکھیں بند کردیتی ہے تو وہ گھر چھوڑ کر نکل کھڑی ہوتی ہے - 'اوت راوی نا' اپنا نام بدل کر تھیٹر میں نوکری کرلیتی ہے، اور بہت جلد مشہور ہوجاتی ہے - کیونکہ اس کے غم نے اسے اس فن کے لیے بہت موزوں بنا دیا تھا - سترہ اٹھارہ سال تک وہ روس اور مختلف یوربی ملکوں کی گشت لگاتی ہے، اور پھر اتفاق سے پیشے کے سلسلے میں اپنے پیدائشی شہر میں بھی آتی ہے - وہ نوجوان جس سے یہاں اس کا تعلق تھا، اب ایک معزز شخصیت اور رئیس اعظم ہوگیا تھا - اس کی بیوی مرچکی ہے، اور جب وہ 'اوت راوی نا' کو پہچان لیتا ہے تو شادی کی خواہش ظاہر کرتا ہے - لیکن 'اوت راوی نا' کو کہیں سے پتا چل گیا ہے کہ اس کا لڑکا مرا نہیں تھا بلکہ اب بھی زندہ ہے، اور وہ اسی کو شادی کی شرط بتاتی ہے کہ 'موروف' لڑکے کو تلاش کرلائے - 'موروف' وعدہ کرلیتا ہے، مگر خیا اسے باقاعدہ جستجو کرنے سے باز رکھتی ہے، اور آخر میں وہ اس کا اظہار بھی کردیتا ہے - 'اوت راوی نا' کو اپنے عشق کی داستان یاد نہیں اور اس کی مامتا بدنامی کے خیال کو اس کے دل میں نہیں آنے دیتی ہے - موروف سے وہ شادی نہیں کرتی، مگر اسے اپنا لڑکا مل جاتا ہے، اور اسی کو وہ اپنی انتہائی کامیابی سمجھتی ہے —

"اس دنیا کے لیے نہیں" اس منطق کے اختلاف کو واضح کرتا ہے جو عورتوں کے ذہن کو گھر گرہستی کے معاملات اور ازدواجی زندگی کے تنگ دائرے تک محدود رکھتا ہے اور مردوں کو اسی دائرے کے باہر لاکر عام زندگی کی دلچسپیوں اور مشاغل میں شریک ہونے پر مجبور کرتا ہے -

'کوچوئف' ایک خوش حال آدمی نے دولت کی ہوس میں ایک لڑکی سے شادی کی ہے جس کی تربیت خاندان میں ہوئی ہے' اور قدیم اصولوں کے مطابق وہ شوہر کا فرض سمجھتی ہے کہ فرصت کا سارا وقت گھر پر صرف کرے' اور کبھی سیر یا تفریح یا ملاقات کے لیے جائے تو اپنی بیوی کے ساتھ' کسی غیر عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے' اور ان تمام تفریح کے ذریعوں کو جو اخلاق پر برا اثر ڈال سکتے ہیں اپنے اوپر حرام سمجھے ۔ چاہتی تو سب عورتیں یہی ہیں' مگر تجربہ بہت جلد ظاہر کردیتا ہے کہ یہ خواہش پوری نہیں ہوسکتی - لیکن 'کوچوئف' کی بیوی کسے نیا "اس دنیا کے لیے نہیں" بنی ہے' وہ کئی سال کے تجربے پر بھی اپنی رائے نہیں بدلتی' بلکہ اس کی کنوار پن کی آرزوئیں اور زیادہ شدید ہوجاتی ہیں - 'کوچوئف' کی طبیعت ایسی ہے کہ بیوی کی سیرت اور خیالات سے واقف ہونے کے باوجود وہ اپنا رویہ ذرا بھی نہیں بدل سکتا' اور اس کشمکش کا انجام یہ ہوتا ہے کہ 'کسے نیا' بیمار پڑجاتی ہے' اور اسے ایک آخری صدمہ ایسا پہنچتا ہے کہ وہ اس دنیا ہی سے رخصت ہوجاتی ہے —

'اوس تروف' کے ساتھ ان لوگوں کا ذکر بھی لازمی ہے جنھوں نے اس کے ڈراموں کو اسٹیج پر کامیاب بنایا' اور صرف ڈراما نویس ہی کے حوصلے نہیں پورے کیے بلکہ اس کے ڈراموں کا حق بھی ادا کیا - تھیٹروں کے مالکوں اور منتظموں سے تو اوس تروف سکی کو ہمیشہ شکایت رہی' لیکن روسی ایکٹروں سے وہ ہمیشہ خوش رہا' اور ان لوگوں نے بھی ڈراما اور ڈراما نویس کی ترجمانی کرنے کی کوشش میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا - اوس تروف سکی کے حقیقت نگاری کے اصول نے اس کوشش میں انھیں

مدد بھی بہت پہنچائی ' اور ایکٹروں نے بذات خود قومی زندگی کا جو مشاہدہ کیا تھا اسے وہ پورے طور پر کام میں لاسکے ' اور ڈراموں کی ساخت اور مصنف کی وسعت نظر نے اس کا بھی امکان پیدا کردیا کہ وہ فن میں جدتیں کرسکیں - اکثر یہ ہوتا تھا کہ ناظرین میں سے کوئی ہو بہو اپنی ہی جیسی شکل کا آدمی اسٹیج پر دیکھہ کر دنگ رہ جاتا ' اور ایکٹروں نے ہر طبقے اور پیشے کے لوگوں کی بات چیت ' خاص انداز اور حرکتیں اس طرح اپنا لیں کہ اس خاص طبقے والے بھی نقل اور اصل میں امتیاز نہ کرسکے - لیکن محض نقل میں کامیابی حاصل کرنے سے اوس ترووف سکی کا سارا مفہوم اور اس کی حقیقت نگاری کا پورا مطلب ادا نہیں ہوسکتا تھا - ایکٹروں پر یہ بھی لازم تھا کہ جن صورتوں کی وہ نقل کریں ان کے ظاہر کے ساتھہ ان کا باطن یعنی ان کا فلسفۂ حیات اور ان کی ذہنیت بھی اختیار کرلیں ' اور اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنے ذہن میں وہی وسعت اور ہمہ گیری پیدا کریں جو ڈراما نویس کے ذہن میں تھی ' اور اسی طرح ہر صورت میں محو ہوجانا سیکھیں - یہ شرط پوری کرنا بہت دشوار ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ "ایں سعادت بزور بازو نیست " - لیکن روس میں اس وقت ایسے صاحب ہنر موجود تھے جنھوں نے یہ شرط بھی پوری کردی ' اور اوس ترووف سکی کے ڈراموں کی خوبیاں دوبالا ہوگئیں —

جدید ڈراما

از

موریس ماتر لنک

جدید ڈرامے سے میرا اشارہ ڈرامائی ادب کے اس رجحان کی طرف ہے جس کی اٹھان ابھی نئی ہے - اس میں شبہ نہیں کہ معمولی تھیٹروں میں قدیم ڈرامے پر جدید اثرات کار فرما ہیں - لیکن جب ان سے بہتر رہنما مل سکتے ہیں تو ان سست رفتار ہمراہیوں سے کیا حاصل —

جدید ڈرامے کی سب سے اہم خصوصیت ہے، خارجی حرکت کا فقدان- معلوم ہوتا ہے کہ حرکت کی قوت پر فالج کا سا مہلک اثر ہو رہا ہے - دوسری چیز ہے انسان کے نفس کو سمجھنے اور اخلاقی مسائل کو غیر معمولی اہمیت دینے کی خواہش - ایک اور چیز جو ابھی منظر عام پر نہیں آئی ہے، نئے قسم کے حسن کا تجسس ہے، ایسا حسن جو اگلے وقتوں کی طرح تجریدی نہ ہو —

یہ صحیح ہے کہ اسٹیج پر عجیب و غریب ہنگاموں کے سین بہت کم نظر آتے ہیں - خونچکانی کم ہوگئی ہے، جذبات کا تلاطم دھیما پڑ گیا ہے - شجاعت ہلاوت سے آشنا ہوگئی ہے اور مردانگی بربریت سے دور ہوتی جاتی ہے - یہ سچ ہے کہ اسٹیج پر موت کے نظارے دکھائے جاتے ہیں کیونکہ موت اب بھی ایک حقیقت ہے - لیکن ہر ڈرامے کا انجام اب موت پر

نہیں ہوتا اور نہ موت کو ہر واقعے کا لازمی انجام قرار دیا جاتا ہے - اپنی زندگی کے بڑے سے بڑے سانحے کا حل ہم موت میں تلاش نہیں کرتے - اور حالانکہ علم کے ارتقاء کی ہمدوشی میں تھیٹر دوسری صنعتوں سے بچھڑا ہوا ہے، تاہم اسے اس چیز کی رعایت کرنی ہی پڑے گی —

(۲)

کلاسکل ڈرامے کی بنیاد قدیم اور المیہ قصوں پر قایم ہے - اطالوی، اسکینڈیلیویں، اسپینی یا خیالی افسانوں نے محض شکسپیر کے دور کے ڈراموں کو ہی نہیں بلکہ فرانسیسی اور جرمن کے رومانی دور کو بھی (جس میں نسبتاً آورد زیادہ ہے) پلاٹ بہم پہنچائے تھے - اب ہمیں فوراً معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ قصے ہمارے لیے وہ دلکشی نہیں رکھتے جیسی اُس زمانے میں رکھتے تھے جس میں وہ بالکل فطری اور حقیقی سمجھے جاتے تھے - یہ قصے جن واقعات، جذبات اور عادات کے حامل تھے وہ زمانۂ قدیم کے تماشائی کو ہی اپیل کر سکتے تھے —

لیکن زمانۂ حال کی زندگی سے ان کا کوئی تعلق نہیں - اگر اس زمانے کا کوئی نوجوان محبت میں مبتلا ہو جائے اور اس کی راہ میں ویسی ہی مشکلات حائل ہوں جن سے "رومیو" کو دو چار ہونا پڑا تھا، تو یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ وہ رومان کا وہ طلسم نہیں بنا سکتا جس نے "رومیو" کے افسانے کو اس قدر شاندار اور روح سوز بنا دیا ہے - وجہ یہ ہے کہ واقعہ ایک ہوتے ہوئے بھی اس کا خارجی و داخلی ماحول بالکل بدل گیا ہے - عظمت و ثروت کے وہ فلک بوس ایوان ہمیشہ ہمیشہ کے لیے زمین دوز ہوگئے، پر اسرار کوچوں کی وہ تیغ زنی ختم ہو چکی ؛ شان و شکوہ اور قتل و غارتگری کے دن بیت گئے، وہ تاریک قید خانے اور

پر ہیبت مقبرے اب کہیں نہیں رہے' اب وہ شبہائے بہاراں کہاں ہیں
جن کا حسن ناگزیر موت کے سایے میں نکھرتا تھا - رومیو اور جولیٹ کے
فسانۂ محبت کو ان سنہرے حاشیوں سے الگ کرلو تو کیا رہ جاتا ہے؟
ایک شریف مگر بد قسمت لڑکے اور ایک لڑکی کی محبت جو ضدی والدین
کی وجہ سے ناکام ہو گئی —

اس روز مرہ کے واقعے کی تمام تر عظمت اور شاعری مرہون ملت
ہے - اس ماحول کی جس کے عناصر شرافت' ثروت اور الم تھے - ایک بھی
بوسہ یا پریم کا گیت اور غم و غصہ کی ایک بھی آہ یا چیخ ایسی
نہیں ہے جس کی نزاکت' حسن یا شان — اپنے ارد گرد کے اشخاص یا
اشیا کی ملت پذیر نہ ہو - کیونکہ لطف اور خوبی بذات خود بوسے کے
فعل میں نہیں ہے' بلکہ لطف ان حالات' لمحات اور واقعات میں
مضمر ہے' جن میں بوسہ دیا گیا تھا - یہی اعتراضات اس وقت بھی
صادق آتے ہیں جب ہمارے زمانے کا کوئی آدمی اوتھیلو کی طرح حاسد'
میکبتھ کی طرح بوالہوس اور لیئر کی طرح ناکام یا ہیملٹ کی طرح
بے چین بتلایا جائے —

(۳)

یہ حالات اب ناپید ہیں - آج کل کے رومیو کی کارگزاریاں — اگر
ان کی نوعیت صرف خارجی ہو — کسی ڈرامے کے ایک دو ایکٹوں کے
لیے بھی مواد فراہم نہیں کر سکتیں - نظر بر آں کہا جا سکتا ہے کہ
دور جدید کے تمثیل نگار کو پورا حق ہے کہ عہد شباب کی عشق نوازی
کے بیان میں زمانۂ قدیم کے آرایشی لوازم سے مدد لے تاکہ ڈرامے میں
پرالم اور پر شوکت ماحول پیدا ہوسکے - اگر اس عذر کو مان بھی لیں

تو سوال یہ ہوتا ہے کہ اس تدبیر کا نتیجہ کیا ہوگا؟ زمانۂ حال کے تمثیل نگار کے جذبات اور هیجانات ہر حال میں قطعی طور پر جدیدیت کا رنگ لیے ہوں گے - ان کے نمو اور اظہار کے لیے آج کل کا ماحول ہونا چاہیے - ان جذبات اور هیجانات کا کیا حال ہوگا اگر وہ یک بیک ایسی جگہ تبدیل کر دیے جائیں جہاں کی مٹی ان کے لیے بالکل ناموزوں اور غیر فطری ہو؟ ان میں بوے ایمان تو رہے گی نہیں مگر ان سے مطالبہ یہ ہوگا کہ روز حشر پر اٹل آس لگائے رہیں - دکھ کی گھڑیوں میں انہیں ایسا سہارا مل گیا ہے جس پر بھروسا کیا جا سکتا ہے کیونکہ اس میں انصاف بھی ہے اور انسانیت بھی - مگر اس وقت ان کی کیسی درگت ہوگی جب وہ سو سال پیچھے کی دنیا میں دھکیل دیے جائیں جہاں دعا اور تلوار ہر چیز کا فیصلہ کرتی تھیں - ہم نے جو اخلاقی ترقی کی ہے اس سے انہوں نے فیض حاصل کیا ہے، خواہ یہ دانستہ طور پر ہی کیوں نہ ہوا ہو - لیکن اب یکبارگی انہیں اس قعر پستی میں پھینکا جا رہا ہے جہاں ہر فعل پر توہمات کا حکم چلتا تھا - اس ماحول میں ہمارے جذبات و هیجانات کس طرح پلپ سکتے ہیں؟ —

لیکن ہمیں ان مصنوعی ڈراموں پر سر کھپانے کی ضرورت ہی کیا ہے جو ماضی و حال کے غیر امکانی وصل سے پیدا ہوتے ہیں - ہمیں اس تمثیل پر غور کرنا چاہیے جو واقعتاً ہمارے زمانے کی حقیقتوں کی حامل ہے - یونانی ڈراما یونانی حقیقت کی اور نشاۃ ثانیہ کا ڈراما اپنے زمانے کی تصویر پیش کرتا ہے - اسی طرح جدید ڈرامے کا پس منظر نئے قسم کا گھر ہے اور اس کے کردار آج کل کے نئے مرد عورت ہیں - جذبات و هیجانات کم و بیش وہی ہیں جو زمانۂ قدیم میں تھے - محبت،

نفرت' بوالہوسی اور رشک و حسد کا بازار اب بھی گرم ہے - انصاف پسندی اور فرض شناسی کا وجود اب بھی باقی ہے - نیکی' وفاداری' رحم' غرور اور خود پسندی کے جذبات اب انسان پر حکمراں ہیں - ان خیالی کرداروں کے نام اب بھی وہی ہیں لیکن ان کی نوعیت کتنی بدل گئی ہے - ان کے اثر و اقتدار میں کتنا بڑا فرق پیدا ہوگیا ہے - ان کے پرانے حربوں میں سے ایک بھی باقی نہیں ہے اور نہ ان کے آئینے میں پرانے زمانے کا کوئی نظارہ دکھائی پڑتا ہے - اب شاید ہی کبھی چیخ پکار سنائی دیتی ہے اور لہو اور آنسو کی تو جھلک بھی نظر نہیں آتی - اب تو ایک چھوٹے سے کمرے میں میز کے آس پاس یا اس کے کنارے انسان کے دکھہ سکھہ کا فیصلہ ہوتا ہے - اس چھوٹے سے کونے میں ہم خود غم اٹھاتے ہیں یا دوسروں کو غم دیتے ہیں اور وہیں ہم پیار کرتے ہیں' یا بیمار ہوکر مرجاتے ہیں - یوں کسی بہت بڑی مصیبت یا مسرت کے موقع پر ہی کمرے کا دروازہ یا کھڑکی پل بھر کے لیے کھل جائے تو کھل جائے' ایک آن کے لیے جل کر بجھہ جانے والا چراغ حسن بھی اب نہیں رہا - اب تو صرف ایک خارجی شاعری رہ گئی ہے' جو اب تک مکمل طور پر شاعرانہ نہیں ہوئی ہے - مگر تہہ تک جاکر دیکھو تو ایسی شاعری اب کہاں ہے جو اپنا تمام حسن اور وجدان بیرونی عناصر سے حاصل نہیں کرتی؟ بالآخر یہ بھی یاد رہے کہ اب ایسا خدا نہیں رہا جو افعال کی نگرانی کرے یا انہیں وسعت دے - اور نہ انسان کی ہر حرکت کے پیچھے قسمت کا پراسرار اور پر الم ہاتھہ رہ گیا ہے - نہ وہ رنگین اور متین ماحول باقی ہے جو انسان کے بڑے سے بڑے گناہ کی پردہ پوشی کر لیتا تھا —

(۴)

اس میں شک نہیں کہ ہمارے ساتھہ ایک مہیب ابہام اب بھی باقی

ہے - لیکن جب ہم اسے بے نقاب کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ اس قدر عجیب، تاریک اور موہوم ہوجاتا ہے کہ اسے ہاتھ لگانا اپنے کو خطرے کے منہ میں ڈالنا ہے - آئے دن ہم جن لوگوں سے ملتے ہیں اگر ان کے حرکات و کنایات کو اسرار کی حد تک لے جانا چاہیں تو ہمیں اس ابہام کا سہارا لینا ہی ہوگا - لیکن بہت بڑی دشواریوں کا مقابلہ کیے بغیر ہم ایسا نہیں کرسکتے - یہ نہیں کہ کوشش نہیں کی گئی - زمانۂ قدیم کی 'قسمت' یا 'قدرت' کے گورکھ دھندے کو بوجھنے کی سعی اب بھی ہورہی ہے اور 'وراثت' یا "طبعی جذبۂ انصاف" ان کے بدل کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے - مگر یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ہمہ جمعہ آٹھ دن کی یہ پہیلیاں اپنے پیش روؤں سے بھی زیادہ پرانی اور غیر امکانی معلوم ہونے لگی ہیں —

پھر ہم اس آن بان کو کہاں ڈھونڈیں جو اب افعال اور الفاظ میں نہیں مل سکتی - کیونکہ لفظ تو ایک آئینہ ہے جو اپنے گرد و پیش کے بانک پن کی ایک چھب دکھاتا ہے - مگر نئی دنیا کا حسن ابھی اس قابل نہیں ہوا ہے کہ اپنی کم زور شعاعوں کو ان آئینوں میں منعکس کرسکے - اب وہ ذوق نظر اور شعریت کی فضا ہم کہاں سے لائیں کیونکہ اسے ہم اب اس اسرار میں بھی تلاش نہیں کرسکتے جو گو اب بھی باقی ہے مگر اس وقت موہوم ہوجاتا ہے جب اس کا نشان تلاش کرتے ہیں —

جدید ڈرامے کو اس امر کا خفیف سا احساس ہے - وہ خارجی عمل اور بیرونی حرکت سے محروم ہے اور کسی قدرت یا قسمت کو مخاطب کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا - لہذا اب اسے اپنا ہی آسرا لینا پڑا اور وہ نفسیات اور اخلاقی مسائل کی دنیا میں خارجی دنیا کا بدل تلاش

کر رہا ہے۔ داخلی دنیا میں وہ دور تک چلا گیا ہے مگر یہاں اسے ایسی مشکلات کا سامنا ہوا جو عجیب ہیں اور جن کے وجود کا وہم و گمان بھی نہ تھا۔

داخلی دنیا کا علم مفکر، ناصح، مورخ، افسانہ نگار اور کسی حد تک شاعر کے حلقۂ اختیار میں شامل ہے۔ بلکہ ان کا فرض بھی ہے۔ لیکن تمثیل نگار کو یہ حق نہیں پہنچتا۔ بڑی سے بڑی کشش کے باوجود وہ بے حرکتی کی طرف راغب نہیں ہوسکتا اور نہ اس کی حیثیت محض فلاسفر یا تماشائی کی ہوسکتی ہے۔ وہ کتنا ہی ہاتھہ پاؤں مارے، کیسے ہی نایاب جوہروں کو کیوں نہ ڈھونڈھ نکالے لیکن اسٹیج کا سب سے بڑا قانون اور مطالبہ 'حرکت' ہے اور آئندہ بھی رہے گا۔ پردہ اٹھتے ہی ہماری بلند سے بلند ذہنی خواہشوں میں کایا پلٹ ہوجاتی ہے۔ مفکر، ماہر نفسیات، ناصح یا صوفی کی جگہ ایک تماشائی رہ جاتا ہے جو انبوہ کے جوش میں بہہ جاتا ہے اور اس کی صرف ایک خواہش ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ کچھہ ہوتا ہوا دیکھے، یہ امر کتنا ہی حیرت خیز ہو مگر اس کی حقیقت اور اصلیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ یہ راز ہمارے ضمیر میں سربستہ ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ ہماری روح میں کوئی ایسی صلاحیت ہے جسے ایک خاص قسم کا وسیلہ دیا گیا ہے جس کی تہذیب ناممکن ہے۔ اور یہ وسیلہ انسان کو گروہ کے ساتھہ سوچنے، اثر پذیر ہونے اور محسوس کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ الفاظ خواہ کتنے ہی پر وقار اور معنی خیز کیوں نہ ہوں لیکن اگر وہ حالات کو یکساں رہنے دیں گے اور کوئی حرکت، کشاکش یا انجام پیدا نہ کریں گے تو ہم ان سے جلد تنگ آجائیں گے۔

(۵)

اب یہ دیکھنا ہے کہ انسان کے ذہن میں 'حرکت' کا وجود کس طرح

ہوتا ہے - دراصل مختلف اور متضاد ہیجانات کی کشاکش سے اس کی ابتدا ہوتی ہے - لیکن اس سے آگے بڑھتے ہیں — بلکہ غور سے دیکھو تو ابتدا ہی میں - اس کی شکل بدل جاتی ہے اور پھر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہیجان اور ایک اخلاقی قانون' ایک فرض اور ایک خواہش میں کشمکش جاری ہے - یہی وجہ ہے کہ جدید تمثیل نگار بڑے شوق سے اپنے زمانے کے اخلاق کے مسائل کی طرف رجوع ہوگئے ہیں - اور بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ اس وقت ان کے فکر کا دایرہ انہیں مسائل تک محدود ہوگیا ہے —

یہ تحریک الیکزینڈر ڈیوما (اصغر) کے ڈراموں سے شروع ہوئی- ان ڈراموں نے بہت معمولی اخلاقی بکھیڑوں کو اسٹیج پر پیش کرنا شروع کیا - ان ڈراموں کی بنیاد ایسے سطحی مسائل پر تھی جن کا حل تماشائی اپنی پوری روحانی زندگی میں کبھی تلاش نہیں کرتا کیونکہ وہ تو بالکل ظاہر اور بین ہیں - اور یہ یاد دلانے کی ضرورت نہیں کہ تماشائی ہمیشہ اخلاق کا پتلا سمجھا جاتا ہے - بے وفا شوہر یا بیوی کو معاف کرنا چاہیے یا نہیں؟ بے وفائی کا بدلہ بے وفائی سے دینا اچھا ہے یا نہیں؟ حرامی بچے کے کچھ حقوق ہیں یا نہیں؟ شادی محبت کے لیے کی جاتی ہے یا دولت کے لیے؟ جب شادی کے بعد اولاد ہو چکی تو طلاق جائز ہے یا نہیں؟ بے وفا بیوی کا گناہ بے وفا شوہر کے گناہ سے زیادہ ہے یا نہیں؟ — وعلیٰ هذالقیاس - اس زمانے کا فرانسیسی تھیٹر اور بیشتر یدیسی تھیٹر جو اسی کے چربے ہیں' انہیں سوالات اور ان کے پیش پاافتادہ جوابات پر قایم ہیں —

(۲)

اس کے برعکس جورنسن (Bjornson) هپت مان (Hauptmann) اور

ان سب سے بڑھ کر ابسن کے ڈرامے انسان کے نفس کی انتہا کو پہنچ گئے ہیں - جدید ڈرامے کی قوتوں کا آخری چھور ہمیں یہاں آکر ملتا ہے - کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ انسان کے نفس میں ہم جتنے گہرے چلے جائیں کشاکش اتنی ہی کم ہوتی جاتی ہے - جب تک نفس بہت پاک نہ ہو، اس کے اندر داخل ہونا ناممکن ہے - کیونکہ ہم کسی تاریک روح میں دس قدم چلیں یا ہزار قدم، ہمیں کوئی نئی یا نرالی چیز نہیں مل سکتی۔ ہر قسم کا اندھیرا سیاہ ہوتا ہے - معمولی نفس کی نسبت پاک نفس میں کہیں زیادہ پرسکون اور شریف ہیجانات ملیں گے جن میں ہوس کا مادہ بہت کم ہوگا - کیونکہ وہ زیادہ شگفتہ، تجریدی اور وسیع ہوتے ہیں - اسی وجہ سے ان مہذب اور شریف ہیجانات کا باہمی تضاد بہت کم ہوتا گیا ہے - اور ان کی شدت بھی دھیمی پڑگئی ہے، کیونکہ ان میں زیادہ بلندی اور وسعت آگئی ہے - سب جانتے ہیں کہ تنگ موری سے زیادہ غلیظ، ناپاک اور تباہ کن کوئی چیز نہیں - اسی طرح بہتی ہوئی خاموش ندی سے زیادہ سہانی کوئی چیز نہیں جس کا ساحل برابر چوڑا ہوتا جاتا ہے —

مزید براں ایک پاک نفس نسبتاً بہت کم قوانین کا پابند ہوگا اور ایسے فرائض کا بار برداشت نہ کرے گا جو مضر یا مشتبہ ہوں - یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایک تاریک نفس میں دروغ، حماقت یا توہم کسی نہ کسی موقع پر فرض منصبی کی شکل اختیار کرلیتا ہے - یہی وجہ ہے کہ حرمت (میں شوہر کی حرمت کا ذکر کر رہا ہوں جس کے متعلق یہ گمان کیا جاتا ہے کہ بیوی کی بے وفائی سے مجروح ہوجاتی ہے)، جذبۂ انتقام، کج فطرت نسوانی حیا، نخوت اور اس قسم کے ہزاروں توہمات، انگلت

جاہلوں کے لیے مقدس فرائض کا درجہ رکھتے ہیں۔ یہ مفروضہ فرائض روحانی دور کے تمام اور اس زمانے کے اکثر ڈراموں کے روح و رواں بنے ہوئے ہیں۔

لیکن جو نفس روشن ہے اس پر اس قسم کا کوئی فرض اثر نہیں ڈال سکتا، جو انسانیت کو ہلاکت اور تباہی کی طرف لے جا رہا ہے۔ روح روشن 'حرمت' اور 'انتقام' جیسے تو ہمات کو قریب بھی نہیں آنے دیتی جو ہمیشہ خون سے پیاس بجھایا کرتے ہیں۔ وہ ایسے تعصبات سے دور رہتی ہے جو دوسروں کے آنسوؤں سے خوش ہوتے ہیں اور ایسی بے انصافی سے نفرت کرتی ہے جو انسان کے رنج و محن پر مسرور ہوتی ہے۔ جو دیوتا قربانی چاہتے ہیں اور جو محبت موت کو مقصد قرار دیتی ہے روح روشن انہیں مٹا دینا چاہتی ہے۔ جب ہر انسان کی روح عقل کی تابانی سے جگمگانے لگے گی تو ہمیں صرف ایک فرض نظر آئے گا اور وہ یہ کہ ہمیں حتی الامکان ایذارسانی سے بچنا چاہیے اور دوسروں سے ویسی ہی محبت کرنا چاہیے جیسی اپنی ذات سے کرتے ہیں۔ اس فرض ملصبی کی گود میں کوئی ڈراما پروان نہیں چڑھ سکتا —

(۷)

اب زرا دیکھیے کہ ابسن کے ڈراموں میں کیا ہوتا ہے۔ وہ ہمیں نفس انسانی کی گہرائیوں میں لے جاتا ہے لیکن ڈراما اس وجہہ سے باقی رہتا ہے کہ ہمارے ساتھہ جوت کی ایک لو جھلملاتی رہتی ہے جو اتنی ڈراؤنی اور تھرتھرانی ہوئی ہوتی ہے گویا علامت خطر ہے اور یہ جوت صرف عجیب و غریب پرچھائیوں کو اجاگر کرتی ہے۔ ابسن کے المیہ ڈراموں کو جن فرایض سے حرکت ملتی ہے وہ تمام نفس روشن کے اندر نہیں بلکہ باہر پرورش پاتے ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ نفس روشن کے باہر

جو فرایض رکھتے ھیں وہ نخوت اور جلوں سے بہت قریب ہوتے ھیں —

یہ غلط فہمی نہ ہو کہ یہ باتیں کہہ کر میں اس زبردست تمثیل نگار کی قدر و قیمت گھٹا رہا ہوں - یہ صحیح ہے کہ ابسن نے ہمارے زمانے کے اخلاق میں بہت کم صحت بخش نکات داخل کیے ھیں ' تاہم غالباً وہ تنہا تمثیل نگار ہے جس نے ایک مکروہ مگر اچھوتی شاعری کو جنم دیا اور چلنا سکھایا - یہ بھی سچ ہے کہ اس شاعری کو اس نے ایک وحشیانہ اور بے نور حسن اور شان سے سرفراز کیا ہے - یہ شاعری اس قدر پروحشت اور غمناک ہے کہ کبھی واضح اور مقبول نہیں ہوسکتی - تنہا ابسن ھی وہ مصنف ہے جو قدما یا نشاۃ ثانیہ کے ڈراموں کا منت پزیر نہیں ہے —

ہر نیک دل میں انصاف اور مروت کا ایسا جذبہ موجود ہے جو اور تمام ہیجانات پر حاوی ہوجاتا ہے - یہ اس وقت بھی ہوتا ہے جب ہم ایسے زمانے کے منتظر ہوں جب عقل مضر فرایض کی انجام دھی سے انکار کرے اور مفید ہیجانات کی اطاعت کرے - جس کی وجہہ سے دنیا کے اسٹیج پر راحت کے تماشے زیادہ اور ٹریجیڈی کے کم ہوا کریں گے - شاید اسی انصاف و مروت کے جذبے اور ہماری خود پسندی و جہالت کی کشاکش سے اس صدی کا اصلی ڈراما شروع ہوگا - جب حقیقی زندگی اور اسٹیج دونوں میں اس مقصد کی تکمیل ہوگی تب کہیں 'جدید تھیٹر' کا نام لیا جاسکے گا - یہ امن وسکون کا تھیٹر ہوگا جس میں حسن کی آنکھیں کبھی نمناک نہ ہونگی —

میکسم گورکی کے ساتھہ چند روز

از

ڈاکٹر ستیہ نراین سنگھہ پی - ایچ - ڈی

زمستان میں شمالی یورپ کی سردی ناقابل برداشت ہو جاتی ہے - اس لیے پرندوں کے بعض قبیلے اسی موسم میں جنوبی یورپ کی طرف ہجرت کر جاتے ہیں - شمال کے سیاحت پسند طلبا بھی انہیں پرندوں کی تقلید کرتے ہیں - سرما میں جب تعلیمی ادارے چند ہفتوں کے لیے بند ہو جاتے ہیں تو یہ نوجوان سیر کرتے ہوئے جنوب کی طرف نکل جاتے ہیں - ان کی سیاحت کے لیے جرمنی میں 'وانڈر فوگل' (طیور آوارہ) نامی ایک ادارہ تھا - نوجوانوں میں ذوق سیاحت پیدا کرنا اور دوران سفر میں ان کی ہدایت کرنا اس ادارے کا کام تھا —

جس زمانے میں میں جرمنی میں تعلیم حاصل کرتا تھا ' میں بھی اس ادارے کا رکن تھا - اس کے ارکان اور اپنے احباب کی ہمراہی میں یا تن تنہا میں یورپ کا ایک ایک چپا چھان چکا تھا - ہمارا سفر اس لحاظ سے خاص امتیاز رکھتا تھا کہ ہم مشہور مقامات کی زیارت کو کوئی اہمیت نہ دیتے تھے - دوری ناپنا یا کھنڈروں کو دیکھنا ہمارا مقصد نہ تھا - ہمارے سفر کا طریقہ یہ تھا کہ جو بھی دلکش مقام نظر آتا ' ہم وہاں ڈیرا ڈال کر پڑ جاتے تھے - دوسری خصوصیت یہ تھی کہ ہم اس

جگہ کو اپنے ذوق کے مطابق بنانے کی کوشش نہ کرتے تھے بلکہ اپنے کو اس ماحول کے مطابق بنا لیتے تھے —

ایک مرتبہ اسی طرح میں گھومتا پھرتا نیپلس کے قریب 'کیپری' نامی خوبصورت جزیرے میں جا پہنچا - 'کیپری' اپنے قدرتی مناظر کے لیے ساری دنیا میں مشہور ہے - اور صحت کا سودا خریدنے کے لیے وہاں بیمار امیروں کی بھیڑ لگی رہتی ہے - خوشا نصیب کہ اس وقت تک اپاہجوں کا موسم شروع نہ ہوا تھا اور جب میں وہاں پہنچا تو بھیڑ بہت کم تھی —

میں کیپری میں نو وارد نہ تھا - پہلے بھی میں یہاں آ چکا تھا - پچھلی دفعہ میں وہاں ایک روسی خاندان کا مہمان تھا - اس مرتبہ بھی انہیں بھلے مانسوں نے مجھے ایک کمرا کرایے پر دے دیا - اس میں اپنا سامان رکھ کر میں سمندر کی سیر کے ارادے سے لباس تبدیل کرنے لگا - اتنے میں میری نظر سامنے کے چمن کی طرف گئی تو دیکھا ایک بوڑھا آرام کرسی پر دراز اخبار پڑھ رہا ہے - اس کی دھج ظاہر کر رہی تھی کہ وہ یوروپین نہیں ہے - وہ کُرتے پاجامے میں ملبوس تھا - کُرتے کے گلے کی پٹی اور سامنے کے حصے پر کشیدے کا کام تھا - یہ کشیدہ ویسا ہی تھا جیسا لکھنؤ کی دو پلی ٹوپیوں پر ہوتا ہے - پاجامہ دھاری دار موٹے کپڑے کا تھا جیسا ہمارے ملک کے مسلمان خانساماں کبھی کبھی پہنتے ہیں - پیروں میں بوٹ بہت اونچا تھا - یورپ میں صرف اہل روس ایسا لباس استعمال کرتے ہیں - لیکن کیپری جیسی جگہ میں ان کو بھی بھیس بدلتے دیر نہیں لگتی - وہاں ایسے روسی شاذ و نادر نظر آتے ہیں جو ملکی وضع قطع پر قایم رہیں - چنانچہ' اس بوڑھے کو دیکھ کر میں نے قیاس کیا کہ

صاحب خانہ کی غیر حاضری میں ان کا باورچی آرام کرسی پر لیٹا ہوا ہے —

میں اس اُدھیڑ بن میں تھا کہ لیڈا لیڈی نے مجھے کافی پینے کے لیے بلایا - کافی پیتے پیتے میں نے اس بوڑھے کے متعلق دریافت کیا - لیڈا لیڈی نے کہا "انہیں نہیں جانتے یہی تو ہم لوگوں کے داد شکا گورکی* ہیں" ! —

اس سے زیادہ تعارف کی ضرورت نہ تھی - اسی دن میں تیسرے پہر لیڈا لیڈی کے ساتھ گورکی کے گھر گیا - اس وقت بھی وہ برآمدے میں بیٹھے ہوئے تھے - لیڈا لیڈی نے ہنستے ہوئے کہا "یہ ہندستانی ہیں اور آپ کے بڑے مداح ہیں - آپ کی طرح انہوں نے بھی بڑی آوارہ گردی کی ہے - پیدل یا سائیکل اور کشتی پر بیٹھ کر انہوں نے سارا یورپ چھان مارا ہے - اب یہ جنوب کی سیر کو نکلے ہیں' —

گورکی میری طرف دیکھنے لگے - ان کے چہرے پر مسکراہٹ تھی - میں نے جھک کر کہا 'جد راستویتے' (آداب) -

'جد راستویتے! جد راستویتے' ! کہتے ہوئے انہوں نے میری طرف ہاتھ بڑھایا اور ایسی گرم جوشی سے مصافحہ کیا گویا انہوں نے مجھے گود کھلایا تھا اور میں ایک عرصے کے بعد ان سے مل رہا ہوں - کہنے لگے "روسی تو تم خوب بول لیتے ہو - کہاں سیکھی" ؟ —

"یوں تو میں نے فرانک فورٹ کی یونیورسٹی میں ہی شد بد شروع کردی تھی - پھر جب سویڈن گیا تو مجھے ایک

* روسی زبان میں 'دادا' کو داد شکا کہتے ہیں - روس کے نوجوان گورکی کو پیار سے 'دادا' کہہ کر مخاطب کرتے ہیں —

جلا وطن روسی گھرانے کے ساتھہ ٹھہرنا پڑا ان لوگوں کو روسی کے سوا اور کوئی زبان نہ آتی تھی' اس لیے مجبوراً مجھے بھی روسی سیکھہ لینی پڑی —

" اخاہ ' تم تو دور دور تک دھاوے مار چکے ہو " ؟

گورکی نے میری آوارہ گردی کا قصہ بڑے غور سے سنا - جب انھیں معلوم ہوا کہ جرمنی سے ڈاکٹری کی سند لے لینے کے بعد میں ہالینڈ کے ایک کسان کے یہاں مرغیوں کو دانہ چگانے کا کام کرتا تھا' تو ہنستے ہنستے اُن کا برا حال ہوگیا - اس قسم کے واقعات سنانے کا خاص طور پر اصرار کیا - جب انھیں معلوم ہوا کہ میں بڑی جہاز میں ایک باورچی کا شاگرد رہ چکا ہوں اور وہاں میرا کام آلو چھیلنا تھا' تو وہ ہنستے ہنستے لوٹ گئے - آنکھوں میں آنسو آگئے مگر پھر بھی ہنسی نہ تھمی - شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ بچپن میں گورکی بھی ایک جہاز کے باورچی کے شاگرد رہ چکے تھے —

اس سے پہلے میں یورپ کے متعدد بڑے بڑے مصنفوں سے مل چکا تھا لیکن بلا مبالغہ کہہ سکتا ہوں کہ ان میں سے کسی کو میں نے گورکی کا مخلص نہ پایا - سب سے پہلی مرتبہ میں نے ایک بڑے اہل قلم کے چہرے پر ایسا بھولا پن' ایسی بچوں کی سی ہنسی اور گفتگو میں ایسی سادگی دیکھی - پہلی ملاقات میں مجھہ سے وہ اس طرح بے تکلف ہوگئے گویا ہم دونوں ہم مکتب ہیں —

دوسرے دن میں کرایے کی کشتی لے کر خود کھیتا ہوا دور تک نکل گیا - جب لوٹا تو کنارے پر گورکی کھڑے ہوئے تھے پوچھا " ؟ —

"زاؤ تو تم خوب چلالیتے ہو - کہاں تک گئے تھے" ؟ —

" یہاں کی کشتیاں وزنی ہوتی ہیں - تفریح تو خیر کیا'

خاصی ورزش ہوجاتی ہے' - "ہماری وولگا ندی میں جو کشتیاں چلتی ہیں وہ ان سے کہیں اچھی ہوتی ہیں - سامنے سے ایک ملاح آرہا تھا گورکی نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا " روسی ملاح ان سے کہیں زیادہ سدھے اور اپنے کام میں ہوشیار ہوتے ہیں - وہ اپنی پتوار پانی میں اتنی نیچے نہیں لے جاتے جتنی یہاں والے - اسی وجہ سے محنت بھی کم پڑتی ہے اور ناؤ تیز بھی جاتی ہے" - پھر کچھہ دیر سوچ کر کہنے لگے - " ایک عرصہ گزر چکا - اسی کھیری میں سمندر کے کنارے ملاحوں کو دیکھہ کر لینن نے کہا تھا کہ اطالوی ملاح بڑے بدھو ہوتے ہیں - انہیں ناؤ چلانے کا شعور نہیں" —

گورکی نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں وولگا ندی کا جو ذکر کیا ہے وہ مجھے یاد آگیا - وولگا کے ملاحوں کا مشہور گیت کانوں میں گونجنے لگا -

" آہ — پوہ خلیم — ایشیو راجکہ — ایشیا راس — "

" زور لگا دیے ہیا ——— مارو تھیلا بھیا ——— "

جب ندی کا دھارا الٹا بہتا ہے تو کچھہ ملاح کنارے پر اتر کر اس میں رسی باندھ کر کھینچتے ہیں اور ایک ساتھہ زور لگانے کے لیے ہلکارے بھرتے ہیں - اسی کو لے کر یہ ملاحوں کا گانا بن گیا ہے —

یہ گیت میں کئی مرتبہ سن چکا تھا لیکن اس کا حسن اس وقت ظاہر ہوا جب گورکی کی زبانی میں نے وولگا کا حال سنا - گورکی کی خصوصیت کا علم بھی اسی وقت ہوا - میں ان کی بالغ نظری یا وسیع علم سے متاثر نہ ہوا تھا - واقعہ یہ ہے کہ ان کے چہرے پر لاؤ بالی پن اور خود فراموشی کی کیفیت میرے لیے نہایت دلکش تھی -

ان سے باتیں کرتے وقت مجھے یک بہ یک محسوس ہوا کہ عرصۂ دراز سے میرے تخیل میں جو دھندلی سی تصویر پوشیدہ تھی وہ اب بہت صاف ہوگئی ہے اور اس کے ہر خط کو میں اپنی آنکھوں کے آگے دیکھہ رہا ہوں - مجھے یقین ہوگیا کہ کیپری کا یہ سفر میرے لیے مبارک ثابت ہوا - شمال کے پرندے گرمی اور روشنی کی تلاش میں ادھر آتے ہیں - مجھے گورکی سے یہ روشنی حاصل ہوئی - میں نے کیپری میں چند ماہ گزارنے کا تہیہ کرلیا - یہ مختصر سا زمانہ میری زندگی کا عہدزریں تھا - تقریباً میں ہر روز گورکی بابا کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا - خوب باتیں ہوتی تھیں - گورکی میری خانہ بدوشی کا احوال سنتے اور اکثر اپنی رام کہانی سناتے تھے - ایک بار انہوں نے پوچھا کہ "کبھی تمھیں بھیک بھی مانگنا پڑی تھی" ؟ —

"جی نہیں اس کی نوبت تو کبھی نہ آئی - محنت مزدوری سے اتنے پیسے مل ہی جاتے تھے کہ کسی طرح روٹیاں چل جائیں" —

گورکی نے کہا "اس لحاظ سے تم خوش قسمت ہو - مجھے تو اکثر بھیک مانگنی پڑی تھی - لیکن تجربے نے یہ بتایا کہ منت سماجت سے بھیک بھی نہیں ملتی - کسی زمانے میں ایک خانہ بدوش دوست کے ساتھہ میں روس کی خاک چھان رہا تھا - بھوک کے مارے آنتیں قل ہواللہ پڑھ رہی تھیں - کسی مکان کی چوکھٹ پر ایک عورت بیٹھی ہوئی تھی ' اس سے میں نے گڑگڑا کر کچھہ کھانے کو مانگا - اس نے بگڑ کر کہا "جاؤ جاؤ ' یہاں تمھارے باوا کچھہ کھانے کو رکھہ گئے ہیں - ہم نے تم جیسے بہت بد معاش دیکھے ہیں" - اس پر میرے ساتھی نے آنکھیں نکال کر کہا "کیا کہا" ؟ عورت اٹھی اور بڑبڑاتی ہوئی اندر چلی گئی - "ابھی میں فلاں کو بلاؤں گی

تو وہ آکر ٹھیک کردے گا۔ بچے کے باپ کو خبر ہوئی تو وہ تمھاری مرمت کردے گا"۔ لیکن ایک لمحے میں وہ ہمارے لیے مکھن اور روٹی لے کر آگئی۔ بھائی، شرافت پر تو بھوک بھی نہیں ملتی" —

دوران گفتگو میں گورکی نے پوچھا - "کبھی تمھیں ایسا بھی سابقہ پڑا کہ رات کو کہیں ٹھکانا نہ ملا ہو یا سونے کے لیے بہت بری جگہ ملی ہو"؟ میں نے کہا - "ایک آدھ بار یہ ضرور ہوا کہ سردی میں کوئی جگہ نہ ملی تو کسی کے غسل خانہ میں رات کاٹنی پڑی" —

گورکی کہنے لگے - "مجھ پر ایسے سیکڑوں حادثے گزرے ہیں۔ ایک مرتبہ بڑا لطف آیا۔ پھرتا پھراتا میں رات کو کسی گاؤں میں پہنچ گیا۔ رات کاٹنے کے لیے میں ایک ایک دروازہ کھٹ کھٹاتا پھرا۔ کسی نے دروازہ نہ کھولا۔ اگر کوئی باہر نکلا تو ٹکا سا جواب دے دیا۔ ایک صاحب کے آگے میں بہت رویا تو وہ بگڑ کر بولے بھاگتے ہو تو بھاگو ورنہ میں کتے تم پر چھوڑ دوں گا'۔ خیر آگے جا کر پھر ایک دروازہ کھٹ کھٹایا۔ بغل کی ایک کھڑکی کھلی اور اس میں سے ایک عورت نے اندھیرے میں سر نکال کر آہستہ سے کہا۔ 'آج نہیں، آج وہ گھر پر ہیں"! یہ کہہ کر گورکی نے ایک قہقہہ لگایا —

لینن کا ذکر آنے پر ایک روز گورکی نے کہا - "انقلاب روس کے بعد جب خانہ جنگی شروع ہوئی تو ہر طرف قحط پھیل گیا۔ لوگ بھوکے مر رہے تھے۔ کھانے کا ساماں بہت کم تھا۔ سب کو راشن کا ٹکٹ ملتا تھا۔ مقررہ مقدار سے کسی کو زیادہ غذا نہ ملتی تھی - جب میں لینن سے ملنے کے لیے گیا تو انھوں نے سب سے پہلے یہ سوال کیا کہ 'آج تم نے کچھ کھایا ہے یا نہیں'؟ میں اپنی آنکھوں سے لوگوں کو بھوک سے تڑپتا دیکھ چکا

تھا ' اس لیے میں نے جھوٹ موٹ کہہ دیا کہ ہاں میں کھا کر آیا ہوں - لینن نے کہا کہ تم یونہی کہہ رہے ہو - اچھا کہو تو کیا کھایا اور کہاں کھایا ' ؟ میں نے باتیں بنا کر کہا کہ ایک لنگر خانے میں اُبلی ہوئی کودوں نمک مرچ کے ساتھہ مل گئی تھی - '' لیکن لینن جیسے ہوشیار کے آگے مجھہ جیسے اناڑی کی گپ کب چل سکتی تھی - وہ فوراً اٹھہ کر گئے اور روٹی کا ایک پیکٹ لاکر مجھے کھانے کے لیے دیا - لینن کو اپنے حصے کی جو روٹی ملتی تھی اس میں سے خود بہت تھوڑی کھاتا تھا اور باقی دوسرے ضرورت مندوں کو دے دیتا تھا - روٹی کھا چکنے پر وہ مجھہ سے بولا : ' تم انقلابی ادب کے علم بردار اور سوویٹ روس کے سب سے بڑے مصنف ہو - تمہیں اس کا اختیار نہیں کہ فاقوں سے خود کشی کرو - سوویٹ حکومت غریب ہے ' تاہم وہ تمہیں روپے دے گی کہ تبدیل آب و ہوا کے لیے کیپری میں رہو - یاد رکھو کہ تمہاری روح اور جسم انقلاب کی امانت ہیں ' انہیں برباد کرنے کا حق تمہیں نہیں ہے ' - بعد ازآں لینن نے خرچ دے کر مجھے یہاں بھیج دیا ! " —

کبھی کبھی گورکی کہتے تھے کہ " اس زمانے کی آوارہ (Tramp) زندگی کی نوعیت ہی بدل گئی ہے - اُن دنوں آوارہ گردی کے لیے ایک دو یار مل ہی جاتے تھے - یہ سن کر تمہیں حیرت ہوگی کہ ایک بار مجھے ایک خانہ بدوش شہزادہ مل گیا تھا '' —

واقعی یہ سن کر مجھے تعجب ہوا —

" کریمیا میں اس سے ملاقات ہوئی - اس نے بتایا کہ وہ شہزادہ ہے اور باپ کے گھر سے بھاگ آیا ہے - طفلس میں اس کے باپ کا شان دار محل ہے - میں اس کے بھرے میں آگیا اور

اس کی بڑی خاطر مدارات کی - هم دونوں پیدل طفلس
کو روانه هوئے - میں جو بھیک مانگ کر لاتا اسے بزنت کھاتا
تھا - کبھی کبھی خود آدھا پیٹ کھا کر رہ جاتا تھا لیکن اسے
پیٹ بھر کھلا دیتا تھا - سوچا تھا کہ طفلس پہنچ کر کچھ دن
اس کے محل میں نہات سے رهیں گے - خدا خدا کرکے مہینوں
کے بعد جو طفلس میں داخل هوئے تو شہزادہ صاحب ایسے
غایب هوگئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ - ان کے باپ کا پتا چلایا
تو معلوم هوا که اس نام کا وهاں کوئی آدمی نہیں هے" —

گورکی عالمگیر اور لازوال شهرت کے مالک تھے لیکن خود پسندی
یا غرور سے قطعاً نا آشنا تھے - ایک روز یہ قصہ سنانے لگے کہ کسی جلسے
میں ان کی بڑی تعریفیں کی گئیں - مقررین نے مدح سرائی کے غلو میں
کہا کہ گورکی کی شخصیت نہایت بلند پایہ اور عظیم الشان هے - گورکی
نے فوراً تردید کی اور کہا کہ " میں نہ تو بہت اونچا هوں نہ بہت بڑا -
میں صرف اتنے فٹ اونچا هوں اور وزن میں بھی صرف اتنے پونڈ هوں"
گورکی کی صحبت میرے لیے رحمت ثابت هوئی - اسی زمانے سے نجی ،
ملکی اور دنیوی مسائل کو میں ایک نئے نقطۂ نظر سے دیکھنے لگا - گورکی
نے وقتاً فوقتاً مجھے جو تعلیم دی اس کا خلاصہ یہ هے :—

" بنی نوع انسان آج جس مرض میں مبتلا هیں اسے دور کرنے
کے لیے سب سے پہلے یہ ضروری هے کہ ظلم اور بے انصافی کے
خلاف همارے دل میں نفرت کا جذبہ پیدا هو - لیکن اس نفرت
کا مقصد یہ هونا چاهیے کہ جو نظام — خواہ وہ اقتصادی
هو یا سماجی یا سیاسی — همیں کچل رها هے اسے نیست و نابود

کردیں اور اس کی جگہ پر ایک ایسا نظام قایم کریں جس
میں ظلم اور لوٹ کا امکان نہ ہو اور وہ انسانیت کو وحشت
کے غار سے نکال کر ایک برتر نصب العین کی طرف لے جائے -
یہ کام بہت بڑا ھے اور صرف اشک شوئی سے انجام نہیں پاسکتا -
سماج اور دیس کی زبوں حالی پر آنسو بہاکر چپ ہوجانا
بزدلی ھے - اسے سمجھنے کے بعد لفاظی بگھار کر گھر بیٹھہ رھنا
کمینہ پن سے کم نہیں ھے - ان مسایل کا صحیح حل مل جانے کے
بعد اس پر عمل نہ کرنا ریاکاری ھے - ھمارا فرض رودھو کر ' کوس
کر یا باتیں بناکر ختم نہیں ھوجاتا - ھمارا فرض منصبی ھے
موجودہ نظام استحصال کو مٹانا —

اس تغیر کے لیے جن حربوں سے کام لیا جائے گا اس میں ادب کا
مرتبہ بہت بلند ھے - ذمہ وار ادیبوں کا فرض ھے کہ وہ مظلوموں میں ظلم
کے خلاف نفرت پیدا کریں - اگر لوگوں میں نفرت کی آگ دھک اٹھی تو وہ اپنی
آزادی کے لیے یقیناً بر سر پیکار ھونگے - اب سوال یہ ھوتا ھے کہ پرانے
نظام کو مٹانے اور نیا سماج قایم کرنے والوں کے رھبر کون ھونگے ؟ سرمایہ
دار ' شریف ' ریاکار پادری ' عقل کے اجارہ دار ؟ نہیں ان میں سے کوئی
بھی مستقبل کا رھنما نہ ھوگا ' دور جدید کا پیشوا ھوگا " مزدوروں کا طبقہ
جو آج اپنی حالت سے بے خبر ھے " —

یہی وجہ تھی کہ گورکی کا قلم متواتر آدھی صدی تک ناحق کے
خلاف اور حق کی تائید میں شمشیر زن رھا - گورکی کو انقلابیوں کی
صف اول میں جگہہ ملے گی - اس نے انقلاب کی روکو پہچانا تھا - یہی
نہیں بلکہ اس کے ساتھہ بہنے والوں میں وہ پیش پیش تھا - مزدوروں کا

باطنی حسن، ان کے دلوں میں چھپی ہوئی آگ اور اس آگ کی انقلاب انگیز قوت کی تصویر کھینچنے والوں میں گورکی کا نام سب سے پہلے آتا ہے - وہ پرولیٹرین ادب کا آدم سمجھا جائے گا - گورکی کو ایک نظر دیکھتے ہی معلوم ہو جاتا تھا کہ یہ متحرک کوہ آتش فشاں ہے - معمولی ادب کے بڑے سے بڑے نمائندے سے گورکی کا مقابلہ کرنا گویا گورکی کی توہین ہے - اس شخص کے رتبے کو پہچاننا آسان نہیں ہے —

اپنی زندگی کے آخری دور میں گورکی نے خادمان خلق ادیبوں کی ایک فوج طیار کردی ہے - اس میں ایک بہت بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ ہر انقلابی ادیب کی حوصلہ افزائی ذاتی طور پر کرتا تھا اور انہیں ترقی کی راہ دکھانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتا تھا - دنیائے ادب میں گورکی نے ایسی آب یاری کی ہے کہ آج وہ نئی قوتوں کے ہمدوش ہوکر نئے سماج کی تخلیق میں مصروف ہے —

روس کی ہولناک سردی گورکی کو راس نہ آتی تھی - اس زمانے میں وہ کیپری چلا آتا تھا - لیکن اس وقت بھی وہ چین سے نہ بیٹھتا تھا - جب میں اس سے ملا تو وہ ایک بہت بڑی تنظیم میں منہمک تھا - وہ آوارہ اور خانہ بدوش لوگوں کی زندگی سدھارنے کی فکر میں تھا - خانہ جنگی نے روس کو تباہ حال کر دیا تھا اور ہزاروں یتیم بچے خانماں برباد ہوکر مارے مارے پھر رہے تھے - بھیک مانگ کر جیب کاٹ کر یا چوری کرکے وہ اپنے دن کاٹ رہے تھے - روس کے نئے سماج میں ان کا وجود شرمناک تھا - گورکی نے انہیں آوارہ لڑکوں کی اصلاح کا کام اپنے ذمے لیا تھا - اس کام میں گورکی کو بہت کامیابی ہوئی —

آوارہ گردوں کی صلاحیت کو گورکی نے لوٹ مار کے بجائے سماج کی

خدمت کی طرف رجوع کردیا - حکومت نے ان کی تربیت اور اصلاح کے لیے سارے ملک میں ادارے قایم کردیے اور انہیں وہاں رہنے کے لیے مجبور کیا - گورکی کی نگرانی میں ان کی تعلیم کا انتظام کیا گیا - چند سال کی مہلت کا نتیجہ یہ نکلا کہ انہیں خانہ بدوشوں میں سے کئی اچھے ادیب پیدا ہوئے - گورکی ان کی تصانیف کو خود اصلاح دے کر مرتب کرتا تھا - ان میں سے ایک کا نام 'اویدکو' ہے جس کی عمر ابھی صرف ۲۲ سال ہے - اس کی کتاب "میں پیار کرتا ہوں" ادب عالم سے خراج تحسین وصول کرچکی ہے - گورکی بتلاتے تھے کہ یہ 'اویدکو' کی خود نوشت سوانح عمری ہے - اس میں اس نے زندگی کے اس دور کا حال لکھا ہے جب وہ ڈاکو تھا - گورکی نے اور بھی کئی خانہ بدوشوں کے حالات جمع کرکے شائع کیے ہیں —

اس طرح گورکی نے اپنی زندگی اور کاموں سے یہ ثابت کردیا کہ موجودہ سماج جن لوگوں کو 'آوارہ' سمجھتا ہے ان کی صلاحیت کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا اور اگر ان لوگوں سے کام لیا جائے تو دنیا کو بہت فایدہ ہوسکتا ہے - اگر آج یہ جرایم پیشہ ہیں، تو اس کے لیے سماج کا موجودہ نظام ذمہ دار ہے جو ان کو اصلاح کا موقع نہیں دیتا —

ادیب اور مصنف اس سلسلے میں بہت کام کرسکتے ہیں - لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب وہ ادب کے نام پر اپنے آپ کو دھوکا دینا چھوڑ دیں - مصائب اور مظالم کو بھولنے کے لیے اگر وہ دنیائے تخیل میں جلت نگاہ اور فردوس گوش بناتے رہیں گے تو وہ انحطاط کے جہنم میں گر پڑیں گے - ادیب اپنی اور اپنے ملک وقوم کی خدمت اسی حالت میں انجام دے سکتے ہیں جب اس نظام زندگی کو بے نقاب کرنا سیکھ جائیں -

اس کا یہ نتیجہ ہوگا کہ لوگ اپنی بد حالی کے اسباب کو سمجھنے لگیں گے اور اسے بدل کر ایک ایسی دنیا بنانے کی جد و جہد کریں گے جس میں عدم مساوات اور زور و جبر کے لیے جگہ نہ ہوگی —

میں اپنے ملک کے نوجوان ادیبوں کی خدمت میں عرض کرونگا کہ وہ گورکی کی زندگی اور تصنیفوں کا مطالعہ کریں اور انہیں شمع ہدایت بنائیں - اگر ان میں سے تھوڑے سے لوگ اس راہ پر چلنے لگیں گے تو ہماری مشکلیں بہت آسان ہوجائیں گی —

گورکی کے ساتھ جو چند مہینے میں نے بسر کیے وہ مجھے ہمیشہ یاد رہیں گے —

(ترجمہ از وشال بھارت)

" اردو رسم الخط کے متعلق ایک مشورہ "

از

سید التفات حسین صاحب - بی - اے - (لک)

سابق سکرٹری

لکھنؤ یونیورسٹی اردو لٹریری سوسائٹی

جہد للبقاء :—

قومیت کا تخیل ہندوستان کو آزاد کرانے کی بجائے اس کی فرقہ پرستیوں اور خانہ جنگیوں میں روز افزوں ترقی کا باعث ہو رہا ہے - ہندوستان کی سیاسی دنیا میں اس قسم کی کشاکش اس قدر ناموزوں نہ تھی مگر اب ادبی دنیا میں بھی تعصب و تنگ نظری کا دور دورہ نظر آتا ہے - اتحاد قومی کی بنیادیں مضبوط ہونے کی بجائے روز بروز کمزور ہوتی نظر آرہی ہیں - ایک مشترکہ قومی زبان کے تخیل نے مادر ہند کی جڑواں بیٹیوں یعنی اردو ہندی میں بھی ایک تنازعہ پیدا کرا دیا ہے - طرفہ ماجرا یہ ہے کہ ہندوستانی تو ابھی تک ایک متحدہ قوم ہونے کا ثبوت نہیں دے سکے لیکن ہم ہیں " کہ داشتہ آید بکار کے مصداق اس منتشر قوم کے لیے بھی ایک مشترکہ قومی زبان کے متلاشی ہیں - وہی مثل ہے کہ گھوڑا خریدنے کے لیے تو رقم پاس نہیں لیکن کوڑا پہلے ہی سے خریدا جارہا ہے ... ... - کاش " ہندی ہندستانی " اور " ہندستانی "

کا فرق ظاہر کرنے والی باریک بین نگاہیں قومی رواداری سے کام لیتیں اور انصاف سے چشم پوشی نہ کرتیں تو آج اس فرق کی ضرورت نہ لاحق ہوتی ۔ لیکن کیسی قومیت ' کہاں کی آزادی اور کیسی قومی رواداری' مقصد تو یہ ہے کہ برطانیہ کی سرپرستی کا طوق غلامی پہن کر ایک ہندو آریائی تمدن کی تعمیر اور اس کی بنیاد مستحکم کرنے میں ہمہ تن مشغول ہو جائے اور اس وقت تک آزادی کا نام بھی زبان پر نہ لائے جب تک یہ آریائی تمدن ہندستان پر اس قدر حاوی نہ ہو جائے کہ دوسرے تمدن کی جگہ باقی نہ رہے ۔ اس قسم کی تمناؤں اور آرزوؤں کا وجود تو ایک ہوائی قلعے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا لیکن اس قسم کے فرقہ وارانہ تنازعات میں ہر روز ایک نیا اضافہ یہ معنی بیشک رکھتا ہے کہ کتاب غلامی کے اوراق پریشاں کو پھر جمع کیا جارہا ہے تاکہ برطانوی جلد ساز کی اعانت سے اس کی شیرازہ بندی کی جائے اور صحیفۂ آزادی کو بالائے طاق رکھ کر استاد برطانیہ کی زیر نگرانی سبق غلامی کی ابجد پھر شروع کی جائے ۔

بہر صورت ایک مشترکہ قومی زبان کا تخیل اور اس کی تعمیر کی کوشش خواہ کتنی ہی نا وقت اور ناموزوں کیوں نہ ہو لیکن اب تو وہ تعصب و تنگ نظری کے ہاتھوں اردو ادب کے موجودہ زمانے کو "جہد للبقا کا دور" بنانے میں سخت کوشاں نظر آرہی ہے ۔ اردو سے اب ہمارا حسب معمول تغافل کسی حال میں بھی جائز نہیں یہ ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ اردو ادب کی روز افزوں ترقی کے ذرائع پیدا کرنا ہمارا فرض منصبی ہوگیا ہے ۔ اس ہنگامہ آرائی کو اردو ادب کے لیے بیداری کا پیغام سمجھ کر ہمیں ہر جد و جہد کے لیے تیار ہو جانا چاہیے ۔

تمنا آبرو کی ہے اگر گلزار ہستی میں تو کانٹوں میں اُلجھہ کر زندگی کرنے کی خوکرلے

اردو ادب اور مشترکہ قومی زبان کی مشکلات :-

ہندوستان کی ایک مشترکہ قومی زبان کی تعمیر میں دو اہم مشکلات درپیش ہیں - ایک تو زبان کی ادبی حیثیت اور دوسرے رسم الخط - اول الذکر کے متعلق تو پروفیسر ساہم مرحوم' ڈاکٹر انصاری مرحوم' مولانا عبدالحق صاحب اور دوسرے مشہور ادیبوں کے دلائل اور تجاویز پر اگر بہ نظرانصاف غور کیا جائے تو اردو یقینی اس کی مستحق ہے کہ وہ ہندوستان کی مشترکہ قومی زبان تسلیم کی جائے - اس میں شبہہ نہیں کہ ان حضرات کی تجاویز پر عمل کرنے سے تمام ادبی مشکلات رفع ہوسکتی ہیں لیکن جہاں تک مجھے علم ہے اردو رسم الخط کی دشواریاں رفع کرنے کے لیے ابھی تک کوئی معقول تجویز نہیں پیش کی گئی ہے - اصل پوچھئے تو اردو ادب میں سب سے زیادہ مشکل اور دقت طلب چیز اس کا رسم الخط ہے اور یہی وہ عنصر ہے جو سب سے زیادہ اس کے مقبول عام ہونے میں حارج ہے - اس سے قطعاً انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اردو بولنے والوں سے اردو لکھنے والوں کی تعداد بہت کم ہے - جہاں تک اردو زبان کی ادبی حیثیت کا تعلق ہے ہمیں زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ اس میں ایک عام زبان ہونے کی فطری صلاحیت موجود ہے - اگر اس معاملے میں صرف معمولی کوشش اور احتیاط سے بھی کام لیا جائے تو اردو بہت جلد مقبول عام ہوکر ایک قومی زبان بن سکتی ہے - لیکن یہ واضح رہے کہ باوجود اس فطری صلاحیت کے اردو زبان کا فروغ اور اس کی عام مقبولیت کا خیال اس وقت تک ایک خواب و خیال کی حیثیت رکھتا ہے جب تک کہ ایک ایسا آسان رسم الخط ایجاد نہیں ہوتا جو تحریر'

لیلو ٹائپ اور ٹائپ رائٹر کے لیے بہ آسانی استعمال کیا جاسکے - ہمیں اگر اردو کا فروغ منظور ہے تو جلد از جلد اس نے رسم الخط کی طرف متوجہ ہونا چاہیے اور ایک آسان ٹائپ رائٹر اور لیلو ٹائپ ایجاد کرکے دوسری ہندوستانی زبانوں پر سبقت حاصل کرنا چاہیے -

اردو رسم الخط کی دشواریاں :-

اردو رسم الخط کی دشواریوں کو ہم دو حصوں میں تقسیم کرسکتے ہیں -

۱ - اتصالی مشکلات - وہ دشواریاں جو اشکال حروف اتصال حروف، شوشے، مرکز اور اعراب وغیرہ سے تعلق رکھتی ہیں —

۲ - صوتی مشکلات - وہ دشواریاں جو مشتبہ لصوت حروف اور الفاظ وغیرہ سے تعلق رکھتی ہیں —

اتصالی مشکلات :

ایک عام شکایت یہ ہے کہ اردو میں ایک حرف کسی دوسرے حرف سے ملاکر لکھا جاتا ہے تو اس حرف کی حقیقی صورت میں اس قدر تغیر ہو جاتا ہے کہ وہ صرف ایک نشانی کی طرح باقی رہ جاتی ہے اور اس پر طرہ یہ کہ مقام استعمال اور موقع کے اعتبار سے یہ نشانیاں اس طرح بدلتی رہتی ہیں کہ ان کے متعلق کوئی قاعدہ نہیں وضع کیا جاسکتا - اول تو یہ اعتراض کسی حد تک مبالغہ آمیز ہے - دوسرے یہ کہ اس اعتراض کا سبب زیادہ تر ہمارا ناقص طرز تعلیم ہے - ایک مبتدی کو اردو کی ابجد پڑھاتے وقت حروف تہجی کی اس قدر ناقص تعلیم دی جاتی ہے کہ وہ حروف کی ساخت سے بالکل ناآشنا رہتا ہے - صرف "الف بے" رٹا دینے سے ایک مبتدی ہرگز ہرگز حروف کی ان تمام شکلوں سے واقف نہیں ہوسکتا جو اردو کی روز مرہ تحریر میں مستعمل ہیں -

آپ اگر حسب ذیل طریقۂ تعلیم کی تجویز پر غور کریں تو فوراً اسے تسلیم کرلیں گے کہ ہمیں اتصالی مشکلات کبھی پریشان نہیں کرسکتی ہیں بلکہ اردو رسم الخط میں یہی خوبی ایک ایسی چیز ہے جو کسی دوسرے رسم الخط میں نظر نہیں آتی —

(الف) اشکال ابجد

اردو کی ابجد صرف اکیس شکلوں پر منحصر ہے: ا، ب، ج، د، ر، س، ص، ع، ف، ق، ک، ل، م، ن، و، ہ، ھ، لا، ی، ے — ان شکلوں میں صرف نقطے اور مرکز وغیرہ لگانے سے پوری ابجد کے حسب ذیل اٹھائیس (۲۸) حروف بنتے ہیں: ا - ب - پ - ت - ٹ - ث - ج - چ - ح - خ - د - ڈ - ذ - ر - ڑ - ز - ژ - س - ش ص - ض - ط - ظ - ع - غ - ف - ق - ک - گ - ل - م - ن - و - ہ - ھ - لا - ی - ے — اگر نقطوں کا فرق شروع ہی سے مبتدی کے ذہن نشین کرایا جائے اور یہ بتایا جائے کہ در اصل ج - چ - ح - خ کی شکلیں یکساں ہیں اور صرف نقطوں کا فرق ہے تو ان حروف کے لیے مبتدی کو صرف 'ح' کی شکل یاد رکھنا ہوگی - اسی طرح ب - پ - ت - ٹ - ث، د - ڈ - ذ، ر - ڑ - ز - ژ، س - ش، ص - ض، ط - ظ، ع - غ اور ک - گ کا فرق بھی مرکز اور نقطوں کے ذریعے بتایا جا سکتا ہے - یہ طریقۂ تعلیم خانگی مکتبوں میں ضرور رائج ہے مگر ناقص طریقے سے - بچوں کو آج بھی یہ بتایا جاتا ہے کہ الف خالی، ب کے نیچے ایک نقطہ، ت کے اوپر دو نقطے، ح خالی ج کے پیٹ میں ایک نقطہ - اس کا اصل مقصد یہ تھا کہ مبتدی نقطوں کا فرق محسوس کرسکے اور ابجد کی شکلیں اسے بہ آسانی یاد ہوجائیں - لیکن مولوی صاحب اس فرق کو ذہن نشین کرانے اور سمجھا کر یاد کرانے کی بجائے لڑکوں کو ڈنڈے کے زور سے رٹایا کرتے ہیں -

قواعد بغدادی اور جدید پرائمر وغیرہ میں بھی اس فرق کو سمجھانے کی کوشش نہیں کی گئی —

مدرسوں میں بھی مبتدیوں کو حروف کی آوازیں رٹوائی گئیں اور یہ طے کر لیا گیا کہ مبتدی آہستہ آہستہ اشکال حروف سے خود بخود آشنا ہو جائے گا - جب مبتدی نے الفاظ پڑھنا شروع کیے تو اسے ایک نئی زحمت کا سامنا پڑا کہ اب اُسے ہر حرف کے چار چار بچے نظر آنے لگے جن سے وہ کبھی روشناس نہیں کرایا گیا تھا۔ اس نے دیکھا کہ "دھوبی - جلیبی - بندر - بجلی" میں ب کی شکلیں بدل گئیں ہیں - مولوی صاحب اور اسکول کے مدرس صاحب اس سے زیادہ کچھ نہیں فرماتے کہ یہ بھی 'ب' ہے - اگر اس وقت بھی غریب مبتدی کو یہ بتا دیا جائے کہ ہر حرف کی چار شکلیں ہوتی ہیں اور ان کا استعمال کس طرح ہوتا ہے تو وہ بے چارہ آئندہ کی زحمتوں سے بچ جائے لیکن اتنی درد سری کیوں گوارا فرمائی جائے - آپ خود خیال فرمائیے کہ ابجد کی صرف اکیس شکلیں تھیں ان میں نقطے اور مرکز وغیرہ کا فرق پیدا کرنے سے اڑتیس شکلیں بنائی گئیں - اس کے بعد بھی ہر حرف کی چار چار پانچ پانچ شکلیں کی گئیں اور اس طرح کل ایک سو چھپن (۱۵۶) شکلیں ہوئیں (ملاحظہ ہو نقشۂ ابجد) اتنے حروف ذہن نشین کرنا ایک مبتدی کے لیے کچھ آسان کام نہیں - یہ بھی ایک اردو رسم الخط کی خوبی ہے کہ ابجد کے حروف بہت معمولی معمولی فرق ہونے کے باعث اس قدر ہم شکل ہیں کہ مبتدی کی نظریں آہستہ آہستہ خود بخود عادی ہوجاتی ہیں اور سب شکلیں ذہن نشین ہوجاتی ہیں ورنہ ہمارے ناتجربہ کار اور کوتاہ نظر معلمین نے تو بے چارے مبتدی کو کہیں کا نہ رکھا تھا - یہی وجہ ہے کہ مبتدی کو اردو سیکھنے میں زحمت تو ضرور ہوتی ہے لیکن ایک دفعہ سیکھ لینے

کے بعد وہ اس طرز تحریر کو اس قدر مفید و کار آمد پاتا ہے کہ اس رسم الخط میں کسی قسم کی تبدیلی اسے ازحد ناگوار ہوتی ہے —

(ب) طرز تعلیم

میری ناچیز رائے یہ ہے کہ مبتدی کو پہلے تمام حروف کی آوازیں یاد کرائی جائیں اور موجودہ ابجد میں بھ پھ تھ ٹھ جھ چھ دھ ڈھ ڑھ کھ گھ لھ وغیرہ بطور حروف شامل رہیں اور ان کی آوازیں بھی مبتدی کو یاد کرائی جائیں - اس کے بعد مشابہ حروف یعنی ب پ ت ٹ ث ' ج چ ح خ 'س ش' ک گ ' وغیرہ کے علحدہ علحدہ گروپ بنا کر انھیں سمجھایا جائے کہ ان مشابہ شکلوں میں نقطے اور مرکز وغیرہ لگاکر کس طرح فرق پیدا کیا جاتا ہے - حروف ابجد کی اکیس شکلیں جو لکھی گئی ہیں ان میں بھ جھ دھ ڑھ اور لھ کی شکلیں شامل کرلی جائیں - یہ چھبیس شکلیں دفتی یا لکڑی کی بنائی جائیں اور ان میں مرکز اور نقطے وغیرہ نہ لگائے جائیں بلکہ مبتدی کو ان حروف کی شکلیں دے کر یہ کہا جائے کہ وہ نقطے اور مرکز وغیرہ لگا کر دوسرے حروف بنائیں - مرکز نقطے اور اعراب وغیرہ کی شکلیں بھی دفتی یا لکڑی کی بنی ہوں تاکہ ایک مبتدی بہ آسانی ان کی شکلیں یاد کرسکے اور مختلف حروف بنا بنا کر پوری ابجد کی اڑتیس شکلیں بہ آسانی یاد کرلے - یہ تعلیم صرف عملی نہیں بلکہ تحریری بھی ہونا چاہیے - مبتدی سے متذکرہ بالا چھبیس حروف کے اشکال لکھانا چاہیے اور اس میں نقطے اور مرکز وغیرہ لگا کر انھیں پوری ابجد لکھنا سکھانا چاہیے - خوشخطی کی اس قسم کی کاپیاں تیار کرانا چاہیئیں جن میں مشابہ حروف کی شکلیں ہوں - مبتدی ان کی مشق کرے اور ان میں تحتانی و فوقانی نقطے لگاکر مختلف حروف بنائے - اسی طرح ہ

حرف کی چار چار شکلیں ذہن نشین کرانے کے لیے بھی یہی مشابہ حروف استعمال کیے جاسکتے ہیں —

نقشۂ ابجد

شروع	درمیانی	آخری — متصل	آخری — منفصل	کیفیت
ا	ا	ا	ا	
بـ بـ	ـبـ	ـب	ب	
پـ پـ	ـپـ	ـپ	پ	
تـ تـ	ـتـ	ـت	ت	
ٹـ ٹـ	ـٹـ	ـٹ	ٹ	
ثـ ثـ	ـثـ	ـث	ث	
جـ	ـجـ	ـج	ج	
چـ	ـچـ	ـچ	چ	
حـ	ـحـ	ـح	ح	
خـ	ـخـ	ـخ	خ	
د	ـد ـد	ـد	د	

شروع	درمیانی	آخری — متصل	آخری — منفصل	کیفیت
ٹ	ٹ ٹ	ٹ	ٹ	
ن	ن	ن	ن	
ر	ر ر	ر	ر	
ڑ	ڑ - ڑ	ڑ	ڑ	
ز	ز - ز	ز	ز	
ژ	ژ - ژ	ژ	ژ	
سـ	ـسـ	ـس	س	
شـ	ـشـ	ـش	ش	
صـ	ـصـ	ـص	ص	
ضـ	ـضـ	ـض	ض	
ط	ـطـ	ـط	ط	
ظ	ـظـ	ـظ	ظ	
عـ	ـعـ	ـع	ع	ع اور الف کی آواز میں

شروع	درمیانی	آخری (متصل)	آخری (منفصل)	کیفیت
غـ	ـغـ	ـغ	غ	فرق بتانا چاہیے ۔ الف
فـ	ـفـ	ـف	ف	ممدودہ کا خاص خیال رکھنا
قـ	ـقـ	ـق	ق	چاہیے تاکہ مبتدی ع اور
کـ	ـکـ	ـک	ک	الف کا فرق سمجھ جائے ۔
گـ	ـگـ	ـگ	گ	
لـ	ـلـ	ـل	ل	
مـ	ـمـ	ـم	م	
نـ	ـنـ	ـن	ن	
و	ـو و	ـو	و	
ہـ، ھـ	ـہـ ـھـ	ـہ، ـھ	ہ	
لا	ـلا لا	ـلا	لا	
یـ	ـیـ	ـی	ی	
یـ	ـیـ	ـے	ے	

مندرجہ بالا نقشہ ملاحظہ فرمائیے تو معلوم ہوجائے گا کہ مشابہ حروف کی شروع درمیانی اور آخری شکلیں بھی ہم شکل ہیں صرف نقطوں اور مرکز وغیرہ کا فرق ہے - مثال کے طور پر ب پ ت ٹ ث کی شروع اور درمیانی اور آخری شکلیں ملاحظہ فرمائیے جو بالکل ہم شکل ہیں اور ان ہی کے ہم شکل نون' یائے معروف اور یائے مجہول کی ابتدائی و درمیانی شکلیں ہیں صرف نقطوں کا فرق ہے - در اصل یہی وہ شوشے ہیں جن کے متعلق ایک واویلا مچایا جاتا ہے کہ ایک مبتدی کے لیے صدہا دشواریوں کا باعث ہوتے ہیں - اگر آپ غور کریں تو (ب پ ت ٹ ث) ان پانچ حروف کی پچیس شکلیں یاد کرنے کی بجائے مبتدی کو صرف چار شکلیں (ٮ ' ٮ ' ٮ ' ٮ) یاد کرنا پڑتی ہیں - جنہیں وہ نقطوں کے تغیر و تبدل سے چونتیس شکلوں میں بدل سکتا ہے اور نون' یائے معروف اور یائے مجہول کی بھی شروع اور درمیانی شکلیں بنا سکتا ہے - اسی طرح ج چ ح خ کی سولہ شکلیں ہوتی ہیں جو در اصل 'ح' کی چار شکلیں (حـ - ـحـ - ـح - ح) ہیں اور صرف نقطوں کے فرق سے سولہ بن جاتی ہیں - غرض اسی طرح تمام مشابہ حروف کے علحدہ علحدہ گروپ بنا کر مبتدی کو اس قسم کا فرق بہ آسانی سمجھایا جا سکتا ہے —

ان حروف کی درمیانی' آخری اور شروع کی شکلیں بھی دفتی یا لکڑی کی بنا کر مبتدی سے مشق کرا سکتے ہیں - ہائے مخلوط کا استعمال یاد کرانے کے لیے بھی ایک آسان ترکیب ہوسکتی ہے - مبتدیوں کو بہ پہ جہ وغیرہ کی آوازیں اور شکلیں یاد کرائی جا چکی ہیں - اب انہیں یہ بتانا چاہیے کہ ب + ھ مل کر بھ بنتا ہے - اس طرح وہ اتصال حروف کے قاعدے سے بھی واقف ہوجائیں گے اور اعراب کا استعمال معلوم ہوگا - میرا

ذاتی تجربہ یہ ہے کہ ایک اوسط درجے کا مبتدی زیادہ سے زیادہ دو ہفتے کے اندر تمام حروف کی شکلوں سے واقف ہو سکتا ہے اور ایک ماہ کے اندر وہ حروف ملاکر الفاظ لکھہ سکتا ہے - ان اصول کے مطابق ایک ایسا جدید قاعدہ مرتب کیا جاسکتا ہے جو باوجود مختصر ہونے کے اس قدر جامع ہوگا کہ اس کے پڑھ لینے کے بعد مبتدی اردو رسم الخط لکھہ سکے گا- اس طرح اردو رسم الخط سیکھنا بہت آسان ہو جائے گا اور نصف سے زائد مشکلات کا خاتمہ ہو جائے گا کیونکہ ایک مبتدی کو اعراب' مرکز اور نقطوں وغیرہ کے استعمال میں دقت نہیں ہوتی جو کچھہ زحمت ہوتی ہے وہ حروف کی مختلف شکلوں اور شوشوں وغیرہ کی وجہ سے ہوتی ھے جو انہیں بہ آسانی سکھائے جاسکتے ہیں اور جن کا تدارک اب قطعاً دشوار نہیں —

چند روز ہوئے جب کسی صاحب کا ایک مضمون میری نظر سے گزرا تھا- جس میں انہوں نے یائے معروف اور یائے مجہول کے متعلق ایک دشواری ظاہر کی تھی اور مثال کے طور پر "بیڑی" کا لفظ پیش کیا تھا اور اس کے تین معنی لکھے تھے- (۱) بیڑی' وہ شے جسے عوام سگریٹ کی جگہ استعمال کرتے ہیں - (۲) بیڑی جس کی جمع بیڑیاں ہے اور معنی مجرموں کی زنجیر- (۳) بیڑی (بیٹری) ایک آلۂ برقی جو روشنی دیتا ہے - میں اسے تسلیم کرتا ہوں کہ اس قسم کی دشواریاں ایک مبتدی کو ضرور پیش آتی ہیں لیکن کیا یہ معمولی اور جزوی باتیں اس قدر توجہ کی مستحق ہیں کہ ہمارے رسم الخط میں ایک عظیم انقلاب پیدا کردیں- میرے خیال میں اس کا تدارک بہت آسان ہے جس طرح آپ حسب ذیل الفاظ میں (علاحدہ - حتیٰ - شمس الہدیٰ - حسن مرتضیٰ وغیرہ) کھڑا زبر لگاتے ہیں اسی طرح جب یائے معروف اور یائے مجہول کا

فرق ظاہر کرنا ہو تو یاے مجہول کے نیچے کھڑا زیر لگا دیجیے - اب بھٹری اور بھڑی کا فرق بہ آسانی ظاہر ہوسکتا ہے - رہا یہ سوال کہ بھڑی لکھیں اور بیٹری پڑھیں - میری سمجھ میں نہیں آتا کہ بھڑی کو بیٹری کیوں کر پڑھا جاسکتا ہے - بیٹری میں دو شوشے ہونا ضروری ہیں ایک شوشہ 'ی' کے لیے اور دوسرا 'ٹ' کے لیے - اب اگر کوئی شخص املا غلط لکھے تو اس کا علاج بجز اس کے اور کیا ہے کہ اس کی تحریر کو قیاس سے پڑھا جائے —

موجودہ رسم الخط کی مشکلات ایسی نہیں ہیں کہ جن کا تدارک ناممکن ہو اس لیے ہمیں اپنے رسم الخط میں کسی ایسے انقلاب کی ضرورت نہیں ہے جو اس کی خوبیوں کو بالکل فنا کردے - میں ہرگز ہرگز اس مشورے پر عمل کرنے کی راے نہیں دوں گا کہ ہندی اور انگریزی کی طرح اردو میں بھی ایک ایک حرف علحدہ لکھا جاے اور جب شاہنامہ لکھنا ہو تو "ش ا ہ ن ا م ہ" اس طرح لکھیں - یہ رسم الخط نہیں بلکہ بچوں کا کھیل ہوگا - علاوہ بریں اس ترقیِ معکوس کا مقصد کیا ہے؟ ہمارے رسم الخط میں جو صوتی مشکلات ہیں وہ اسی طرح قائم رہتی ہیں - اگر یہ فرمائیے کہ ایک ٹائپ رائٹر بہ آسانی تیار ہوسکے گا تو یہ بھی ممکن نہیں - ناگری کا ٹائپ رائٹر موجود ہے مگر اردو ٹائپ رائٹر کی طرح وہ بھی بے کار ہے - یہ ضروری نہیں کہ ایک ٹائپ رائٹر صرف اس وجہ سے بن جاے کہ علحدہ علحدہ حروف لکھے جاتے ہیں - علاوہ بریں موجودہ رسم الخط کے لیے ایک آسان ٹائپ رائٹر کا وجود ہرگز ناممکن نہیں - مصری خط کا ٹائپ رائٹر تو بہ آسانی بن سکتا ہے - میں اس قدر عرض کرنے کی ضرور جراءت کروں گا کہ اگر مالی مشکلات مجھے

مجبور نہ کردیتیں تو یقیناً ایک آسان ٹائپ رائٹر آج آپ کی میز پر رکھا ہوتا۔ اس کا خاکہ تیار کرچکا ہوں۔ چند کمپنیوں سے مراسلت کا سلسلہ جاری ہے۔ اگر کوئی صورت پیدا ہوگئی تو اردو میں ایک ایسا ٹائپ رائٹر مصری خط کا ضرور ہو جائے گا جو بہ آسانی استعمال کیا جا سکے۔ میرا خیال یہ ہے کہ ہمیں اپنے رسم الخط میں کسی ایسے تغیر کو جائز نہ رکھنا چاہیے جو ہماری تحریر کی صورت بالکل مسخ کرے —

آئیے۔ اب ہم آپ کو اُس پر پیچ وادی کی سیر کرائیں جو ایک عرصے سے اردو داں طبقے کے لیے بھول بھلیاں بنی ہوئی ہے —

صوتی مشکلات :

اردو میں سب سے زیادہ مشکل ان الفاظ کا املا ہے جن میں متحدۃالصوت حروف استعمال ہوتے ہیں۔ ایک مبتدی جس وقت لفظ طیارہ لکھنے بیٹھتا ہے تو اسے اس قضیے کا فیصلہ کرنا دشوار ہوتا ہے کہ وہ طیارہ کو 'ط' سے لکھے یا 'ت' سے۔ اگر 'ت' سے لکھتا ہے تو کیوں غلط ہے اور 'ط' سے لکھتا ہے تو کیوں صحیح ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ فرق ہرگز ہرگز اس کے ذہن نشین نہیں کرایا جا سکتا جب تک اُسے طیر اور طائر وغیرہ کے معنی سے آگاہ نہ کیا جائے۔ ایک ادیب ضرور ان لطافتوں اور نزاکتوں کو محسوس کرسکتا ہے اور ان اسباب کی بنا پر وہ ان کا فرق بھی یاد رکھ سکتا ہے لیکن ایک مبتدی کو اس معاملے میں صرف اپنے ذہن اور اپنی یاد داشت پر زور دینا پڑتا ہے۔ علاوہ بریں معدودے چند الفاظ اس قسم کے ہوں تو وہ یاد کرلے لیکن اس کے سامنے تو جو لفظ آتا ہے وہ "ہر کہ آمد عمارتے نو ساخت" کا مصداق ہوتا ہے۔ اس میں

شبہ نہیں کہ اردو لغت اس پر فخر کر سکتی ہے کہ وہ روز بروز کثیرالالفاظ ہوتی جارہی ہے، اس میں مختلف زبانوں کے الفاظ ہیں اور ایک معمولی سا تغیر الفاظ کے معانی میں زمین و آسمان کا فرق پیدا کر دیتا ہے۔ لیکن ایک مبتدی کو اس معاملے میں قدم قدم پر جو زحمت اُٹھانا پڑتی ہے اس کا اندازہ کچھ وہی شخص کر سکتا ہے جسے مبتدیوں سے سابقہ پڑتا ہو۔ اردو کے معلمین جانتے ہیں کہ پرائمری کلاس کے طلبا ہی نہیں بلکہ ہائی اسکول اور کالج وغیرہ کے طلبا بھی کس قدر غلطیاں اس قسم کی کرتے ہیں۔ اس کا علاج بجز اس کے اور کیا ہوسکتا ہے کہ مشتبہ الصوت حروف کا قلع قمع کر دیا جائے اور ان حروف میں سے ہر آواز کو ظاہر کرنے کے لیے صرف ایک حرف منتخب کرلیا جائے۔ مشتبہ الصوت حروف حسب ذیل ہیں: ث۔س۔ص، ض۔ظ۔ذ۔ز ت۔ط، ح۔ہ، ——— اس وقت عبدالمجید صاحب کی "جامع اللغات" میرے سامنے ہے۔ ث سے شروع ہونے والے الفاظ دو صفحوں میں، ص سے شروع ہونے والے الفاظ اکیس صفحوں میں، س سے شروع ہونے والے الفاظ ایک سو چھیاسی صفحوں میں درج ہیں۔ اس لحاظ سے 'س' کثیرالاستعمال ہے اس کو منتخب کرلیجیے اور ث۔ ص سے شروع ہونے والے الفاظ بھی 'س' سے لکھیے۔ اسی طرح سے ض سے شروع ہونے والے الفاظ چار صفحوں میں، ظ سے شروع ہونے والے الفاظ تین صفحوں میں، ذ سے شروع ہونے والے الفاظ چھ صفحوں میں، ز سے شروع ہونے والے الفاظ ستائیس صفحوں میں درج ہیں۔ ز کثیرالاستعمال ہے اس لیے ض۔ ظ اور ذ متروک ہو جائیں گے اسی قاعدے کے ماتحت 'ط' اور 'ت' میں 'ت' کا استعمال اور 'ح'۔ 'ہ' میں ہائے ہوز کا استعمال جائز رکھا جائے۔ اس طرح ث۔ ص۔ ض۔ ط۔ ظ۔ ذ۔ ح حروف متروک

ہو جائیں گے اور س ۔ ز ۔ ت ۔ ہ ۔ حروف رائج * رہیں گے —

اس قسم کی تجویز تو پیش کر دینا بہت آسان ہے لیکن اس میں سب سے بڑی مشکل جو پیش آتی ہے وہ الفاظ کے معنی سے تعلق رکھتی ہے ۔ صواب اور ثواب دو مختلف المعنی الفاظ ہیں ۔ عربی کی طرح اردو میں کوئی اصول قرأت نہیں ہے ۔ اس لیے ان الفاظ کے تلفظ میں تو کوئی فرق محسوس نہیں کیا جاتا لیکن تحریر میں یہ فائدہ ضرور ہے کہ صفحۂ قرطاس پر آتے ہی یہ الفاظ اپنے معنی خود پکار اٹھتے ہیں ۔ ان کی شکل دیکھتے ہی ہمارا ذہن فوراً اصل معنی کی طرف رجوع ہو جاتا ہے اور سوچنے کی زحمت نہیں گوارا کرنا پڑتی ۔ اب اگر ان دونوں لفظوں کو بجائے 'ث' اور 'ص' کے 'س' سے لکھا گیا تو یہ خوبی باقی نہیں رہے گی اور تقریر و تحریر دونوں میں ان کی حالت یکساں ہو جائے گی ۔ میرا مقصد بھی یہی ہے کہ † ہم جس طرح ایک لفظ بولتے ہیں اسی طرح اس کو لکھیں بھی ۔ اگر آپ تقریر میں صواب اور ثواب کا فرق نہیں محسوس کرتے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ تقریر کا مطلب نہیں سمجھے ۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا آپ تقریر کا مطلب فوراً سمجھ لیتے ہیں بلکہ تقریر میں تو ذرا بھی سوچنے کی مہلت نہیں ملتی فوراً مطلب سمجھنا پڑتا ہے اور ذہن اصل مقصد کی طرف فوراً رجوع ہو جاتا ہے ۔ اصل بات یہ کہ اس قسم کے الفاظ کا مطلب سمجھنے میں ربط عبارت سے بڑی مدد ملتی ہے اور یہ بات تقریر و تحریر میں یکساں ہے ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس قسم کے الفاظ

---

* اختصار مضمون کے لحاظ سے میں نے صرف مشتبہ الصوت حروف سے شروع ہونے والے الفاظ کا تذکرہ کیا ہے اور ان الفاظ کو نظر انداز کردیا ہے جن کے درمیان اور آخر میں مشتبہ الصوت حروف آتے ہیں —

† Phonetic Methad -

کا مطلب جس طرح تقریر میں آپ بہ آسانی سمجھہ لیتے ہیں اسی طرح تحریر میں بھی سمجھہ سکتے ہیں۔ یہ کیا ضروری ہے کہ ہم بولیں کچھہ اور لکھیں کچھہ۔ علاوہ بریں ہم ایسے اصول وضع کر سکتے ہیں اور اس قسم کی نشانیاں مشتبہ الصوت حروف والے الفاظ' میں لگا سکتے ہیں جو فوراً ان کے معنی کی طرف ذہن کو منتقل کردیں۔ قبل ازیں کہ میں اس مبحث کے متعلق کچھہ عرض کروں یہ امر واضح کردینا ضروری ہے کہ اگر ہم مشتبہ الصوت حروف کم کرنا چاہتے ہیں تو ہم پر اس اصول کی پیروی لازم ہے کہ عربی فارسی اور سنسکرت کے وہ ثقیل الفاظ جو زبان زد نہیں ہیں متروک کردیے جائیں اور صرف وہ الفاظ رائج رہیں جو ہماری زبان کا جزو لاینفک بن گئے ہیں۔ اس طرح اردو ادب میں مشتبہ الصوت حروف والے الفاظ کی تعداد کم ہو جائے گی۔ اس کے بعد بھی جو الفاظ اس قسم کے باقی رہیں گے اُن کے متعلق دو اصول وضع کیے جاسکتے ہیں۔ ایک تو اختلاف اعراب کے ذریعے فرق پیدا کیا جائے اور دوسرے مشترک الفاظ کی تعداد میں اضافہ کردیا جائے —

(۱) اختلاف اعراب

اردو زبان میں الفاظ کی تفریق بذریعہ اختلاف اعراب کوئی نئی چیز نہیں۔ اختصار مضمون کے خیال سے ایک ہی مثال دیتا ہوں۔ حُسن اور حسن دونوں ایک ہی طرح لکھے جاتے ہیں۔ حسن کا لفظ جب خوبصورتی کے معنی دیتا ہے تو 'ح' مضموم آتی ہے اور جب صفت کے طور پر استعمال ہوتا ہے اور نیک اور اچھا وغیرہ کے معنی دیتا ہے تو 'ح' مفتوح آتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر اعراب کا فرق نہ ہوتا تو دونوں الفاظ کا تلفظ و املا یکساں ہوتا۔ آپ فرمائیں گے کہ یہ فرق عربی قواعد کی بنا پر ہے۔

بالکل صحیح - اردوداں طبقے میں صرف معدودے چند نفوس ایسے ملیں گے جو ان قواعد سے واقف ہوں اور یہ زیادہ تر وہی حضرات ہوں گے جو عربی داں ہیں مگر اس قواعد کی ناواقفیت کے باوجود اردوداں طبقے کا ہر شخص حُسن' حسن کے معنی سے واقف ہے - اسی طرح شکوہ اور شکوٗہ کا فرق بھی کاف مضموم اور کاف مجزوم ہی کی وجہ سے ظاہر ہوتا ہے - اب اگر ہم اس اختلاف اعراب کے اصول کو جدید رسم الخط میں چند الفاظ کا فرق ظاہر کرنے کے لیے استعمال کریں تو کیا حرج ہے - یہ اصول یقینی کارآمد ثابت ہوسکتا ہے کیونکہ بعض الفاظ ہمیں ایسے ملیں گے جن میں شروع ہی سے یہ فرق موجود ہوگا مثال کے طور پر 'ذِلال' زُلال' ضلال کے الفاظ لیجیے - ان میں شروع ہی سے اعراب کا فرق موجود ہے - ذلال' ذلت کی جمع ہے - زلال کے معنی شیریں پانی کے ہیں اور ضلال کے معنی گمراہی - موجودہ صورت میں مشتبہ الصوت حروف سے لکھے جانے کے باعث یہ الفاظ اپنے معنی خود بتا رہے ہیں - جدید رسم الخط میں 'ض' اور 'ذ' کے متروک ہوجانے کی وجہ سے اب یہ الفاظ 'ز' سے لکھے جائیں گے مگر کوئی دقت نہ ہوگی کیونکہ زِلال' زُلال - زَلال میں اعراب کا فرق ہے اس لیے جس طرح تقریر میں ان کا فرق باقی رہتا ہے اُسی طرح تحریر میں بھی فرق باقی رہے گا - ایک مثال اور لیجیے - مرز بمعنی سرحد (مرزو بوم) اور مرض بمعنی بیماری - موجودہ رسم الخط میں دونوں لفظ صرف 'ز' اور 'ض' کے فرق سے پہچانے جاتے ہیں - ان میں اعراب کا فرق نہیں - جانس کا بھی فرق نہیں دونوں مذکر استعمال ہوتے ہیں - اب جدید رسم الخط کے مطابق یہ دونوں لفظ 'ز' سے لکھے جائیں گے اور تحریر میں بھی ان کا فرق باقی نہ رہے گا - سنیے - مرض کا عام تلفظ

مرض ہے - اب اگر اس مروجہ تلفظ کی بنا پر فرق پیدا کیا جائے تو مرز اور مرض دونوں 'ز' سے لکھے جائیں گے مگر فرق باقی رہے گا کیونکہ مرض کی 'ز' مفتوح اور مرز کی 'ز' مجزوم رہے گی (مَرَز - مَرْز) —

آپ فرمائیں گے کہ ہر لفظ میں اعراب لگانا ایک دردِ سری ہے - بالکل صحیح - لیکن ہمیں ہر جگہ اعراب لگانے کی ضرورت بھی نہیں لاحق ہوگی - صرف اُن لفظوں میں اعراب کا خیال رکھنا ہوگا جہاں عبارت کے مبہم ہو جانے کا اندیشہ ہو ورنہ اعراب کی ضرورت نہیں ربط عبارت سے مطلب سمجھ میں آجائے گا - اس کے علاوہ اعراب کی تفریق سے ہمیں تحریر میں آسانی ہوگی اور تلفظ میں فرق ہونے کی وجہ سے لفظوں کے معنی جلد سمجھ میں آجائیں گے —

اردو میں در اصل مشتبہ الصوت حروف والے الفاظ زیادہ تر عربی و فارسی وغیرہ سے لیے گئے ہیں اور اُن کو اُسی طرح لکھا جاتا ہے جس طرح یہ الفاظ اپنی اصل زبان میں لکھے جاتے ہیں تاکہ یہ پتا لگایا جاسکے کہ یہ لفظ کس زبان سے آیا ہے اور اس کے مشتقات وغیرہ کیونکر بنائے جاسکتے ہیں - لیکن اگر ہم اس معاملے میں لغت کے محتاج رہیں تو کیا ہرج ہے - لغت ایک لفظ کو قدیم اور جدید رسم الخط میں لکھ کر اس کی ماہیت ہم پر ظاہر کردے گی - اس میں شبہ نہیں کہ رسم الخط میں اس قسم کی تبدیلی ایک جدید کاوش کا باعث ہوگی اور ہمیں اس کے لیے ایک نئی لغت تیار کرنا ہوگی - لیکن آپ کا یہ فعل اُس اردو ادب کو جو اب تک مختلف زبانوں کا مجموعہ سمجھا جاتا ہے ایک ذاتی شخصیت عطا کردے گا اور اُس میں یہ اہلیت پیدا ہو جائے گی کہ جس طرح عربی ادب دوسری زبانوں کے الفاظ کو معرب کر لیتا ہے

اسی طرح اردو بھی دوسری زبانوں کے الفاظ کو حروف و اعراب وغیرہ کی تبدیلی کے ذریعے مُوزّد کرنے لگے گی - کیا اس لحاظ سے یہ ایک عمل خیر نہیں ؟ —

۲ - مشترک الفاظ میں اضافہ

ہمارا دوسرا اصول یہ ہے کہ مشترک الفاظ کی تعداد میں اضافہ کردیا جائے - اردو میں مشترک الفاظ کی معقول تعداد ہے - پھر کیا وجہ ہے کہ ہمارے ادب میں جب ایک مفید مطلب شے موجود ہے تو اُس میں اضافہ نہ کیا جائے - مشترک الفاظ کی دو مثالیں پیش کرتا ہوں :

دام : قیمت - جال - ۸ ماشے کا وزن چار کوڑیاں -

ساز : باجا - سفر کا سامان - بجانے والا (لاحقہ) - تعامل - مکر وفریب سازش -

اس قسم کے بہت سے الفاظ اردو ادب میں ملیں گے جو کئی کئی معنی رکھتے ہیں - پھر اس میں کیا زحمت ہے اگر ان الفاظ کو بھی مشترک الفاظ کی فہرست میں شامل کرلیا جائے جو مشتبہ الصوت حروف سے لکھے جانے کے باعث تلفظ میں یکساں ہیں اور اب اس جدید رسم الخط کے باعث ان کا املا بھی یکساں ہوجائے گا - اس سلسلے میں ایک اور بات کہنا ہے کہ اس قسم کے مشترک الفاظ میں بھی اختلاف جنس پیدا کرنے سے فرق ظاہر کیا جاسکتا ہے - موجودہ رسم الخط میں بھی ایسے الفاظ موجود ہیں جن کا املا اور تلفظ یکساں ہے مگر معنی مختلف ہیں - مثال کے طور پر ایک لفظ 'ہار' کو لیجیے - عام طور پر اس کے دو معنی ہیں - شکست' پھولوں کی مالا - جب شکست کے معنی میں آتا ہے تو مونث استعمال ہوتا ہے اور جب مالا کے معنی میں آتا ہے تو مذکر - گویا لفظ 'ہار' جب استعمال کیا جاتا ہے تو اپنے مختلف معنی اول تو ربط عبارت کی مدد سے

اور دوسرے جلس کے لحاظ سے بہ آسانی ظاہر کردیتا ہے۔ آئیے۔ اب ہم ان دو اصولوں کے ماتحت چلند الفاظ کے تغیرات پر غور کریں —

تغیرات الفاظ بقاعدۂ جدید

صحاب سَحاب۔ صَحرا ' سہرا عَصر عُسر۔ صَلاح سَلاح۔ طاقی تاقی۔ عَزم ' عُزام ' عَظم۔ عظائم عزائم۔ ضِمن ' زَمن۔ فساد ' فصاد۔ سَطر ' سَتر ' سِتر۔ ثواب ' صواب۔ ھل ' حَل ' ھَل۔ (ھلنا کا امر) حلال ' ہِلال ' حلّال۔ کَہل ' کُحل ' کَہل۔ حمام ' حمّام۔ حمائم ' ھمائم۔ طیر ' تِیر۔ نذر ' نظر۔ ھار'حار۔

صحاب ' سَحاب: ان کا فرق تحریر میں ' ص ' اور ' س ' سے ظاہر ہوتا ہے اور تقریر میں س مفتوح اور ص مکسور کی وجہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ اول تو صحاب کے لفظ کو متروک ہوجانا چاہیے کیونکہ اردو میں صاحب کی جمع صاحبان اور اصحاب زیادہ تر مستعمل ہے۔ صحاب شاذ و نادر ہی استعمال ہوتا ہے۔ اگر اس خیال سے کہ زبان میں الفاظ کی قلت نہ ہوجائے آپ لفظ صحاب کو ترک نہ کریں تب بھی اس میں کوئی زحمت نہیں ہوتی کہ جدید رسم الخط کے مطابق ہم ان دونوں لفظوں کو ' س ' اور ہائے ہوز سے لکھیں (سِہاب ' سَہاب) اعراب کے اختلاف کی وجہ سے ذہن ان کے معنوں کی طرف بہ آسانی منتقل ہوسکتا ہے —

اسی طرح " صحرا ' سہرا " دونوں ایک ہی طرح " سہرا ' سہرا " لکھے جاسکتے ہیں اور تحریر میں بھی وہی اعراب کا فرق باقی رہے گا جو تقریر میں ہے۔ " عصر اور عسر " بھی اگر ایک ہی طرح لکھے جائیں (عسر عسر) تو اعراب کی وجہ سے فرق قائم رہے گا۔ " صلاح سلاح " دونوں کا تلفظ یکساں ہے اور اعراب کا بھی فرق نہیں۔ اگر چاہیں تو مشترک لفظ بناسکتے ہیں کیونکہ ان میں اختلاف جلس موجود ہے۔ (صلاح مونث سلاح مذکر)

اگر یہ مناسب نہ سمجھیں تو سلاح خانے کی رعایت سے سلاح کا 'س' مکسور کردیں اعراب کا فرق پیدا ہوجائے گا - جدید رسم الخط میں دونوں سلاح اور سِلاح لکھے جائیں گے - طاقی' تاقی دونوں موجودہ رسم الخط میں رائج ہیں اور اس لیے تاقی جلد رواج پا سکتا ہے - اسی طرح صابن کا لفظ بھی ص اور س دونوں سے لکھا جاتا ہے اور اس میں کوئی دقت نہ ہوگی اگر صابن کا املا 'ص' سے ترک کردیا گیا اور 'س' سے لکھا گیا - عزم' ئُظم' عَظم - عظم کے معنی ہیں کتے کو ہڈی دینا - اردو میں ایسے الفاظ رائج کرنا ضروری نہیں - اب رہے عزم اور عظم ان کا فرق اعراب سے ظاہر ہے اور دونوں 'ز' سے لکھے جاسکتے ہیں · عزم غُزم - اب عظائم' عزائم میں دو طرح فرق پیدا کیا جاسکتا ہے - اول تو عُظم کی رعایت سے عظائم کا 'ع' مضموم کردیں اور اس طرح عظمت کو بھی عُظمت پڑھیں - اگر یہ پسند خاطر نہیں تو دونوں کو عزائم لکھیں اور انہیں ایک مشترک لفظ تسلیم کریں - دونوں مذکر استعمال ہوتے ہیں فرق ظاہر کرنے کے لیے ایک کو مونث تسلیم کریں - جدید رسم الخط میں یہ الفاظ یا تو عُزائم' اور عزائم کی صورت اختیار کرلیں گے اور اعراب کے فرق سے پہچانے جائیں گے ورنہ ایک مشترک لفظ یعنی عزائم کی صورت میں ان کی شناخت اختلاف جنس کی بنا پر ہوگی - ضمن' زمن جدید رسم الخط میں زِمن' زمن ہو جائیں گے - فساد' فصاد جدید رسم الخط میں 'س' سے لکھے جانے کے باعث ہم شکل تو ضرور ہوجائیں گے لیکن ان کا فرق تشدید سے ظاہر ہو جائے گا - فساد' فسّاد - سطر' ستر' ستر میں آخرالذکر یعنی سِتر کے معنی پردے اور نقاب کے ہیں اس لیے ستر کے معنی بھی ادا کرسکتا ہے - کیا حرج ہے اگر ستر اور ستر کو مشترک لفظ بنا دیں اور ان کا تلفظ 'س' مکسور سے کریں - اس طرح ستر کے دو

معنی ہو جائیں گے اور سطر و سَتْر دو مختلف المعنی الفاظ اگر جدید رسم الخط میں 'س' اور 'ت' سے بھی لکھے گئے تو اعراب کا فرق باقی رہے گا۔ سَتَر' سَتْر۔ ھال' حل' ھل۔ اس میں ھال اور ھل آج بھی مستعمل ہیں اور آپ کو ان کی تفریق و شناخت میں دقت نہیں ہوتی۔ سوال صرف ھل اور حل کا باقی رہتا ہے۔ دونوں کو ھائے ہوز سے لکھیے اور ایک مشترک لفظ تسلیم کرنے کے بعد ان میں جنس کی تفریق پیدا کر دیجیے۔ ھل' ھل صرف دو لفظ رائج ہوں گے اور ان میں تفریق دشوار نہیں۔ حلال' ھِلال' حلّال کو اگر ھائے ہوز سے بھی لکھیں ھلال' ھلّال' ھلال تو اعراب کا فرق قائم رہتا ہے۔ کہل' کُحل' کہل پر غور فرمائیے۔ کہل' کہل آج بھی مستعمل ہیں ایک کے معنی بڑھاپا دوسرے کے معنی سستی۔ ایک مذکر استعمال ہوتا ہے اور دوسرا مونث اس لیے فرق قائم ہے۔ کحل میں کاف مضموم ہے اب اگر یہ تینوں الفاظ ھائے ہوز سے بھی لکھیں تو کوئی عظیم تغیر نہیں واقع ہوتا ہے کَہل' کُہل' کہل۔ اب حمام' حمّام' حمائم' ھمائم پر ذرا غور فرمائیے۔ حمام کے معنی کبوتر اور حمائم اس کی جمع ہے۔ اردو میں ایسے الفاظ کا رواج کوئی اچھی بات نہیں۔ اگر آپ انہیں متروک کرنا چاہتے تب بھی کچھ ہرج نہیں۔ حمام اور حمام کا فرق تشدید سے ظاہر ہو جائے گا ھمام' ھمّام۔ اگر حمائم کا لفظ متروک نہ کیا گیا تو حمائم اور ھمائم کا فرق اس طرح ظاہر کریں گے کہ 'ھمت' کی رعایت سے ھمائم کی ھائے ہوز کو بھی مکسور کر دیں گے ھِمائم' ھمائم۔ طَیر' طَبر دونوں کا املا 'ت' سے لکھا جائے تب بھی اعراب کا فرق قائم رہے گا۔ تَیر' تیر اگر ذَفر' ذَظر کو 'ز' سے بھی لکھائے تو ان کا فرق 'ز' مفتوح اور 'ز' مضموم سے عیاں ہو جائے گا نَزر' نزر۔ ھار' حار کا املا جدید رسم الخط میں ھائے ہوز

ہوگا دونوں کو مشترک لفظ تسلیم کر سکتے ہیں - ایک اسم کے طور پر استعمال ہوگا اور دوسرا صفت کے طور پر - میرا یہ قصد تھا کہ بہت سی مثالیں دے کر آپ پر یہ امر واضح کردوں کہ صوتی شکلات ان دو اصولوں کے ماتحت رفع کی جاسکتی ہیں اور ضرورت کے مطابق ایسے ہی دیگر کار آمد اصول بھی وضع کیے جا سکتے ہیں لیکن اس وقت تک میں اسے ایک سعی لاحاصل سمجھتا ہوں جب تک کہ میری یہ ناچیز تجویز شرف قبولیت نہ حاصل کرلے -

صوتی مشکلات رفع کرنے کے لیے جب ہم نے یہ اصول بنالیا کہ جس طرح ہم بولتے ہیں اسی طرح لکھیں بھی تو ایسی صورت میں واؤ معدولہ ' کھڑا زبر ' حروف شمسی اور حروف قمری کا استعمال بھی ترک کرنا پڑے گا - خود اور خویش کا املا خد اور خیش ہو جائے گا - جب واؤ کے قبل ضمہ ہو تو وہ پیش کی آواز کو زیادہ نمایاں کر دیتا ہے جیسے بود و نمود میں - اس اصول کے مطابق مبتدی کو خود بمعنی لوہے کی ٹوپی اور خود بمعنی آپ ' ذات وغیرہ میں فرق کرنا دشوار ہوتا ہے - جدید رسم الخط میں یہ زحمت رفع ہو جائے گی - علاحدہ ' موسیٰ ' عیسیٰ مرتضیٰ وغیرہ میں ی کے اوپر کھڑا زبر لگاتے ہیں - ایک مبتدی کو اس ی کا استعمال مہمل معلوم ہوتا ہے - اب کھڑا زبر متروک کیا گیا تو اس کے بجائے الف استعمال ہوگا اور مذکورہ بالا الفاظ کا املا اس طرح ہوگا علاحدہ ' موسا ' عیسا ' مرتزا - حروف شمسی و قمری میں بھی جو دقت ہے کہ لکھتے ہیں بدرالدجیٰ اور پڑھتے ہیں بدرُدجا یہ بھی رفع ہو جائے گی اور اب شمس الحسن کو شمسل حسن اور قمرالدین کو قمرُ دین لکھیں گے - اب اس طرح اردو املا ایک اصول پر مبنی ہو جائے گا اور تمام الفاظ صوتی رعایت سے لکھے جائیں گے جو مبتدی کے لیے انتہائی آسان ہوگا -

اصل تجویز :

موجودہ رسم الخط کی تمام دقتوں اور دشواریوں کو آپ کے سامنے پیش کرنے سے یہ مطلب نہیں ہے کہ ہمارا موجودہ رسم الخط بالکل فنا کردیا جائے - ایک جدید رسم الخط رائج کرنے کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ ہمارا موجودہ رسم الخط ناقص ہے اور اس میں چند ایسے ادبی نقائص ہیں جن کا دور کرنا ضروری ہے - ہمارا مقصد تو صرف یہ ہے کہ ایک جدید رسم الخط مبتدی کی آسانی کے لیے ایجاد کریں اور روز مرہ کی خط و کتابت اور اظہار خیال کے لیے ایک آسان طریقہ اختیار کریں - پہلے ایک مبتدی کو آپ اس جدید رسم الخط کے ذریعے اردو تحریر کی تعلیم دیجیے اور جس وقت اُسے اس قدر مہارت ہو جائے کہ وہ جدید رسم الخط کا املا اچھی طرح لکھ سکے اس وقت آپ اسے مشتبہ الصوت حروف سے آشنا کردیجیے اور نصاب تعلیم میں ایک کتاب موجودہ رسم الخط کے مطابق چھپی ہوئی شامل کردیجیے جس کے ایک صفحے پر موجودہ رسم الخط میں عبارت لکھی ہو اور اُسی کے مقابل دوسرے صفحے پر وہی عبارت جدید رسم الخط میں چھپی ہو - ایک مبتدی میں اس وقت اتنی اہلیت ضرور پیدا ہوگئی ہوگی کہ وہ موجودہ رسم الخط کے مطابق اضافہ شدہ حروف اور واؤ معدولہ وغیرہ کے اصول سمجھ سکے - اُسے چند معمولی اصول سمجھا دیجیے اور کہیے کہ جدید رسم الخط کی مدد سے وہ موجودہ رسم الخط کی عبارت پڑھے گویا ہمارا جدید رسم الخط اس موجودہ رسم الخط کے لیے اُس وقت ایک "تلفظ کی لغت" کا فرض انجام دے گا - اس طریقۂ تعلیم میں ایک مبتدی کو زیادہ زحمت نہ ہوگی کیونکہ ہم نے اپنا طرز تحریر نہیں بدلا ہے بلکہ الفاظ کا املا تبدیل

کردیا ہے جو ایک مبتدی جدید رسم الخط کی مدد سے بہ آسانی پڑھ سکتا ہے۔ اس طرح ایک مبتدی ہمارے موجودہ رسم الخط سے بہ آسانی واقف ہوسکتا ہے اور جدید رسم الخط کے رواج سے اردو ادب کو کوئی صدمہ نہیں پہنچے گا۔ آپ فرمائیں گے کہ ایک مبتدی کو دو قسم کے رسم الخط سیکھنے کی زحمت کیوں دی جائے اس کے جواب میں حسب ذیل اسباب ملاحظہ فرمائیے ...

موجودہ رسم الخط پر ایک نظر:

سب سے پہلا سبب جو ہمیں اس پر مجبور کرتا ہے کہ اردو کے موجودہ رسم الخط کو قائم رکھیں وہ ہندوستان کے اُس عظیم الشان ہم آہنگ تمدن کا تخیل ہے جسے ڈاکٹر انصاری مرحوم نے " دکن ہندی پرچارنی سبھا میسور ' منعقدہ سنہ ۱۹۲۸ ع کے خطبۂ صدارت میں بیان کیا ہے - وہ فرماتے ہیں کہ :

" اگرچہ ذخیرۂ الفاظ کے معاملے میں تو میری یہ خواہش ہے کہ ہندو اور مسلمان دونوں اگر ضرورت ہو تو ایک دوسرے کی رعایت سے اپنے ثقیل اور ناقابل فہم الفاظ کو ترک کردیں اور اپنی مشترک زبان کو اس کی مخصوص ساخت اور ترنم کا لحاظ کرتے ہوئے جس ذریعے سے بھی ممکن ہو زرخیز کریں مگر رسم الخط کے معاملے میں سختی سے میں یہ چاہتا ہوں کہ نہ ہندو اپنے رسم الخط کو ترک کریں نہ مسلمان .... یہ میرا پختہ یقین ہے جس کا اظہار میں انڈین نیشنل کانگریس کے صدر کی حیثیت سے بھی کرچکا ہوں کہ سیاسی اور مذہبی اختلافات جو آج ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات کو خراب

کر رہے ہیں وہ در اصل اُس گہری کشمکش کے بیرونی مظاہر ہیں جو ہندوستان کے لیے ہی مخصوص نہیں بلکہ دوسرے ملکوں میں بھی یہ کشمکش دیکھی گئی ہے اور تاریخ بھی اس قسم کی مثالوں سے ناواقف نہیں ہے - یہ مسئلہ حقیقت میں دو ایسے مختلف تمدنوں کے میل ملاپ کا مسئلہ ہے جن میں سے ہر ایک زندگی کے بارے میں ایک جداگانہ تخیل رکھتا ہے - میری راے میں اس مسئلے کا بہترین حل جیساکہ میں نے اس وقت بھی ظاہر کیا تھا یہ ہے کہ ہر تمدن کو زندہ رہنے کا حق دیا جاے لیکن اس کے ساتھ رواداری اور باہمی عزت کے جذبے کی نشوونما کی جاے اور تمدنی قربتوں کو ترقی پانے کا موقع اُن نصب العینوں کے مطالعہ کرنے اور سمجھنے کے ذریعے سے فراہم کیا جاے جن پر دونوں کی تہذیب قائم ہے - ہندوستان کی سیاسی ترقی ہی کے لیے نہیں بلکہ ہندوستان کے تمدنی نشوونما کے لیے بھی میں یہاں یہی کہتا ہوں کہ ہر تمدن کے لیے جداگانہ طور پر زندہ رہنے کے حق کو ایک ناقابل انکار حق کی حیثیت سے تمام قوموں کے لیے تسلیم کیا جاے- کیونکہ اسی طرح ان کے لیے ممکن ہوگا کہ وہ مستقبل کے ہندوستان کے عظیم ترین ہم آہنگ تمدن کی تخلیق میں اپنا امتیازی حصہ شامل کرسکیں - اس طریقے پر عمل کرنے سے کامیابی دیر میں حاصل ہوگی لیکن تمدن کا مرکب حکم کے ساتھ یا ایک دن میں تو تیار نہیں ہوسکتا - ہم میں انتظار کرنے کی عقل ہونا چاہیے - مسلمانوں سے عربی رسم الخط کے

ترک کرنے کے لیے کہنا گویا انہیں ایسے شاندار تمدنی ترکے سے بے تعلق کرنا ہے - کیونکہ اسی رسم الخط کے ذریعہ سے وہ آسانی کے ساتھ اپنے ماضی کے عظیم الشان ذخیرے تک پہنچ سکتے ہیں - اس ترکے سے انہیں محروم کرنا نہ تو خود ان کے لیے مناسب ہے نہ دنیا کے لیے " —

کیا ہندوستانی ادب (اردو) کے علاوہ کوئی دوسرا ادب اس عظیم الشان ہم آہنگ تمدن کا حامل ہو سکتا ہے ؟

اسی سلسلے میں پنڈت جواہر لال نہرو کی اس خواہش کا اظہار بھی ضروری ہے جو انہوں نے اپنی خود نوشتہ سوانح عمری میں تحریر فرمائی ہے - ان کا خیال ہے کہ ہماری یونیورسٹیاں انگریزی کے علاوہ فرانسیسی، جرمنی، روسی، اطالوی اور دیگر زبانیں سیکھنے کی طرف طالب علموں کو مائل کریں - کیونکہ اگر ہم دنیا کا ایک صحیح تخیل قایم کرنا چاہتے تو ہمیں صرف انگریزی ہی کی عینک سے تمام دنیا کو نہیں دیکھنا چاہیے بلکہ ہر تمدن کی معلومات براہ راست اس ادب سے حاصل کرنا چاہیے جو اس تمدن کا حامل ہے - اس طرح ہم دنیا کے ایک پہلو کو دیکھنے کے بجائے اور ایک طرفہ خیالات سننے کے بجائے اس کے ہر پہلو پر ایک تنقیدی نظر ڈالنے کے عادی ہوجائیں گے - ہماری ذہنی ساخت میں ایک صحیح توازن قائم رہے گا اور ہم اپنے ذہن میں تمدن عالم کا ایک مکمل اور صحیح تخیل قایم کرسکیں گے — اگر یہ امر تسلیم شدہ ہے کہ دوسری زبانیں سیکھنے اور مختلف تمدن کی واقفیت حاصل کرنے سے ایک قوم کی معاشرتی و تمدنی اور ادبی زندگی ترقی کرسکتی ہے تو ہمیں اس بات کو ہرگز نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ اردو رسم الخط میں یہ خوبی موجود ہے کہ وہ

ایشیا کی ان دو مشہور زبانوں یعنی عربی و فارسی کے سیکھنے میں مدد دیتی ہے جو ایک ایسے عظیم الشان ایشیائی تمدن کی علمبردار ہیں جس کا معتد بہ حصہ تمدن ہند کا جزو بدن بن گیا ہے - ایک اردو داں شخص کو فارسی پڑھنے میں جس قدر آسانی ہوتی ہے وہ ہر صاحب نظر پر عیاں ہے - اسے آپ صرف فارسی کے مصادر اور ان کے صیغوں کی گردان یاد کرادیجیے اور پھر دیکھیے کہ وہ فارسی عبارت کے معنی کس قدر آسانی سے بیان کرتا ہے - گو کہ عربی ایک مشکل زبان ہے لیکن ایک اردو داں کو اول تو اس کی ابجد نہیں سیکھنا پڑتی اس کے علاوہ عربی سیکھتے وقت بہت سے الفاظ اسے ایسے ملتے ہیں جو روز مرہ اردو میں مستعمل ہیں گویا اس کا ذہن عربی سیکھنے سے قبل ہی عربی الفاظ سے آشنا ہوتا ہے - یہ تمام آسانیاں ایک مبتدی کے لیے نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں - موجودہ رسم الخط فنا ہوجانے کے بعد ہمارا اردو داں طبقہ عربی و فارسی سے بے تعلق ہوکر ایک عظیم الشان ایشیائی تمدن سے نا واقف رہے گا اور ایک ہندستانی مسلمان خصوصاً اس شاندار تمدنی ترکے سے محروم ہوجائیگا جو اُس کی حیات ملی کا روح و رواں ہے - اس تمدنی کمزوری سے محفوظ رہنے کے لیے ہمیں ڈاکٹر انصاری مرحوم کا یہ قول کبھی نہیں بھولنا چاہیے کہ "اس ترکے سے مسلمانوں کو محروم کرنا نہ تو خود ان کے لیے مناسب ہے نہ دنیا کے لیے" -

آخری سبب یہ ہے کہ جدید رسم الخط ہمیں صرف فارسی و عربی ہی سے نہیں بے تعلق کردے گا بلکہ قدیم اردو ادب سے بھی ہمارے تعلقات منقطع ہو جائیں گے - آئندہ نسلیں ہمارے موجودہ رسم الخط سے نا آشنا ہوں گی اور ان کے لیے ہمارے موجودہ اردو ادب کا مطالعہ بھی عربی و فارسی کی طرح دشوار ہوگا - رسم الخط میں کسی قسم کا تغیر

اس کا مقتضی ہے کہ ہم ایک نیا ادب تعمیر کریں یا اردو ادب کے موجودہ ذخیرے کو جدید رسم الخط میں طبع کرائیں —

قدیم اور جدید رسم الخط :

متذکرۂ بالا اسباب کو مد نظر رکھتے ہوئے کہا یہ رائے مہمل ہے کہ موجودہ رسم الخط کو ترک نہ کیا جائے بلکہ اردو ادب میں دو رسم الخط رکھے جائیں - موجودہ طرز تحریر کو قدیم رسم الخط کے نام سے پکارا جائے اور ایک ایسا جدید رسم الخط ایجاد کیا جائے جس میں وہ تمام دقتیں رفع کردی جائیں جنھوں نے اردو رسم الخط کو مبتدی کے لیے دشوار بنا دیا ہے - لیکن یہ واضح رہے کہ " ہمارے قدیم اور جدید رسم الخط میں بعد المشرقین نہ ہونا چاہیے —

خطبۂ صدارت

(جو مولوی عبدالحق صاحب سکرٹری انجمن ترقی اردو نے صوبۂ
بہار کی اردو کانفرنس منعقدہ پٹنہ میں پڑھ کر سنایا) - " ادارہ "

اے صاحبو!

ایک مشہور مثل ہے "دور کے ڈھول سہانے" یہ بالکل سچ ہے -
لیکن جب یہی ڈھول بہت قریب آجاتے ہیں تو سخت ناگوار ہوتا ہے
اور کان پھٹنے لگتے ہیں - مجھے ڈر ہے کہ کہیں یہ مثل مجھ پر صادق
نہ آئے - اگر ایسا ہوا تو اس کے ذمہ دار ہمارے محترم جناب سید
عبد العزیز صاحب، میرے مہربان قاضی عبدالودود صاحب اور امتیاز
کریم صاحب ہوں گے جو اس بدعت کے مرتکب ہوئے ہیں - لیکن میں
آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں ہر حال میں آپ کی اس قدر افزائی
اور عزت کا تہ دل سے شکر گزار ہوں - کاش میں اس دلی شکر کو الفاظ
میں پوری طرح ادا کرسکتا —

قدرت کی بعض نعمتیں ایسی ہیں کہ ان پر ہماری زندگی کا انحصار
ہے، وہ نہ ہوں تو ہماری زندگی کا خاتمہ ہوجائے، جیسے ہوا، پانی،
تنفس وغیرہ؛ لیکن عام یا بافراط ہونے سے ہمیں ان کی کچھ قدر نہیں
ہوتی - یہی حال زبان کا ہے - بچپن سے لے کر مرتے دم تک یہ ہمارے ساتھ
ہے اور روز مرہ کے استعمال کی وجہ سے وہ ایک معمولی چیز ہوگئی ہے

اور ہم اس کی وہ قدر نہیں کرتے جو کرنی چاہیے - ورنہ دیکھا جائے تو زبان کا انسان کی زندگی میں بہت بڑا دخل ہے - اس کے نتائج اور اثرات نہایت عجیب اور دوررس ہیں - یہ ایک معمولی بات ہے جسے ہر شخص جانتا ہے کہ حیوان اور انسان میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ اگرچہ جانوروں کے بھی زبان (جیبھ) ہے اور بعض کی ہم سے بہت بڑی ہوتی ہے لیکن ان میں قوت گویائی نہیں - یہ خاص انسان کی امتیازی شان ہے - یہ محض اس کے خیالات کے اظہار کا آلہ ہی نہیں بلکہ ان خیالات کے بنانے اور سنوارنے کا بھی آلہ ہے - وہ انسان کی زندگی کا جز ہے - اسی لیے آدمی کو اپنی زبان عزیز ہوتی ہے - وہ ہماری زندگی کے ہر شعبے میں دخیل اور کارفرما ہے - اگر ہم اس کے تحفظ و ترقی کے لیے جدو جہد کریں' جان لڑادیں تو یہ ہمارا فرض ہے - اور اس فرض سے غفلت کسی مذہب و ملت میں روا نہیں —

اردو ایک مخلوط زبان ہے - یہ زبان کی ایک خاص قسم ہے - دنیا میں ایسی متعدد زبانیں ہیں - اس قسم کی زبانوں کے وجود میں آنے کے مختلف اسباب ہوتے ہیں - منجملہ دیگر اسباب کے ایک سبب کشور کشائی ہے - مسلمان بھی اس ملک میں آریاؤں کی طرح فاتح کی حیثیت سے آئے تھے - وہ فارسی بولتے تھے اور اہل ملک دیسی زبان - ان حالات میں جیسا کہ دستور ہے معاشرتی' ملکی اور کاروباری ضرورت سے مسلمان بول چال میں دیسی لفظ استعمال کرنے کی کوشش کرتے تھے اور ہندو فارسی الفاظ - فاتحوں کی تعداد اہل ملک کے مقابلے میں بہت کم تھی اور اس لیے وہ اہل ملک کی زبان سیکھنے پر مجبور تھے - دو چار نسلوں کے بعد ان کی اولاد ملکی زبان بخوبی بولنے لگی - لیکن فاتح قوم کی زبان

کا اثر بھی ملکی زبان پر برابر پڑتا رہا - اور اس اختلاط نے ایک گم نام بولی کو جو عوام بلکہ دیہات کی بولی تھی ایک شایستہ اور مستقل زبان کے رتبے تک پہنچا دیا - جسے آپ چاہے اردو کہیے یا ہندستانی —

اس اختلاط نے اس میں بڑی قوت پیدا کردی ہے اور دونوں کی (اور ضمناً کسی دوسری زبانوں کی بھی) خوبیوں کو ایک جا جمع کردیا ہے - یہی وجہ ہے کہ اس میں شیرینی اور دل نشینی کے ساتھہ شان و شکوہ ' وسعت کے ساتھہ گہرائی ' سادگی کے ساتھہ پرکاری موجود ہے - اور ہر قسم کے خیالات اور جذبات کے ادا کرنے پر قادر ہے —

جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں (جیسا کہ حال میں مہاتما گاندھی وغیرہ نے فرمایا ہے) کہ یہ زبان مسلمان بادشاہوں نے بنائی اور حکومت کے زور سے پھیلی وہ نہ صرف اس زبان کی تاریخ سے ناواقف ہیں بلکہ اصول لسانیات سے بھی ناآشنا ہیں - یہ زبان فطرتی اصول پر خود بخود بنی اور حالات و ضروریات نے اُسے بڑھایا اور پھیلایا - مسلمان بادشاہوں نے کبھی اس کی طرف توجہ نہیں کی - ان کی سرکاری اور درباری اور دفتری زبان آخر تک فارسی رہی - اس میں شک نہیں کہ دکن کے بعض بادشاہوں نے اس زبان میں نظمیں لکھیں لیکن ان کے دربار اور دفتر کی زبان بھی فارسی تھی اور اگر وہاں کبھی کسی زبان کو دخل ہوا بھی تو وہ مقامی زبان تھی نہ کہ اردو یا ہندستانی - جیسا کہ میں نے ابھی کہا ہے یہ محض معاشرتی ضرورتوں کی بدولت وجود میں آئی اور اس کے بنانے میں زیادہ تر حصہ خود اہل ملک یعنی ہندوؤں کا تھا - ایک عالم لسانیات کا قول ہے کہ " غیر زبان جو کسی قوم کو سیکھنی پڑتی ہے مخلوط نہیں ہوتی بلکہ اس کی اپنی زبان غیر زبان کے اثر سے مخلوط

بن جاتی ہے " - یہ قول بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے - کیونکہ جب کبھی ہم غیر زبان کے سیکھنے کی کوشش کرتے ہیں تو اس بات کا خاص طور پر خیال رکھتے ہیں کہ جہاں تک ممکن ہو اس میں ہماری زبان کا لفظ یا ہماری زبان کا رنگ نہ آنے پائے - جیسا کہ آج کل انگریزی زبان کا حال ہے - جب ہم انگریزی زبان بولتے یا لکھتے ہیں تو اس بات کی کوشش کی جاتی ہے کہ حتی الامکان کوئی ہندستانی لفظ نہ آنے پائے اور نہ ہندستانی قسم کی انگریزی ہو، جو " بابو انگلش " کے نام سے بدنام ہے - جہاں تک ممکن ہوتا ہے اہل زبان کی تقلید کی جاتی ہے بلکہ انگریزی لب و لہجہ کی نقل اُتارنے کی کوشش کی جاتی ہے - برخلاف اس کے اپنی زبان میں گفتگو کرتے وقت ہم بیسیوں انگریزی لفظ بے تکلف بول جاتے ہیں اور لکھتے وقت بھی لکھ جاتے ہیں اور اکثر اوقات ہمارے جملوں کی ساخت انگریزی نما ہوتی ہے - بعینہ یہی صورت اُس وقت فارسی کے ساتھ پیش آئی - اول تو یونہیں فاتح قوم کی زبان کی طرف میلان ہوتا ہے - دوسرے دفتر اور دربار سرکار کی زبان ہونے کی وجہ سے اس کا سیکھنا اور پڑھنا ضروری تھا - مکاتب اور مدارس میں ہندو مسلمان بچے ساتھ ساتھ فارسی پڑھتے تھے - پھر باہمی ربط و ضبط اور میل جول نے اس میں اور اضافہ کردیا - کچھ ضرورت کی مجبوری سے، کچھ اظہار علمیت کے لیے، کچھ بطور فیشن اور محض مشیخت کی خاطر ان ہندوؤں نے بے تکلف فارسی عربی الفاظ اپنی زبان میں داخل کرنے شروع کیے - آج عربی فارسی الفاظ کی زیادتی کی جو شکایت ہے تو اس معاملے میں زیادہ تر نہیں تو برابر کے قصوروار ہندو بھی ہیں - ظاہر ہے جو زبان وہ دفتروں میں استعمال کرتے؛ کتابوں میں پڑھتے، اپنی

تالیفات میں لکھتے اور بول چال میں بولتے تھے ' اس کے الفاظ خود بخود زبانوں پر چڑھ جاتے تھے اور وہ ملکی زبان میں بھی دانستہ و نادانستہ ' بالارادہ اور بلا ارادہ داخل ہوتے چلے گئے —

ان تمام اسباب سے ایک ایسی زبان ظہور میں آئی جو اسی دیس کی تھی اور اسی دیس والوں کی بدولت بنی ' بڑھی اور پھیلی - اور اس لیے اسے ملک کی عام زبان ہونے کا حق ہوسکتا ہے کیونکہ یہ ہندو مسلم اتحاد اور یک جہتی کی عزیز اور مقدس یادگار ہے - ایسی صورت میں ایک یونیورسٹی کے ہندی سنسکرت کے لکچرار کا اسے غیر ملکی زبان کہنا یا اردو کے ایک قابل ہندو ادیب کا اسے بین اقوامی یا سفارتی زبان سے موسوم کرنا سراسر نا انصافی ہے —

یہ امر خاص مسرت کا باعث ہے کہ تقریباً ہر صوبہ اس بات کا مدعی ہے کہ اردو زبان نے وہیں جنم لیا - اہل پنجاب کو یہ دعویٰ ہے کہ اردو کا بیج اُسی خطے میں اپجا - اہل دلی کا خیال ہے کہ یہ دلی اور اس کے قرب و جوار کی زبان تھی جو بن سنور کر اردو کہلائی - صوبۂ متحدہ والے کہتے ہیں کہ میرٹھ اور اس کے آس پاس کے دیہات کی بولی پر فارسی قلم لگائی گئی اور اس سے اردو پیدا ہوئی - یا بقول ایک فریق کے برج بھاشا یا سورسینی بولی سے اس کا ظہور ہوا - اہل گجرات کہتے ہیں کہ یہ کچی دھات تھی ' ہم نے اسے نکھارا ' بنایا اور سنوارا - اہل دکن کا دعویٰ ہے کہ اس زبان نے ادبی شان یہاں پیدا کی اور فروغ پایا - بہار والے چاہیں تو وہ بھی گجرات و دکن کی طرح اس بات کا دعویٰ کر سکتے ہیں کہ انہوں نے ابتدا سے اس زبان کی غور و پرداخت کی اور وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ

منہری کا کلام پیش کرسکتے ہیں جس کا تعلق آٹھویں صدی ہجری سے ہے اور جسے ہم اُس زمانے کی اردو کہہ سکتے ہیں — اس سے اردو کی مقبولیت اور وسعت کا اندازہ ہوسکتا ہے - اور قبول عام ہی سب سے قوی دلیل اور سب سے بڑی سند ہے - وہ خودرو نونہال جو دوآبۂ گنگ و جمن اور اس کے قرب و جوار میں پھلا پھولا' اقتضائے زمانہ کی ہوا اس کے بیج دوردور تک اڑا لے گئی' ہر سر زمین کی آب و ہوا جہاں وہ پہنچے' انہیں راس آئی اور ہر خطے کی زمین ان کے موافق نکلی - انہیں بے حقیقت بیجوں سے لہلہاتے ہوے شاداب پودے نکلے - قدرت نے ان بیجوں کی حفاظت کی' کلے پھوٹنے پر ان کی پرورش کی اور ہمارے اسلاف نے اپنی آبیاری سے ان کی غور و پرداخت فرمائی - وہی بے حقیقت بیج اور وہی نازک پودے آج سر سبز تناور درخت ہیں جن کے پھول پھل سے ہمیں اس وقت ذوق تکلم حاصل ہے —

اس کی مقبولیت کا پتا اس سے بھی چلتا ہے کہ بعض علاقے کے لوگوں نے اس سے اپنی خصوصیت جتانے کے لیے اسے اپنے سے منسوب کرلیا تھا - چنانچہ اہل گجرات ایک زمانے میں اسے گجری یا گجراتی کہتے تھے اور اہل دکن دکنی - ابتدا ابتدا میں اسے ہندی کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا - ایک تو اس وجہ سے کہ یہ اس ملک کی زبان سے نکلی تھی اور اپنے وقت کی کھڑی بولی سے پیدا ہوئی تھی - دوسری بڑی وجہ یہ تھی کہ یہ نام اسے فارسی کے مقابلے میں اور فارسی سے امتیاز کرنے کے لیے دیا گیا تھا جو اس وقت عام طور پر رائج تھی - چنانچہ یہ لفظ اس زبان کے لیے قدیم دکنی اور گجراتی اردو میں بھی انہیں معنوں میں استعمال ہوا ہے - وہ معذرت کے طور پر اکثر اپنی تصانیف میں یہ لکھتے ہیں

کہ جو لوگ فارسی عربی سے بہرہ نہیں رکھتے ان کے لیے ہم نے یہ کتاب ہندی میں لکھی ہے - یا یہ کہ یہ کتاب فارسی میں تھی عام لوگوں کی خاطر ہندی میں ترجمہ کی - یہ لفظ مصحفی کے زمانے تک انہیں معنوں میں استعمال ہوتا رہا - چنانچہ مصحفی اپنے دو تذکروں کو تذکرۂ ہندی یا ہندی گویاں کے ناموں سے یاد کرتا ہے - وجہ یہ ہے کہ اس نے فارسی گو شعرا کا تذکرہ الگ لکھا تھا - لیکن یہ نام چل نہ سکا - در حقیقت یہ کوئی نام نہ تھا - یہ اس وقت استعمال کیا گیا تھا جب کہ وہ گمنامی میں پڑی گل رہی تھی اور اس نے کوئی خاص حیثیت اور درجہ حاصل نہیں کیا تھا - محض فارسی سے امتیاز کرنے کے لیے اسے ہندی کہہ دیا کرتے تھے - دوسرے ہندی کا لفظ بہت عام تھا، کسی خاص زبان کے لیے معین نہیں ہوسکتا تھا - بعض فارسی اور یورپی مصنفین نے مرہٹی اور ہندستان کی بعض دوسری زبانوں کو بھی ہندی ہی سے موسوم کیا ہے - جب اس بولی کو خود ایک زبان کی حیثیت حاصل ہوگئی اور اس نے زبانی بول چال سے نکل کر ادب میں قدم رکھا تو یہ لفظ خود بخود متروک ہوگیا - اس کے ساتھ ساتھ "ریختہ" کا لفظ استعمال ہونے لگا - یہ لفظ اس وقت استعمال ہوا جب اس میں ادبی شان پیدا ہو چلی تھی، لیکن زیادہ تر شعر و سخن اور ادبی کلام کے لیے استعمال ہوتا تھا - یہ بھی فارسی سے امتیاز پیدا کرنے کے لیے لکھا اور بولا جاتا تھا - چنانچہ جن مشاعروں میں صرف اردو کلام پڑھا جاتا تھا انہیں "مراختہ" کہنے لگے - یہ اصطلاح صرف چند ہی روز رہی - ریختہ کا لفظ بھی کبھی کبھی مرزا غالب کے ابتدائی زمانے تک استعمال ہوتا رہا لیکن جب یہ زبان عام ہوگئی تو یہ لفظ خود بخود خارج ہوگیا -

سترھویں نیز اتھارھویں صدی میں پرانے فیشن کے یورپین اور انگریز اسے
موروز (Moors) کہتے تھے - جس طرح احاطۂ مدراس اور بمبئی کے بعض
مقامات میں عوام اسے مسلمانی سے موسوم کرتے ہیں - لیکن یہ نام غلط فہمی
پر مبنی تھا اور اس لیے اب بالکل متروک ہیں - گولکنڈہ کا اردو شاعر
اور ادیب وجہی اپنی کتاب " سب رس " میں جو سنہ ۱۰۴۵ ھ کی تصنیف
ہے اسے " زبان ہندوستان " کہتا ہے - سترھویں اور اتھارھویں صدی عیسوی
میں یورپین اور انگریزی مصنفین کی تحریروں میں ہم اس کا نام
'اندوستان' 'اندوستانز' 'ہندوستان' یا 'ہندوستانز' دیکھتے ہیں اور
اسی زمانے میں یہ لفظ " ہندوستانی " ہوجاتا ہے جو اب تک قائم ہے اور
صحیح معنوں پر دلالت کرتا ہے —

اردو کا لفظ بعد میں آیا - میر تقی میر اسے اپنے تذکرے میں
"زبان اردوئے معلیٰ شاہجہان آباد دہلی" لکھتے ہیں - اس کے بعد
زبان اردو کہنے لگے - رفتہ رفتہ زبان کا لفظ اڑ گیا اور خود 'اردو' زبان
کے معنوں میں آنے لگا - مصحفی اور انشاء کے زمانے میں اس کا رواج
عام ہوگیا تھا - یہ لفظ اپنی اصل کا پتا دیتا ہے - اردو یعنی شاہی
کیمپ میں مختلف قوموں اور مختلف زبان کے لوگ تھے اور انہیں کے
باہمی اختلاط سے یہ مخلوط زبان ظہور میں آئی اور سارے ملک میں
پھیل گئی - اب اردو اور ہندستانی میں یہ فرق کیا جاتا ہے کہ اردو
ادبی زبان ہے اور ہندستانی عام زبان جو خواص و عوام سب سمجھتے
ہیں - لفظ اردو کی مقبولیت کی ایک وجہ اور بھی ہے کہ یہ لفظ بولنے
لکھنے اور پڑھنے میں سہل ترین ہے - بولنے میں اس لیے کہ اس میں
کوئی ثقیل حرف نہیں اور بلا تکلف زبان سے ادا ہوجاتا ہے - پڑھنے میں

اس لیے کہ ہر حرف الگ الگ لکھا جاتا ہے - لکھنے میں اس لیے کہ چاروں حرف ابجد کے سب سے چھوٹے اور آسان حرف ہیں ' کہیں دائرہ یا کشش یا جوڑ نہیں اور لکھنے میں بھی الگ الگ رہتے ہیں - اور اس پر طرہ یہ کہ نقطے کا نام نہیں ' سب بے نقط ہیں —

ہندی اور اردو کا جھگڑا آج سے تقریباً ساٹھ سال پہلے اٹھا تھا - لیکن اس زمانے کے مذہبی اور سیاسی اختلافات نے اسے اور چمکا دیا - پہلے ایک آدھ جگہ تھا اب سارے ہندستان میں پھیل گیا ہے - پہلے ہندی اردو ہی کا قضیہ تھا اب ہندی ' ہندستانی اور اردو کے ساتھ "ہندی ہندستانی" کا ایک نیا شاخسانہ کھڑا کیا گیا ہے - انڈین نیشنل کانگریس نے بہت معقول فیصلہ کیا تھا کہ ملک کی زبان ہندستانی ہے خواہ رسم خط کچھ بھی ہو - لیکن تعجب اور افسوس ہے کہ جس مدبرانہ دماغ نے یہ تجویز سوچی تھی اور جنھوں نے اس پر آمنا و صدقنا کہا تھا سب سے پہلے اب وہی اس سے انحراف کر رہے ہیں - مہاتما گاندھی کی جدت پسند طبیعت نے ایک نیا لفظ "ہندی ہندستانی" وضع کرکے گویا جلتی آگ میں تیل ڈالنے کی کوشش کی ہے - جب مہاتما جی سے دریافت کیا گیا کہ اس جدید مرکب لفظ سے آپ کی کیا مراد ہے تو فرمایا کہ "ہندی جو آیندہ چل کر ہندستانی ہو جائے گی" تو یہ زبان نہ ہوئی آیندہ کا پروگرام ہوا - قطع نظر اس کے ذرا اس تعریف پر غور کیجیے جو مہاتما گاندھی نے ہندی ہندستانی کی فرمائی ہے یعنی وہ ہندی جو آگے چل کر ہندستانی ہو جائے گی ' اس کے یہ معنی ہوئے کہ اس وقت ہم ایسی زبان اختیار کرنی چاہتے ہیں جو سالہا سال تک کئی صدی کی کوشش ' جد و جہد

اور محنت و مشقت کے بعد ہندستانی ہو جائے گی - ہندستانی تو پہلے
ہی سے موجود ہے پھر صدیوں تک انتظار کرنے اور سالہا سال کی مصیبت
اور کھکھیڑ اٹھانے سے حاصل ؟ جب مدتوں کی محنت اور مصیبت اور
دماغ سوزی کا نتیجہ یہی ہے کہ نئی زبان ہندستانی بن جائے تو ہندستانی
جو بنی بنائی رکھی ہے کیوں نہ ابھی اسی کو اختیار کرلیا جائے - مہاتماجی
کی یہ منطق معمولی سمجھ سے باہر ہے - جلسے میں بیٹھ کر رزولیوشن
منظور کرالینے یا ووٹوں کے شمار کرالینے سے زبانیں نہیں بنتیں —

مسٹر کنھیا لال منشی جو بھارتیے ساہتیے پرشد کے روح و رواں اور
اس کے جنرل سکرتری ہیں ' انہوں نے حال ہی میں ایک چٹھی ٹائمز
آف انڈیا میں لکھی ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ " زمانۂ حال کی اکثر
زبانیں سنسکرت زبان کے تابع ہیں اور سنسکرت ہی کے زیر اثر نشوونما
پا رہی ہیں اور اس لیے سوائے یو- پی کے اکثر صوبوں میں جو لنگو افرینکا
بن رہی ہے اس کا رجحان زیادہ تر سنسکرت لغات کی طرف ہے "- جس
کے صاف معنے یہ ہیں کہ وہ دراوڑی زبانوں سے قریب ہونے کی خاطر
بول چال کی زبان سے دور ہونا چاہتے ہیں - میں نے جو بھارتیے
ساہتیے پرشد میں ہندستانی کی حمایت کی تو اس کی یہ وجہ تھی
کہ وہ بول چال کی زبان ہے - اس میں براہ راست سنسکرت
سے لفظ نہیں آئے بلکہ پراکرت اور اپبھرنش الفاظ لیے گئے ہیں جو اُس
وقت بول چال میں رائج تھے اور اب بھی ہیں - مثلاً (جیسا کہ آج کل
بعض ہندی ادیبوں نے لکھنا شروع کیا ہے) اگر ہم سورج کی جگہ سریے ؛
آنکھ کی جگہ اکشی ؛ پانی کی جگہ جل یا جلم ؛ پانو کی جگہ پد یا پاروت
کی جگہ شام چوں لکھنے لگیں تو اس سے نہ تو زبان میں کوئی خوبی

پیدا ہوتی ہے اور نہ اسلوب زبان میں کوئی حسن، بلکہ زبان بگڑتی
اور خراب ہوتی ہے اور دشواری کی وجہ سے عام زبان سے دور ہوتی
چلی جائے گی۔ مصنوعی زبانیں کاغذ کی ناویں ہوتی ہیں جو بہت دن
نہیں چلتیں۔ ہم ہندی آگے بڑھنے کی بجائے ہمیشہ پیچھے ہٹنا جانتے ہیں۔
زمانۂ گزشتہ کی کچھ اصلی اور کچھ خیالی چمک ہماری آنکھوں کو ہمیشہ
خیرہ کرتی رہتی ہے۔ اب یہ جھگڑا ہندی اردو کا نہیں رہا بلکہ ہندستانی
سنسکرت کا ہو چلا ہے اور یہ اس سے بھی برا ہے —

یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ ملک کی موجودہ فضا نے زبان کے مسئلے
کو پیچیدہ اور ناگوار بنا دیا ہے۔ کسی نے اس کا ناتا مذہب سے جوڑا ہے اور
کسی نے سیاست سے۔ یہ باتیں ہمیں ایک دوسرے سے دور کرنے والی
ہیں۔ ہر زبان کو (خواہ وہ ہندی ہو یا اردو) ترقی کا حق حاصل ہے
لیکن کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ دوسری زبان کی ترقی میں حائل
ہو۔ ہمیں ایک دوسرے کو شبہ کی نظروں سے نہیں دیکھنا چاہیے اور
بجائے بدگمانی پیدا کرنے کے اُن بدگمانیوں کو رفع کرنے کی کوشش کرنی
چاہیے جو آج کل کے حالات نے پیدا کردی ہیں۔ ہمیں ایک دوسرے سے
قریب ہونے کی کوشش کرنی چاہیے تاکہ آپس کے ملاپ اور میل جول سے
ایک ایسی زبان پیدا ہوجائے جو ہم سب کی مشترک ملک ہو۔ زبان
کا کوئی مذہب نہیں اس کا کوئی وطن نہیں اس کی کوئی ذات نہیں۔
جو کوئی اسے بولتا، پڑھتا لکھتا اور سلیقے سے استعمال کرتا ہے اسی کی
زبان ہے خواہ وہ کوئی ہو اور کہیں کا ہو —

حضرات!

اِس ملک میں ہر چیز ذات بن جاتی ہے۔ ہمارا ادب بھی ایک

زمانے میں ذات کی حیثیت رکھتا تھا جسے اس کی ذات والے ہی سمجھتے تھے - وہ صرف ایک طبقے میں محدود تھا اور اس سے باہر اس کے سمجھنے والے بہت کم تھے - لیکن یہ خوشی کی بات ہے کہ اب میلان سادہ نویسی کی طرف ہو رہا ہے - اس میں سب سے بڑا احسان سر سید احمد خاں مرحوم کا ہے - ان کی سلاست اور فصاحت مانی ہوئی ہے - وہ مشکل سے مشکل مضمون کو ایسے صاف اور سیدھے الفاظ اور دل نشین پیرایے میں ادا کر جاتے تھے کہ حیرت ہوتی تھی - بعد والوں نے اس خوبی کی قدر نہ کی اور بعض مجبوریوں خصوصاً نئی تعلیم اور نئے خیالات کی پر زور رو کے باعث اور اپنی زبان کی طرف سے غفلت برتنے کے سبب سے ہم کچھہ دنوں کے لیے بھٹک گئے تھے - لیکن شکر کا مقام ہے کہ اب ہم پھر صحیح رستے پر آ رہے ہیں اور رفتہ رفتہ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ ادب کا مقصد کیا ہے اور ہمیں کیا کرنا چاہیے - اصل یہ ہے کہ ادب زندگی کا جز ہے - ہماری تہذیب اور تمدن کا آئینہ ہے - جیسے ہماری زندگی کے حالات ہوں گے ویسا ہی ہمارا ادب ہوگا - دیکھہ لیجیے لکھاؤ کا فسانۂ عجائب اور دہلی کا قصۂ چہار درویش - دونوں میں دونوں کا تمدن صاف جھلک رہا ہے - زبان ہی ایک ایسا ذریعہ ہے کہ ہم اپنے خیالات دوسرے تک پہنچا سکتے ہیں اور جس قدر زیادہ تعداد تک ہم اپنے خیالات پہنچا سکتے ہیں اسی قدر ہمارا حلقۂ اثر زیادہ وسیع ہوگا - جو شخص اپنا کلام اور پیغام ہزاروں تک پہنچا سکتا ہے وہ بڑا آدمی ہے اور جو لاکھوں تک پہنچا سکتا ہے وہ اس سے بھی بڑا ہے اور جو کروڑوں تک پہنچا سکتا ہے وہ سب سے بڑا شخص ہے اور جو تمام بنی نوع انسان تک اپنا پیغام پہنچا سکتا ہے وہ سب سے بڑا انسان ہے - لیکن کلام لاکھوں کروڑوں انسانوں تک کس صورت میں پہنچ سکتا ہے ؟ یہ

اُسی صورت میں ممکن ہے کہ الفاظ سادہ اور دل نشین ہوں اور خیالات میں گنجلک نہ ہو - دل کی آواز سادہ ہوتی ہے - کلمۂ حق ہمیشہ سادہ ہوتا ہے - جس کا جلوہ ہمیشہ سادگی ہی میں نمایاں اور دلکش ہوتا ہے - زبان سیکھو' پڑھو اور لکھو لیکن اس کے ساتھ دل اور صداقت بھی پیدا کرو - جہاں دل میں درد اور صداقت نہیں وہاں آواز میں بھی درد اور صداقت نہیں ہوسکتی - یہی وجہ ہے کہ میر' نظیر اور حالی زیادہ مقبول ہوئے اور ناسخ' ذوق اور مومن کو وہ قبول عام نصیب نہ ہوا —

سادہ لکھنے کی ہدایت کرنا آسان ہے لیکن سادہ لکھنا نہایت دشوار ہے - لوگ اسے معمولی بات سمجھتے ہے لیکن یہ بہت غیر معمولی چیز ہے - یہ بات علاوہ فطری استعداد کے بڑی مشاقی' بڑے تجربے' بہت مطالعے اور بہت مشاہدے کے بعد حاصل ہوتی ہے - صرف کامل ادیب ہی اسے نبھاسکتے ہیں - سادہ لکھنے کے یہ معنے نہیں ہیں کہ ہم اپنی تحریر میں سادہ اور سہل لفظ جمع کردیں اور کوئی مشکل لفظ نہ آنے دیں - سادگی کے ساتھ جب تک تحریر میں لطف' کشش اور اثر نہ ہو وہ ادب میں شمار نہیں ہوسکتی - ایک پھسپھسی بے جان اور بے اثر تحریر کا لکھنا نہ لکھنے سے بد تر ہے - جب تک کلام میں لکھنے والے کی روح شریک نہ ہو کلام مردہ ہوگا اور دلوں میں گھر نہیں کرسکتا - اگر آپ کے کلام میں سادگی کے ساتھ صداقت' جدت' تازگی اور جوش ہے تو وہ آب رواں کی طرح موجیں مارتا ہوا بڑھتا ہوا چلا جائے گا اور اگر وہ دقیق الفاظ پیچیدہ استعارات و تشبیہات اور تکلف و تصنع کے بوجھ سے دبا ہوا ہے تو بحر مردار کے پانی طرح ساکن' مردہ اور بے حس ہوگا - زمانۂ حال کے ایک بہت بڑے ادیب نے خوب کہا ہے کہ "سادگی اور صداقت توام

میں اور حسن ان کی تیسری بہن ہے"۔ یہی وہ سادگی ہے جو سیدھی دل و دماغ میں جا بیٹھتی ہے۔ یہی وہ سادگی ہے جو دلوں کو لبھاتی اور گرماتی اور خیالات میں روشنی پیدا کرتی ہے۔ دنیا کے وہ کامل اور اعلیٰ ادیب اور شاعر جن کا سکہ سارے عالم پر بیٹھا ہوا ہے ان کے قبول عام کا راز اسی میں ہے۔ صدیاں گزر گئیں، جگ بہت گئے لیکن ان کی مقبولیت میں فرق نہیں آیا —

حضرات! دنیا کی کوئی زبان نقص سے خالی نہیں۔ بعض زبانیں ہماری زبان سے بھی زیادہ بے قاعدہ، پیچیدہ اور دشوار ہیں لیکن دشواری کی وجہ سے کوئی اپنی زبان ترک کرکے دوسری زبان اختیار نہیں کر لیتا۔ وہ ہمارے اعضا و قویٰ کی طرح ہماری زندگی کا جز ہے۔ جس طرح ہم دیدہ و دانستہ اپنے اعضا و قویٰ کو کاٹ کر نہیں پھینک سکتے اسی طرح ہم اپنی زبان کو بھی اپنے سے جدا نہیں کر سکتے۔ کچھ مدت ہوئی جاپان میں بہت بڑا بھونچال آیا تھا جس میں ہزارہا جانوں کا نقصان ہوا لیکن ایسی بیش بہا چیزیں بھی تلف ہو گئیں جو جان سے زیادہ عزیز تھیں۔ جب دلی کی ایک بڑی بی نے یہ سنا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ وہاں اکثر زلزلے آتے رہتے ہیں تو بڑی سادگی سے فرماتی ہیں کہ "موے اس ملک کو چھوڑ کیوں نہیں دیتے" اسی طرح اگر کوئی آپ سے یہ کہے کہ آپ کی زبان میں فلاں نقص یا بے قاعدگی ہے اسے چھوڑ کیوں نہیں دیتے تو اس کے جواب میں سوائے اس کے کہ آدمی مسکرا کر چپ ہو رہے اور کیا کہہ سکتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہر زندہ شے کے لیے نشو و نما اور تغیر لازم ہے۔ یہ قانون قدرت ہے۔ لیکن اگر اس قانون کے ساتھ انسانی سعی شریک نہ ہوگی تو بہت جلد وہ ترقی رک

جائے گی - نشوونما کی ترقی کے لیے انسانی سعی بھی لازم ہے - جو چیزیں ہمیں بچپن میں بہت عزیز تھیں وہ بڑے ہوکر بے حقیقت معلوم ہوتی ہیں - بچپن میں جو کتابیں ہم بڑے شوق سے پڑھتے تھے بڑے ہو کر اُن میں وہ دلکشی نہیں رہتی - یہی حال ادب کا ہے - زمانۂ گزشتہ کا ادب جو ہمارے اسلاف کی یادگار ہے اور ہمارا قومی سرمایہ ہے اس کا مطالعہ اور تحفظ ہمارا فرض ہے - لیکن اس کا اکثر حصہ ویسا کارگر اور پراثر نہیں رہا جیسا اُس وقت تھا - وہ اس زمانے کے اقتضا کے مطابق تھا اور اب زمانے کا اقتضا کچھ اور ہے - جس طرح عمر کے ساتھ انسان کا ذوق بدلتا رہتا ہے اسی طرح زمانے کا ذوق بھی بدلتا رہتا ہے - اس لیے ہمیں صرف اپنے اسلاف کی کمی ہی پر قانع نہیں رہنا چاہیے بلکہ ہمیں خود بھی اپنے زمانے کے حالات کی رو سے ترقی اور اصلاح میں (جہاں تک زبان کی ساخت اجازت دے) لگاتار اور بے دریغ کوشش کرتے رہنی چاہیے - اس میں شک نہیں کہ ہمارے لیے گزشتہ زمانے میں بہت کچھ ہے لیکن سب کچھ نہیں - بے شبہ گزرا ہوا زمانہ قابل احترام ہے لیکن آیندہ زمانہ اس سے بھی زیادہ احترام کے قابل ہے - جس شخص کی نظر ہمیشہ پیچھے کی طرف رہتی ہے اور آگے نہیں دیکھتا وہ کبھی دنیا میں سرسبز نہیں ہو سکتا - اس لیے اصلاح کی طرف سے کبھی غافل نہیں رہنا چاہیے - جو چیزیں فرسودہ اور بیکار ہوگئی ہیں ان کے بدلنے اور ترک کرنے میں اور جو کارآمد اور مفید ہیں ان کے اختیار کرنے میں کبھی نہیں چوکنا چاہیے —

حال ہی میں میرے ایک ذی علم دوست نے مجھ سے پوچھا کہ کیا اردو میں ایسی صلاحیت ہے کہ وہ اعلیٰ ادب پیدا کرسکے؟ میں نے کہا اردو

میں کیا ہر زبان میں یہ صلاحیت موجود ہے - لیکن شرط یہ ہے کہ ان حضرات میں بھی وہ صلاحیت اور شوق صادق ہونا چاہیے جو اسے اعلیٰ ادبی زبان بنانا چاہتے ہیں - اردو اب اس درجے تک پہنچ گئی ہے کہ اگر ہم چاہیں اور ہم میں صلاحیت ہو تو ہم اس میں نازک سے نازک خیال اور ہرفن اور علم کے معلومات کو ادا کرسکتے ہیں - اگر ہم نے اسے صرف اِس کی قسمت پر یا قدرت کی مہربانی پر چھوڑ دیا تو یہ لہلہاتا ہوا چمن ایک دن جھاڑ جھنکاڑ ہوجاے گا اگر ہم اسے اپنی زبان سمجھتے ہیں' اگر ہم سچائی کے ساتھ اس کی ترقی کے خواہاں ہیں تو کوئی دقیقہ کوئی تکلیف اور محنت اس کے بڑھانے اور بنانے میں اٹھا نہیں رکھنی چاہیے - ایک طرف تو ہمیں اس کی اشاعت میں کوشش کرنی چاہیے - کیونکہ جب تک پڑھے لکھوں کی تعداد زیادہ نہ ہوگی اور جب تک زبان کی تعلیم عام نہ ہوگی آپ کا اعلیٰ اور مفید سے مفید ادب بھی بیکار ہوگا اور کیڑوں کی نذر ہوجاے گا - دوسری طرف زبان کو مستحکم اور قوی بنانے کی ضرورت ہے - اس سے میری مراد یہ ہے کہ اس میں ہر فن اور علم کی کتابیں ہوں' دنیا کی بہترین تصانیف کے ترجمے ہوں' تخلیقی ادب جس کی کمی ہے' پیدا کیا جاے اور ان مصنفوں اور ادیبوں کی حوصلہ افزائی کی جاے جو اس کام کے اہل ہیں - اگر ہم اس کے لیے آمادہ ہیں اور اس کی خاطر تکلیف اٹھانے اور ایثار کرنے کے لیے تیار ہیں تو ہمارا دعویٰ صحیح ہے ورنہ محفلوں میں بیٹھ کر خالی دعوے کرنا اور اپنی زبان کو سراہنا اپنے منہ میاں مٹھو بننا اور دوسروں کی نظروں میں اپنے آپ کو حقیر بنانا ہے —

حال ہی میں ایک مورخ نے جس نے دنیا کے تمدن پر بہت معقول

کتاب لکھی ہے ، مسئلۂ تمدن پر بڑی گہری نظر ڈالی ہے اور اس کے تمام پہلوؤں پر بحث کرنے کے بعد آخر میں ساری کتاب کا نچوڑ اِس ایک چھوٹے سے جملے میں ادا کردیا ہے Man makes himself یعنے آدمی خود اپنے کو بناتا ہے - یہی میں زبان کے متعلق کہتا ہوں کہ اس کا بنانا اور بگاڑنا ہمارے ہاتھہ میں ہے - ہم جیسا چاہیں گے ویسی بنے گی اور گزشتہ زمانے میں بھی جیسا ہم نے چاہا ویسی بنی - لیکن زبان کے بنانے میں یہ نکتہ یاد رکھیے کہ ملک کی عام اور مقبول زبان وہی ہوسکتی ہے جسے زیادہ سے زیادہ تعداد بولے اور زیادہ سے زیادہ تعداد سمجھے اگر آپ اس اصول کو پیش نظر نہیں رکھیں گے تو آپ کی زبان سکڑتے سکڑتے ایک محدود حلقے میں بند ہو کے رہ جائے گی - ہندستانی یا اردو کو اسی لیے برتری ہے کہ اسے ملک کے زیادہ سے زیادہ اشخاص بولتے یا سمجھتے ہیں —

حضرات ! ہمیں یہ زبان اس لیے عزیز ہے کہ یہ ہماری بول چال کی زبان ہے - ہمیں یہ زبان اس لیے عزیز ہے کہ یہ ہندستان کی دو بڑی قوموں کے اتحاد اور یک جہتی کی عزیز یادگار ہے - ہمیں یہ اس لیے عزیز ہے کہ یہ ہمارے تمدن ، ہماری معاشرت ، ہمارے دل و دماغ کے نتائج ، ہمارے مادی اور روحانی خیالات کی حامل ہے - ہمیں یہ اس لیے عزیز ہے کہ اس میں ہمارے اسلاف کی صدیوں کی محنت و جانکاہی دماغی و ذہنی کاوشوں کا نچوڑ ہے - ہمیں یہ اس لیے عزیز ہے کہ ہمارے بزرگوں کی مقدس وراثت ہے ۔ اگر اس پر بھی ہم اس کی قدر نہ کریں اور اس کے بنانے سنوارنے اور بڑھانے میں اپنی پوری ہمت صرف نہ کردیں اور اس کی ترقی و نشوونما میں جان نہ لڑادیں تو ہم سے بڑھ کر کوئی ناخلف نہ ہوگا —

اردو

ہماری زبان

از

جناب پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی

(یہ محققانہ مقالہ اردو کے فاضل ادیب حضرت کیفی نے اردو کانفرنس منعقدہ علی گڑھ کے ضمن میں ۲۴ اکتوبر ۱۹۳۶ ع کی شب کو یونین ہال میں پڑھا)

اللہ بخشے خواجہ میر "درد" دو مصرعوں میں کتنی گہری نفسیاتی حقیقت بیان کرگئے ہیں فرمایا ہے :—

اے "درد" کہوں کس سے نکتہ راز محبت
عالم میں سخن چینی ہے یا طعنہ زنی ہے !

لیکن حضرات ! آج سخن چینی اور طعنہ زنی کے خوف کو اونچے سے طاق پر رکھ کر آپ سے دو چار باتیں کرنا چاہتا ہوں - وہ باتیں روکھی پھیکی سہی لیکن دل سے نکلی ہوئی ہیں اور دل سے ملنی چاہئیں —

یہ کھلی بات ہے کہ کچھ مدت سے اُردو ہندی کا معاملہ ایک ہنگامہ خیز معرکہ بن رہا ہے - اس وقت اس سے بحث نہیں کہ ایسا کیوں ہوا ؟ بحث اس سے ہے کہ اس بارے میں ادبی اور تواریخی واقعات کن امور پر روشنی ڈالتے ہیں ؟ سب سے پہلے میں اس سوال پر کچھ تاریخی کوائف اور چند ادبی اور لسانیاتی حقیقتیں آپ کی خدمت

میں پیش کرنا چاہتا ہوں —

لوگ ہماری زبان کے نام پر اکثر بے موقع طبع آزمائی اور غیر ضروری طوالت سے کام لیتے ہیں - میں اس مسئلے کو چند جملوں میں ختم کردوں گا - کہا جاتا ہے کہ جان گلکرسٹ نے صرف " ہندوستانی " کا لفظ استعمال کیا ہے - یہ مانا - اگر میرا حافظہ ستم ظریفی نہیں کرتا تو شاید انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا میں بھی ہندوستانی ہی آیا ہے اور تذکرہ ہے اردو کا - ڈنکن فاربس اپنی اُردو کی قواعد کا نام " ہندوستانی گریمر " رکھتے ہیں - لیکن اسی کتاب میں ایک مقام ایسا آیا ہے جو اس امر کو صاف کردیتا ہے کہ اُردو اور ہندوستانی دو زبانیں نہیں - یہی صاحب اس گریمر کے حواشی کے صفحہ ۴۸ پر لکھتے ہیں " ہندوستانی یا اُردو یا زبان ریختہ " یعنی " ہندوستانی " اور " اُردو " اور " ریختہ " مترادف الفاظ ہیں - اس کتاب میں تمام قواعد زبان اُردو پر حاوی ہیں - رسم پرستی سے کتاب کے نام میں ہندوستانی لکھ دیا - جان گلکرسٹ کا نام نامی ابھی مذکور ہوا - اس نام کا جو تعلق فورٹ ولیم کے کالج اور مطبع سے تھا اس کی صراحت کی ضرورت نہیں - انہیں صاحب کی تحریک سے " میرامن " مرحوم نے باغ و بہار لکھی جو فورٹ ولیم کے تاریخی مطبع نے چھاپی اور شائع کی - اس کے مقدمے میں میر امن اُردو کا ذکر کچھ تفصیل سے کرتے ہیں اور اپنی کتاب کی زبان کو اردو ہی بتلاتے ہیں - ایک اور امر قابل ذکر یہ ہے کہ مسلمان اور ہندو مصنف بھی اب سے ایک صدی پہلے اور اس کے بعد تک بھی اُردو کو " ہندی " کہا کرتے تھے شاہ عالم بادشاہ کے عہد میں ایک صاحب منشی ملو لال دہلوی نے ایک کتاب تالیف کی جس میں موضوع کی پابندی

سے مختلف شعرا کے اشعار جمع کیے "گلستان مسرت" اس کے بعد اور اس کو سامنے رکھہ کر مرتب ہوئی ہے - اس کتاب کے دیباچے میں منشی صاحب موصوف لکھتے ہیں :—

" از انجا کہ ریاحین اشعار ہندی کہ خالی از آب و رنگ لطافت نیست... "

اور ابواب کی تفصیل میں فرماتے ہیں :—

" گلدستۂ م مشتمل بر ہشت گل - گل اول دیوان افراد و قطعات و رباعیات ہندی ... ... "

حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب میں ہندی کا کوئی چھند ، ایک دوھا تک نہیں ہے تمام و کمال کلام فارسی ہے یا اردو - اردو میں "مہر" "مصحفی" "انشا" اور "معروف" تک کا کلام ہے - یہ کتاب قدیم نستعلیق ٹائپ میں مسٹر ہنری پرنسپ کی سرپرستی میں چھپی اس ضخیم کتاب کا نام "گلدستہ نشاط" ہے - بڑی تقطیع کے چار سو سے زیادہ صفحوں کی ہے اور میرے کتب خانے میں موجود ہے - یہ بھی مطبع فورٹ ولیم سے شایع ہوئی —

اب یہ قضیہ صاف ہوگیا کہ ناموں کی کھوج سے استدلال فضول ہے - ہندوستانی ، ریختہ اور اردو وغیرہ ایک ہی زبان کے نام ہیں - امپیریل گیزیٹیر آف انڈیا مطبوعہ سنہ ۱۹۰۸ ع میں صرف "اردو" کا لفظ ہی استعمال ہوا ہے - مختصر یہ کہ وہ سید انشا کی ٹھیٹھ تصنیف "رانی کیتکی کی کہانی" ہو یا جناب "آرزو" لکھنوی کی فارسی عربی الفاظ سے معصوم غزلیں یہ سب اردو ہیں ، ہماری اصطلاح میں ایسی انشا پردازی کو "نکھار اردو" کا نام دیا گیا ہے —

نام کی نسبت اسی قدر کہنا کافی ہے - اب اس پر سرسری نظر

ڈالنی ہے کہ اُردو کیونکر بنی اور کون لوگ اس کے بنانے کے زیادہ تر ذمہ دار ہیں؟ یہ بحث بہت طوالت اور تفصیل چاہتی ہے - یہاں صرف اتنا کہا جائے گا کہ ہندوستان میں اسلامی حملوں اور فتوحات سے پیشتر اُردو کی داغ بیل پڑ جانا قرین قیاس ہے - ایک صدی کے قریب زمانہ گزرا کہ منشی قمرالدین نے ایک کتاب مسمیٰ " تحقیق اللسان " تصنیف کی اس میں لکھا ہے کہ :—

" پیش از سلطنت اسلام نیز رایان و راجگان ہند باسریر آرایان ایران و افغانستان نامہ ہا و مکاتیب بہ زبان پارسی می نوشتند و پیغامہا بہ زبان سفیر پارس می گزاشتند " —

اس کے ساتھ ہی یہ امر تنقیح بھی نظر میں رکھنا ہے کہ البیرونی نے جو ہندوستان میں پنڈتوں سے سنسکرت پڑھی تو درس و تدریس کی زبان کیا تھی؟ کوئی مشترک زبان ضرور ہوگی ورنہ استاد شاگرد کو درس کے معنی اور مطلب کس طرح سمجھا سکتا - اُس زمانے میں کنڈر گارٹن تو نکلا ہی نہ تھا کہ چرخے اور گھوڑے کی تصویر دکھا کر اُستاد شاگرد کو سمجھا دیتا کہ یہ ہے چرخا اور یہ ہے گھوڑا - اور شاگرد اپنی زبان کا مناسب لفظ اس کے لیے قرار دے دیتا —

اوپر کا فارسی اقتباس یہ قیاس نہیں ، یقین دلاتا ہے کہ ہندوستان کے رایوں اور راجاؤں کے دربار سے جو فارسی مراسلے اور خریطے اسلامی ملکوں کو جاتے تھے وہ ضرور ہندو پرشین سکرٹریوں کے لکھے ہوئے ہوں گے - کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ ان مراسلوں کی نوعیت سیاسی ہوگی اور انداز تحریر مدبرانہ ہوگا - یہ اہم ذمہ داری وہ ہندو دربار غیر ملک کے لوگوں کے

سپرد نہیں کرسکتے تھے - لابد ہے کہ وہ پرشین سکریٹری ہندو ہی ہوں گے اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ "تلک" جو محمود غزنوی کے زمانے میں ہوا ہے فارسی بہت اچھی جانتا تھا تو جو کچھہ ابھی کہا گیا تھا اس کی حد سے بہت آگے پہنچ جاتا ہے - ثابت یہ ہوا کہ ہندوستان میں اسلامی تسلط سے پیشتر فارسی کا علم کم و بیش موجود تھا جبھی تو 'چند کوی' کی نظموں میں فارسی الفاظ اور کہیں کہیں فارسی مرکبات ملتے ہیں جو بعض محققوں کو چونکاتے ہیں —

یہ تو ہوئیں پرانی باتیں جو عہد حاضر کے قضیۂ لسانیہ سے مبادیات کا تعلق رکھتی ہیں - ہماری اُردو ہندوؤں اور مسلمانوں کے مشترک مساعی اور اتحاد کا نتیجہ ہے - اس کی تنظیم و تدوین میں ان دونوں فرقوں کی شرکت ہے - یہ تنظیم سلطان اور رعایا، حاکمی اور محکومی، افسری اور ماتحتی کی لم سے مبرا ہے - وہ ایک مبارک ثمر تھا اس ادبی کل برکش اور طوبی کے پیوند کا جو قدرت نے ہندوستان کی سرزمین پر بھیجے - یہاں معاشرت نے انہیں پیوند کیا - روا داری نے اس کو تہذیب و تمدن کے امرت سے سینچا اور شائستگی نے اس کی ضروری شاخ تراشی کی حسن سلیقہ اور شعور نفسیاتی نے موافق ہوا مہیا کی تب یہ قلمی پودا پروان چڑھا اور پھولا پھلا - اب انہیں باغبانوں کی نسلیں اگر اس سرسبز نونہال کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا چاہیں تو سمجھہ لیجیے کہ یہ کیا بات ہے؟ اس سے آگے میں کچھہ نہیں کہوں گا —

حضرات! آپ قیاس کرسکتے ہیں کہ سب سے بڑا سماجی گناہ کیا ہے؟ وہ ہے سچ بولنا - سانچ کو آنچ ہو یا نہ ہو - لیکن سادھارن زندگی میں سب سے بڑا سچ بولنے والا سمجھا جاتا ہے - عربی کا مقولہ الحق مر۶۹

کبھی سے زیادہ آج درست بیٹھتا ہے - مگر میں اس سے نہیں جھجکتا -
ابھی یہ امر واقعہ پایۂ ثبوت کو پہنچایا گیا ہے کہ اسلامی تسلط کے قریب
بلکہ اس سے پہلے ہندو فارسی سے واقفیت رکھتے تھے - میں کہتا ہوں وہ
ہندو ہی تھے جنھوں نے مسلمانوں سے مل کر اُردو کی تدوین کی - غیر
صرفی زبانوں میں مفرد لغات کا باہر سے لے کر داخل کرلینا ایک بات
ہے - وہ مصدر اور افعال ہیں جو ایک زبان کی صرفی نوعیت اور ادبی
حیثیت پر مستقل اثر ڈالتے ہیں - سب جانتے ہیں کہ مصدر کی علامت
فارسی میں 'دن' اور 'تن' ہے اور پراکرت اور شورسینی اور اس سے
ماخوذ اکثر آپ بھرنش بھاشاؤں میں 'ن' اور اس کا ماقبل مفتوح
مصدر کی علامت رہی ہے - اردو میں یہ علامت 'نا' قرار پائی جسے بعد
میں ہندی نے اختیار کیا - اس اختراع کے بعد انھوں نے مصدر سے تمام افعال
وضع کیے اور اس میں ملکی اور غیر ملکی مادوں کے ساتھ مساوات کا
سلوک ہوا - مثلاً: بخشنا - خریدنا - بدلنا - فرمانا وغیرہ - مصادر جو فارسی
اور عربی سے ماخوذ تھے ان کو اس طرح اپنایا گیا کہ ان کی اور آنا'
جانا' لینا' دینا کی حیثیت میں بال برابر بھی فرق نہ رہا - اردو کا یہ
اختراع ہندی کو بھی قبول ہوا - گسائیں تلسی داس کا ارشاد ہے: -

"تو غریب کو نواز ہوں غریب تیرو"

'نواختن' سے نوازنا مصدر بنایا گیا اور اس سے 'نواز' صیغۂ امر
مشتق ہوا - اسے کہتے ہیں لسانیاتی تصرف - یہ ہے ایک اجنبی لفظ کو اپنانا
لہجے کے فرق کے ساتھ یہ مصرع لسانیاتی نقطۂ نظر سے آج کل کی اردو
زبان میں ہے - امر کا یہ صیغہ اور دوسرے عربی' فارسی لفظ گسائیں جی
کے کلام میں کہاں سے آئے - اس کا ذکر آگے آئے گا - مصادر اور افعال

اسموں کے علاوہ بڑی تعداد میں باہر کی زبانوں سے لے لیے گئے تھے جو اس 'ہندیرانی' زبان میں سموئے ہوئے ہیں جسے آپ اردو کہتے ہیں - یہ زبان دیوناگری حروف میں لکھی گئی تو ہندی کہلانے لگی - چنانچہ گسائیں جی کی راماین میں نشان' فوج' ننھوری' شہنائی وغیرہ الفاظ موجود ہیں - ان سے پہلے کبیر داس اور گرونانک کے کلام میں وہ اختراعی اور اجتہادی ترکیبیں اور الفاظ کثرت سے ملتے ہیں جو ابتدائی اردو والوں نے پراکرت اور اپ بھرنش بھاشاؤں سے لے کر سودھے یا گھڑے —

جو فارسی اور عربی لفظ نئی زبان میں آسمائے وہ کام ہے زیادہ تر اُن بزرگوں کا جو اُدھر عربی اور فارسی جانتے تھے اور ادھر پراکرت اور اپ بھرنش سے واقف تھے - ان میں ہندو اور مسلمان دونوں برابر کے حصہ دار ہیں —

اب یہ سوال اُٹھتا ہے کہ اُردو دوقوموں کے میل جول اور دیسی اور بدیسی زبانوں کے اختلاط سے پیدا تو ہوگئی لیکن کیا بعد میں بھی ہندو اس کو اپنی زبان سمجھتے رہے اور اس کو استعمال کرتے رہے؟ حضرات! میں اس تقسیم کو جو نہایت اہم ہے مبہم میں رکھنا پسند نہیں کرتا - سنیے - ہندوؤں میں تبلیغ مذہب تو عرصے سے بند ہوچکی تھی - تقریباً دو ہزار برس کے بعد اب پھر تازہ ہوئی ہے اس واقعے کو نظر میں رکھ کر دیکھنا یہ ہے کہ ہندوؤں میں دھرم پرچار کے سلسلے میں اردو اختیار کی گئی یا نہیں؟ اگر تحقیق سے اس کا جواب اثبات میں ملے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ اردو کو ہندوؤں نے اپنے ہندو بھائیوں کی دینی ہدایت کے لیے استعمال کیا جس طرح اسلامی تسلط کے ابتدائی عہد میں مسلمان صوفیوں نے نومسلموں کی ہدایت کے لیے اردو کو برتا —

انیسویں صدی عیسوی کے اول برسوں میں اچھوت ادھار اور ہری جنوں کی تبلیغ یا شدھی کا نام تک کوئی نہ جانتا تھا مگر سنہ ۱۸۱۹ع مطابق سنہ ۱۲۳۴ھ میں سمریمو بھاگوت کا دسواں اسکند یعنی باب اردو کی ایک ضخیم مثنوی مسمیٰ "انوٹھا مستور" کی صورت میں ظہور پذیر ہوتا ہے - یہ کئی سو صفحے کی قلمی کتاب میرے کتب خانے میں موجود ہے - یہ مذہبی اور اعتقادی کتاب ایک ہندو اپنے ہندو بھائیوں کے لیے اچھی اردو نظم میں تصنیف کرتا ہے - اس سے بدیہی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ ہندوؤں میں اردو کہاں تک جاری و ساری تھی - نمونے کی طور پر ایک جگہ سے اس کے دو چار شعر سننا دل چسپی سے خالی نہ ہوگا - کرشن مہاراج دوارکا سے اودھوجی کو متھرا بھیجتے ہیں کہ وہ برجباسیوں کو سمجھائیں کہ وہ مہاراج کے لڑکپن کی لیلاؤں کو بھلا کر جن کی یاد نے انھیں دنیا سے بیزار کر دیا تھا اپنے اپنے کام میں لگیں ملاحظہ ہو :—

" سنا یہ گوپیوں نے ماجرا جب تو ہو بے تاب و طاقت یک بہ یک سب
چلیں جوں سیل سوئے قاصد یار کہ تا راز نہاں سے ہوں خبردار
ہوئیں برگرد اودھو اس روش جمع کہ پروانہ ہو جوں پھرا من شمع
جو دیکھی سب نے وہ اودھو کی صورت بہ آب چشم دھو گرد کدورت "

... ...

مختصر یہ کہ سنسکرت اور ہندی بھاشاؤں کے ہوتے ساتے ہندوؤں نے اردو کو اوراد و وظائف سے یا زیادہ احتیاط سے یہ کہیے کہ مذہبی اور ملی تقریبوں سے خارج نہیں کیا - شکت چالیسی ایک اردو کی کتاب استوتر یعنی وظیفے کی ہے - یہ اردو کے مخمس ترجیع بند کی صنف سے ہے - ہر بند کے چار مصرعے ٹھیٹ اردو میں ہیں اور ترجیع کا مصرع

" تمس تسی " چار بار آتا ہے - اس کو میں نے پوجن کے سلسلے میں وظیفے یا مناجات کی طرح پڑھتے ہوئے دیکھا ہے اور یہ دھیان میں رکھنے کی بات ہے کہ تلسی داس رامایں لکھہ چکے تھے - اس کی کتھا برابر ہو رہی تھی - مہابھارت اور بہت سے پران اور دوسری مذہبی کتابیں ہندی میں منتقل ہوچکی تھیں لیکن اپنی اہالی ملت میں دھرم پرچار کی کمی محسوس ہوئی جب تک کہ اردو سے کام نہ لیا گیا - اس ضمن میں منشی شنکر دیال 'فرحت' منشی رام سہائے تمنا اور 'خوشتر' وغیرہم حضرات نہ صرف ہندوؤں کے بلکہ تمام اردو دنیا کے شکریے کے مستحق ہیں جنہوں نے مہابھارت' رامائن' گیتا مہاتم' شوپران' گنیش پران اور جانکی بجے وغیرہ دھرم پستکیں اردو میں تصنیف اور ترجمہ کیں - یہ کتابیں منشی نول کشور کے مشہور عالم مطبع سے چھپ کر آج تک شائع ہو رہی ہیں اور ہندوؤں میں ان کے مذہب کی تلقین اور روایات ملی کے زندہ رکھنے کا زبردست آلہ ہیں - ان نظم کی کتابوں کے علاوہ بہت سے اپنشد اور چھوں شاستر اور سمرتیاں اردو نثر میں منتقل ہوکر شائع ہوئیں اور آج تک ان کی مانگ برابر جاری ہے - یہی حال آریہ سماج کے لٹریچر کا ہے - یہ سوال بہت بر محل ہوگا کہ اگر اردو کا ہندو دیہات یا مایات پر کچھہ اثر ہے تو اردو کے معترضین بتائیں اور ثابت کریں کہ ان کتابوں سے ہندو دھرم یا جاتی کی کیا ہانی ہوئی ؟

ہندوؤں نے یہی نہیں کیا کہ اپنے دھرم کی کتابیں اردو میں ترجمہ یا تالیف کیں بلکہ رواداری یہاں تک عمل پیرا ہوئی کہ دوسرے مذہب کے بانیوں اور بزرگ ہستیوں کی شان میں انہوں نے جو کچھہ لکھا وہ دوسری جگہ بھی مقبول ہوا - سرور جہاں آبادی کی نعت اس وقت مولود

شریف کے جلسوں میں نہایت خلوص سے پڑھی جاتی ہے اور اتنی ہی دل چسپی سے سنی جاتی ہے - یہ سب جانتے ہیں کہ سرور جہاں ابادی ہندو ہی رہے اور ہندو ہی مرے - جب نعت اور اتنی مقبول عام نعت اردو میں لکھہ کر ایک ہندو ہندو دھرم پر قائم رہ سکتا ہے تو پھر یہ خوف کہ اگر ہندو اردو سے دل لگائیں گے تو ان کے دھرم اور مذہبی روایات کو صدمہ پہنچے گا - ایک مریضانہ واہمے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا، جس کا علاج نہ چرک کے پاس ہے نہ لقمان کے —

آپ نے دیکھا کہ اردو کی تعمیر و تدوین اور ترویج میں ہندوؤں کا کتنا مقتدر حصہ ہے - آپ نے دیکھا کہ ہندوؤں کی مذہبی اور ملی کتابیں کس کثرت سے اردو میں لکھی گئیں اور آپ دیکھتے ہیں کہ 'بھگوت گیتا' کے ایک سے زیادہ نئے ترجمے اور تفسیریں اُردو نظم اور نثر میں ہر سال بلا ناغہ شائع ہوتے رہتے ہیں - آپ نے یہ بھی دیکھا کہ نعتیہ کلام بھی ہندوؤں کو ہندو مت سے برگشتہ نہ کر سکا - یہ واقعہ بھی ذہن میں رکھنا ہے کہ ہندوؤں کے اردو اخباروں کے خصوصی نمبر یعنی کرشن نمبر یا بسنت پنچمی نمبر وغیرہ میں مسلمانوں کی لکھی ہوئی چیزیں کتنی ہوتی ہیں - اگر کوئی ہندی والا (میرا مطلب ہے اردو ہندی کے جھگڑے کا علمبردار) اس وقت یہاں موجود ہے تو سامنے آکر بتائے کہ جو واقعات ابھی پیش کیے گئے ان میں سے کون سا صداقت سے محروم ہے —

مسلمانوں نے ہندی کی جو خدمت اور اعانت کی وہ ہندی ساہتیہ کی تاریخ میں عظیم الشان جگہ رکھتی ہے - یہی نہیں کہ 'خانخانان رحیم' اور ملک محمد جائسی' اور 'رس خاں' جیسے مستند شاعر اور صاحب تصنیف انہوں نے پیدا کیے بلکہ مسلمان بادشاہوں نے ہندی کی سرپرستی میں

تنگ دلی کا اظہار کبھی نہیں کیا ' مہابلی اکبر' کے عہد کو جانے دیجیے - پکے مسلمان اورنگ زیب کے عہد اور دربار کا حال سنیے - ' کبتا کومدی ' کے فاضل مصنف نے اپنی کتاب میں جا بجا اردو شاعری کے متعلق انوکھی اور نرالی باتیں لکھی ہیں جو حقیقت سے کوسوں دور اور مورخانہ حیثیت سے معصوم ہیں - لیکن وہ بھی یہ کہے بغیر نہیں رہ سکے کہ مشہور رزمیہ شاعر یعنی بیورس کا بادشاہ 'بھوشن کوی' کا بھائی 'چنتا منی کوی' اورنگ زیب کے دامن دولت سے وابستہ تھا - اُسی کے توسل سے ' بھوشن کوی ' مغل دربار میں دہلی پہنچے اور وہیں رہے جب تک کہ دکن پہنچ کر 'سیواجی' کی خدمت میں بار یاب نہ ہوئے - (دیکھو کبتا کومدی ' جلد اول ' صفحہ ۳۶۰) صاحب کبتا کومدی نے تو صرف ہندی کے ان دو ہندو شاعروں کا ذکر کیا ہے جو اورنگ زیب کے دربار سے متعلق تھے ' لیکن مسٹر ایف - ای - کیئی (F. E. keay, M. A.) اپنی ہسٹری آف ہندی لٹریچر میں لکھتے ہیں :-

" سخت گیر اورنگ زیب ہندوؤں کے آرٹ اور علوم کا دلدادہ نہ تھا ' لیکن (ہندی کے ہندو) شعرا دربار کی اعانت اور سرپرستی سے قطعاً محروم نہیں رہے اور بہت سے شاعر اورنگ زیب اور اس کے بیٹے بہادر شاہ (سنہ ۱۷۰۷ ع سے سنہ ۱۷۱۲ ع تک) کے دربار سے وابستہ تھے " - (صفحہ ۳۶) —

جب اورنگ زیب کے دربار میں ہندی کے اور ہندو شاعروں کے لیے جگہ تھی تو اور مسلمان بادشاہوں اور چھوٹی سرکاروں کا تذکرہ اس ضمن میں غیر ضروری ہے - یہ تو ہوئی مسلمان بادشاہوں کی پرانے زمانے کی بات - اب عہد حاضر کی سنیے حضرت 'آرزو' کا نام آگے آ ہی چکا ہے - میرے مکرم جناب 'نیاز' فتحپوری اپنے منفرس اور معرب اسلوب کے لیے بہت بدنام

ہیں - لیکن وہ بھی ' جذبات بھاشا ' کی ترتیب کے بغیر چین نہ پا سکے اور ابھی کچھ مہینے ہوئے ہندی شاعری کے مختلف موضوعوں سے متعلق جو انہوں نے ایک سالم نمبر اپنے رسالہ 'نگار' کا وقف کردیا - اس امر کی دلیل ساطع ہے کہ مسلمان ہندی سے نافر نہیں ہیں - عثمانیہ یونیورسٹی اس نزاع کے علمبرداروں کی آنکھہ میں بہت کھٹکتی ہوگی مگر اس کا نصاب تعلیم دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ حیدرآباد میں جہاں اُردو ایک واحد مضمون درس ہے وہاں اُردو کے ساتھہ ہندی بھی بطور اس کے رکن اساسی کے موجود اور اس میں شامل ہے —

دوسری طرف بھی پایا جاتا ہے کہ ہندی اور ہندی والوں سے سرد مہری اور بے اعتنائی کا سلوک ہرگز نہیں - منشی پریم چند جن کا ابھی سرگباس ہوا اور جن کی بے وقت وفات کا ہم سب کو بے حد افسوس ہے ' اُردو میں افسانہ نویسی کے موجد ہیں - انہوں نے یہ کیا کہ اُردو میں اس فن کو پختگی دے کر اسے ہندی میں بھی جاری کیا - یہی نہیں کہ اردو میں افسانے کو ترقی دیتے رہے بلکہ ہندی کی صحافت کا بھی پایہ بلند کیا - میرے دوست جناب ساحر دہلوی اپنی بزم ادب کے عظیم الشان اردو مشاعروں کے ساتھہ ' ہندی کوی سمیلن ' بھی منعقد کیا کرتے ہیں - یہ واقعات بدیہی ثبوت ہیں اس امر کا کہ اردو والے ہندوؤں یا مسلمان ان کا سلوک ہندی سے معاندانہ ہرگز نہیں لیکن دوسری طرف سے جو کچھہ ہو رہا ہے بیان کا محتاج نہیں —

تو شرط یاری و رسم رواداری نمی دانی
ہمیں دل می توانی برد و دلداری نمی دانی

اگر ہم اردو ادب پر ایک اُچٹتی ہوئی نظر بھی ڈالیں تو واضح

ہوگا کہ اُردو کے شعرا نے خالص ملکی یعنی ہندوستانی - میں کہوں گا ہندوانی روایات اور تلازموں کو اُردو زبان اور ادب سے یہی نہیں کہ خارج نہیں کیا بلکہ ان کو رواج دیا اور چمکایا یہ ٹھیک ہے کہ دجلہ اور جیحوں، بدخشاں اور بیستون، اور فرہاد اور مجنوں بھی اُردو میں داخل ہوگئے لیکن گھر کی مرغی مرغی ہی رہی اور گھر کا جوگی جوگنا نہیں بنا - گھر کا جوگی اور باہر کا سدھ دونوں یار بن گئے - اس ضمن میں سند کی طور پر اُردو کے چند مسلمان شعرا کے کلام سے استفادہ کیا جاتا ہے جو بے محل نہیں —

میر

ریگستان میں جاکے رہے یا سنگستان میں ہم جوگی
رات ہوئی جس جاگہ ہم کو ہم نے وہاں بسرام کیا

دل کی تہ کی کہی نہیں جاتی نازک ہے اسرار بہت
انچھر تو ہیں عشق کے دو ہی لیکن ہے بستار بہت

جرات

شاید آجاے کبھی ہاتھ عروس گیتی
اسی اُمید پہ ہم بیٹھے ہیں آسن مارے

درد دل اس بت بیدرد سے کہیے تو کہے
جاکے یہ را. کہانی تو سنا اور کہیں

مصحفی

چہرہ اُتر گیا ہے نقشے بگڑ گئے ہیں
پھر ان دنوں تو میرے لچھن سے جھڑ گئے ہیں

رنگین

ہے یہ گھر لنکا یہاں ہے کون باون گز سے کم
ایک سے ایک آہ بندی کی سہیلی قہر ہے

نصیر

تیرے ہی نام کی سمرن ہے مجھہ کو اور تسبیح
توہی ہے ذکر ہر اک صبح و شام عاشق کا

معروف

پھر ہفتہ کے دن آیا جو سفر سے معروف
میں نے جانا کہ بس اب مجھہ پہ سنیچر آیا

آتش

ارادہ عرش اعظم کا ہے آہ صبح گاہی کو
در فریاد رس پرچل کے اب دھونی رمانی ہے

اسیر

چاہے قسم جو یار تو کیا کیا اٹھائیے
قرآن سر سے آنکھہ سے گنگا اُٹھائیے

وزیر

ہوا دھوپ میں بھی نہ کم حسن یار
کندھیا بنا وہ جو سنولا گیا ،

کب شعر ہم نے یار کے آگے پڑھے نہیں
کس دن ہمارے پھول مہیسر چڑھے نہیں

اُردو کیا ہے ؟ دو مختلف معاشرتوں ، دو مختلف مذہبوں ، دو

مختلف کلچروں کے شیر و شکر ہونے اور ارتباط کی یادگار' وہ ہے عرب کے مذہب اور ایران کی کلچر کا دنیا کی سب سے قدیم کلچر یعنی آرین تہذیب سے تصادم نہیں ' اختلاط - یہ سب کچھہ اپنے آپ ہوا - جس وقت ہندوؤں نے فارسی پڑھنا اور اُردو کی نیو رکھنا شروع کیا تھا اُس وقت اسلامی حکومت نے مہکالے کے مارینٹی منٹ کا سا کوئی فرمان جاری نہیں کیا تھا - بلکہ جو کچھہ ہوا بالطبع ہوا - نتیجہ یہ کہ فریقین اپنے اپنے اعتقاد پر قایم رہ کر فروعی اختلافوں اور رسمی نقیضوں کو بھلا بیٹھے - تعصب اور عصبیت کی جگہ رواداری اور موالات نے لی- رہنا سہنا' خوشی اور غمی کی تقریبوں میں شرکت ' یہ باتیں معاشرت کا روز مرہ ہوگئیں - یہ سب اُردو اور اُردو کے کلاسیکل اسکول کی برکت ہے - لٹریچر میں دیر و حرم پر وہ سخت دھاوے ہوئے کہ الاماں - سبحہ و زنار ہوا میں اُڑ گئے - زہد و تقوی کا قل ہوگیا - غرض کہ کیا کچھہ نہ ہوا - اس میں ہندو اور مسلمان شعرا کا پلہ برابر تھا - اور ہم یعنی اردو والے خواہ کسی قوم اور مذہب کے ہوں اب تک اسی رستے پر چلے جارہے ہیں - شعر سے اخلاق اور اخلاق سے کردار متاثر ہوا ' اور معاشرت نے وہ رنگ پکڑا اور ایک ایسی کلچر پیدا ہوگئی جس کی مثال روما اور یونان کا مہل بھی پیش نہیں کرسکتا —

وہ ہندو ہوں یا مسلمان ' ہندی والے ہوں یا اُردو والے جو اس ہندستان رواداری اور ہندیرانی کلچر کو فنا کرنے کی فکر میں ہیں یقین جانیے وطن کے بدخواہ اور خود اپنے دشمن ہیں - کسی نے خوب کہا ہے —

فرق کیا واعظ و عاشق میں بتائیں تم کو
اُس کی حجت نہ گئی اِس کی محبت نہ گئی

اگر پوچھا جاے کہ پھر یہ گڑ بڑ اور شورا شوری کیوں ہے ؟ اس کا مختصر جواب تو یہ ہے کہ —

زرہ دوراست خلق از انحراف وضع کج فہمی
وگر نہ ہیچ کس را لغزش گامے نمی باشد

جو لوگ یہ سمجھہ بیٹھے ہیں اور اس تیقن کے ساتھہ کھڑے ہوئے ہیں کہ ہندو دھرم قایم نہیں رہ سکتا اگر ہندی لنگوافرینکا نہ بنے یا جن کا عقیدہ یہ ہے کہ دین اسلام کو صدمہ پہنچے گا اگر اردو کو ہندی پست کردے تو میں کھلے خزانے کہتا ہوں کہ وہ دونوں غلطی پر ہیں۔ میں ہندی اور ہادی والوں کو دیکھتا اور سنتا ہوں مگر اردو والوں کو سمجھتا ہوں اور بلا خوف کہتا ہوں کہ اگر یہ ساٹھہ برس میں نے اردو کے پیچھے اور اردو والوں میں بے فائدہ ضایع نہیں کیے تو میں جانتا ہوں اُردو والے جو واقعی اُردو کے کفیل اور وکیل ہیں ان کو یہ سانسا نہیں کہ اُردو کے ساتھہ دین اسلام اور ملت بیضا پست ہوجائیں گے اُن کو اور مجھہ کو رونا ہے تو یہ کہ اُردو کی مخالفت جس جوش و خروش کے ساتھہ اب شروع ہوئی ہے اور جو منافقانہ پراپگنڈا کیا جارہا ہے اس کا زہریلا اثر وطنیت اور صدیوں کی بنائی ہوئی کلچر کو ملیامیٹ کردےگا اور ہمارے ہندوستانی تمدن اور معاشرت کی وجاہت کا خون اپنی گردن پر لے گا —

جمہور کا حال جداگانہ ہے۔ جوش اور جذبہ۔ جوش اور جذبے کی تحریک کیا ہی کرتا ہے۔ دیکھنا تو یہ ہے کہ ثقات کا کیا رویہ ہے اور اب تک رہا ہے کشش باز گشتی یا ردعمل جیسا طبیعیات کا اٹل قانون ہے ویسا ہی اجتماعی نفسیات کا ۔ غیرت اور خود داری بے شک انسان کے

شعار کا جوہر ہیں اور یہ کہنا بجا ہے کہ -

جانِ ما تاب زہر زلف پریشاں نہ خورد
دل ما آب زہر چاہ زنخداں نہ خورد

حضرات! اُردو کچھ حلوائے بے دود نہیں جسے کوئی چپکے سے نگل جائے - اُردو کہیے یا ہندوستانی اس کی جڑیں دور تک پہنچی ہوئی ہیں- اس میں اصلاح اور ترمیم کی ضرورت ہے جو ہر زندہ زبان میں ہوا کرتی ہے اور یہ کام ہے ہمارا - ہندی کی ترقی سے اُردو والوں کو حسد نہیں - لیکن وہ ہندی ہندی تو ہو - کانگرس کی مجلس عاملہ نے بہت دانائی کی جو مہاسبھائیوں کے مطالبے کو رد کردیا۔ اس سلسلے میں مجھے سخت افسوس ہے کہ مہاتما گاندھی کا نام بھی زبان پر آئے بغیر نہیں رہتا - بھارتیہ ساھتیہ پرشد کے اجلاس میں جو کچھ موصوف کی ذات بابرکات سے ظہور پزیر ہوا سخت مایوس کرنے والا ہے آپ کی مقدس ہستی وہ ہے جس کی عزت اور محبت ہر ذی ہوش کے دل میں ہے لیکن -

بے محبت نہیں اے ذوق شکایت کے مزے

وہ ہمارے بزرگ ہیں- اسی سے تو کہنا پڑتا ہے کہ جب اُنہوں نے اپنے سابرمتی کے آشرم کی بھجناولی مرتب کرنے کا حکم دیا اُس وقت بھارتیہ ساھتیہ کا یہ نظریہ جو اب ناگپور میں ہنگامہ آرا ہوا کہاں چلا گیا تھا ؟ یہ معلوم کرنا دلچسپی کا موجب ہوگا کہ مہاتماجی کے مرحوم سابرمتی آشرم کے بھجنوں کے اس ہندی کے مجموعے میں کل ۱۸۱ بھجن ہیں- جن میں ۱۰۲ بھجنوں کو ہندوستانی نام دیا گیا ہے باقی ۷۹ بھجن گجراتی - مرہٹی وغیرہ دوسری زبانوں کے ہیں- اور یہ واضح رہے کہ ان ۱۰۲ ہندوستانی بھجنوں میں کئی غزلیں بھی ہیں- جیسے —

ہے بہار باغ دنیا چند روز

دیکھ لو اس کا تماشا چند روز

یہ بھجناولی ہندی میں چھپی ہے - اب اگر اُردو کے لفظ سے کسی وجہ سے بے اعتنائی ہوگئی تھی تو بھارتیہ ساہتیہ میں ہندوستانی ہی سے کام رکھتے لیکن ہوا یہ کہ میرے حبیب لبیب مولوی عبدالحق کو یہ شعر پڑھتے ہوئے ناگپور سے واپس آنا پڑا —

آپ محو ناز ہم اہل نیاز

کس طرح نبھتی ہے دیکھا چاہیے

ان سب باتوں کے باوجود ماننا پڑے گا کہ مہاتما جی ہر دل عزیزی کے ساتھ حق پسند ضرور ہیں - جب ناگپور کا شرارا شعلہ بن کر بھڑکنے لگا تو آپ نے صاف فرمادیا کہ ہنگامی فضا کا تقاضا اور بات ہے ورنہ وہ اُردو کے مخالف نہیں اور زبان کے معاملے میں ان کا مذہب وہی ہے جو بیس برس پہلے تھا ع —

ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا !

ہندی نے پچھلے کئی برسوں میں بہت ترقی کی ہے - اور ہم یہ دیکھ کر خوش ہیں - لیکن اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ وہ ترقی ہندی کو اصلی تمول اور ادبی ارتقا کی طرف نہیں لے جا رہی ہے - یہ میری رائے نہیں بلکہ ان ہندی والوں کی رائے ہے جو اس بارے میں قیادت اور انتقاد کی شان رکھتے ہیں - میں اشارہ کروں گا اُس صدارتی خطبے کی طرف جو پنڈت پدم سنگھ شرما نے ہندی ساہتیہ سمیلن کے ایک مقتدر اجلاس میں فرمایا - کچھ مدت سے کھڑی بولی اور برج بھاشا کے محاسن سے بحث چھڑی ہوئی تھی - لوگ پنگل یعنی عروض کے قیود سے آزاد اور برج

بھاشا کی جامعیت اور نغزیت سے منکر ہوتے جاتے تھے - سمیلن کے صدر شرما صاحب نے سند اور دلیل سے ان کو معقول کرنا چاہا - لیکن لوگ اسی ڈھرے پر چل رہے ہیں جو انہوں نے اختیار کیا -

جاننا چاہیے کہ یہ کھڑی بولی ہے کیا چیز ؟ یہ کھڑی بولی اصل میں میرٹھہ کے ضلع کی بولی ہے - یعنی جس زبان میں دلمیر کا دیوان مرتب ہوا بنارس کی ناگری پرچارنی سبھا کے سکرٹری شیام سندر داس جی اپنی ہندی کتاب مسمی ہندی بھاشا کاوکاس میں لکھتے ہیں کہ مدتوں اس زبان میں ساھتیہ یعنی ادبی تصانیف کا نام و نشان تک نہ رہا اور وہ امیر خسرو کو اس زبان کا اولین شاعر قرار دیتے ہیں (دیکھو صفحہ ۷۵ سے) اب اس میں سنسکرت کے لغت اور مرکبات بے تحاشا آملے ہیں اور وہ کھڑی سے پڑی یا گڑبڑی بولی بن گئی ہے - مہاشہ پدم لال پنا لال شاستری نے اپنی کتاب ہندی ساھتیہ ومرش میں اس زبان کی موجودہ حالت پر منصفانہ روشنی ڈالی ہے - ملاحظہ ہو صفحہ ۱۸۳ سے - اور ادھیاپک رام رتن جی اپنی مادھیمک ویاکرن میں یہ لکھتے ہیں : -

اُردو والے لکھنؤ اور دھلی کے پریوگتوں کو پرمانک سمجھتے ہیں اور ہندی والے دھلی اور آگرہ کے" (صفحہ ۳۵)

اب حیرانی ہے کہ ہندی سے کونسی زبان مراد لی جائے ؟ آیا وہ میرٹھہ کے ضلع کی بولی ہے یا وہ زبان جو دھلی اور آگرہ سے تعلق رکھتی ہے - آگرہ کی ہندی برج بھاشا ہے اور دھلی کی ہندی بھی برج بھاشا ہے لیکن بانگڑی اور شورسینی کا کچھہ اصلی رنگ لیے ہوئے - بہ ہر حال ساھتیہ جسے کہتے ہیں وہ ان دونوں مقاموں کا برج بھاشا ہی میں ہے - اس پیش کردہ زبان یعنی آج کل کی ہندی کد یعنی نثر کے متعلق

عام شکایت سننے میں آتی ہے کہ وہ کس قدر سنسکرت آمیز ہو رہی ہے ہندی پد یعنی نظم کی حالت گد یعنی نثر کی حالت سے بھی خراب بتائی گئی ہے، یہاں تک کہ ہندی ساہتیہ سمیلن کے اجلاس میں جو مظفرپور میں ہوا اس کے فاضل صدر کو اپنے خطبۂ صدارت میں یہ کہنا پڑا :—

" ہمارے ہندی کے نوین کویوں کی متی گتی بالکل نرالی ہے وہ کبتاکی گاڑی کے دھرے اور پہیے بھی بدل رہے ہیں - اپنے او بہت چھکڑے میں پیچھے کی اور مریل ٹٹو جوت کر کنتو پتھہ پر پہنچایا چاہتے ہیں ... ... یہ انتی نہیں منومکھتا کا لکشن ہے، اس سے کبتا کا سدھار نہیں سنگھار ہو رہا ہے " —

صاحب صدر آگے چل کر اردو سے استفادہ کا مشورہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں —

" سدھار اسی ڈھنگ سے ہونا چاہیے جس کا نردیش مہاکوی حالی نے کیا ہے اور جس کے انوسار اردو کے نوین کویوں نے اپنی کبتا کو سامیکتا کے منوہر سانچے میں ڈھال کر سپھلتا پراپت کی ہے " —

آپ کو معلوم ہوا جو حالت ہندی نثر اور نظم کی اس وقت ہے - یہ زبان کیونکر کل ملک کی زبان ہونے کا دعویٰ کر سکتی ہے - اور کوئی مذاق سلیم اور ادب میں شعور رکھنے والا اردو کو چھوڑ کر اُسے کس طرح اختیار کر سکتا ہے - ہندی کے نقاد اور ادیبوں کی رایوں سے اقتباس اور ان کے حوالے آگے کافی آچکے ہیں - اس بارے میں زیادہ بستار سے کام لینا محض طوالت ہے - ظاہر ہے کہ ہماری یعنی ہندوستان کی معاشرت اور تمدن کا ہر ادارہ اس وقت معرض انقلاب میں ہے - اور انقلاب یعنی پریورتن کوئی مستحکم چیز نہیں ہوا کرتا - نہ معلوم اونٹ کس کروٹ بیٹھے اور کل کو کیا صورت پیدا ہو - حسن عمل اس کا متقاضی تھا کہ

ہندی والے پہلے اپنے گھر کے سدھارنے کی فکر کرتے۔ پھر دوسروں کے گھروں پر شفقت کی نظر ڈالتے۔ مگر افسوس کہ ایسا نہیں ہورہا ہے کتابوں کی تعداد بڑھانا ایک بات ہے اور زبان میں لسانیاتی قوت اور ادبی وجاہت پیدا کرنا دوسری بات۔ اگر کہیں کسی زبان کو ہندی رسم الخط کا جامہ پہنانے میں کامیابی ہوگئی تو یہ اتنی بڑی بات نہیں کہ زمین پر پانو نہ رکھا جائے۔ سندھی اور لہندا اُردو رسم الخط میں لکھی جارہی ہے۔ یہی حال نوے فی صدی پنجابی کا ہے۔ لیکن اُردو والوں نے اس پر کبھی افتخار اور فتح یابی کا اظہار نہیں کیا۔ بلکہ وہ ہر عہد میں اپنی زبان کی اصلاح اور ترقی میں لگے رہے اور اب تک اسی میں مصروف ہیں۔ ہندی والے پہلے اُن مشوروں پر کار بند ہوں جو انہیں کے بزرگ ان کو دے رہے ہیں۔ پھر وہ ہندوستان کی کئی سو زبانوں اور بولیوں کی جگہ کاغذ اور زبان سے چھین لیں۔ اگر چھین سکتے ہوں تب کہیں اُردو پر حملہ آسکتے ہیں۔ اور للکوا فرینکا کے دعوے دار ہوسکتے ہیں —

ہمارا لایحۂ عمل ان ناگوار عوارض میں کیا ہو؟ اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں یہ تفصیل بالاجمال مولوی عبدالحق کانفرنس کے دعوت نامے میں دے چکے ہیں۔ یہاں کچھ اشارات اب سے پہلے آچکے ہیں۔ اب یہ کہنا ہے کہ یہ دیکھ کر کہ ہندی والے جو ہندی میں سنسکرت کی اندھا دھند بھرمار کر رہے ہیں تو ہم بھی کیوں نہ اُردو میں فارسی اور عربی کی بھرتی کرتے جائیں۔ میں آپ سے اور اُن سے دونوں سے کہتا ہوں کہ ایسا کرنا کسی طرح بھی مستحسن نہیں۔ یہی نہیں بلکہ لسانیاتی خود کشی کی حد تک پہنچتا ہے بلکہ جاننا چاہیے کہ جب ایک زبان کو یہ لیکا پڑ جائے کہ ضرورت پڑ یا بے ضرورت اپنے لسانی ذخیروں میں تلاش اور پڑتال کی

زحمت نہ اُٹھا کر غیر زبانوں سے (یعنی سنسکرت - عربی فارسی وغیرہ) بلا تصرف الفاظ اور مرکبات لینے کی عادی ہوجائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ زبان اپنی تصریفی قوت اور اشتقاقی استعداد سے محروم ہوجاتی ہے - اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم اپنی زبان کے سوا اور زبانوں کو اچھوت جان کر دور کریں - یہ رویہ ہمارے لیے اچھا نہ ہوگا۔ اُردو میں اختراع کے ساتھ تصرف اور تارید کی اہلیت اعلیٰ درجے کی ہے اور اسی کی بدولت یہ زبان زبان بنی - اور آئندہ ترقی کرے گی - مختصر یہ کہ اپنی انفرادیت قایم رکھتے ہوئے کسب و تصرف اور جلب منفعت جو اردو میں اب تک مسلط اور حاوی اصول رہا ہے اسے معرض تعطل میں ڈالنا بھی ویسا ہی غیر مفید ثابت ہوگا جیسا اندھا دھند اور بلا تصرف استعارہ - کسی کا قول ہے —

پروانہ چراغ حرم و دیر نداند

لیکن وہ کہیں جگنو کو چراغ نہ سمجھ بیٹھے —

آپ کی بہت سمع خراشی ہوئی - اب میں بھی تھک کر خاموش ہو جاتا ہوں - لیکن یاد رہے کہ —

بند ہے میری خموشی میں ہجوم فریاد

ہر نفس چاہتا ہے ایک صدا ہو جانا

ادبی معلومات

۱ ادیب کے فرائض	از ٹیگور
۲ ادب کا مستقبل	از ڈے - لیوس
۳ جرمنی میں ادب کی تباہی	ماخوذ از " لونگ ایج "
۴ ہندی کے افسانہ نگار	ماخوذ از " وشال بھارت "
۵ زمانۂ حال کی مرہٹی شاعری	از پربھاکر ماچوے
۶ کلاسکس کی فہرست	از ایڈیٹر

ادبی معلومات

ادیب کے فرائض

(از ٹیگور)

بنگلہ زبان کے نوجوان ادیبوں کی ایک مجلس میں تقریر کرتے ہوئے شاعر ٹیگور نے حال ہی میں کچھہ پتے کی باتیں کہی ہیں جن کا خلاصہ یہاں درج کیا جاتا ہے :-

" تخلیق ادب میں تنہائی جتنی مفید ہے اتنی ہی مضر بھی ہے - یہ سچ ہے کہ تنہائی میں ادیب اپنے نفس سے ہم گوش ہوتا ہے ' مطالعے اور مشاہدے کا اصل رمز وہاں ملتا ہے اور دھیان بٹانے کے لیے کسی قسم کا شور و شغب وہاں نہیں ہوتا - اسی وجہ سے عزلت پسندی میری طبیعت ثانیہ ہوگئی ہے - لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ سماج سے الگ تھلگ رہنے والا ادیب بنی نوع انسان سے آشنا نہیں ہوسکتا - بہت سے لوگوں سے مل کر جو تجربہ حاصل ہوتا ہے ' الگ رہ کر ادیب اس سے محروم ہوجاتا ہے - سماج کو جاننے پہچاننے کے لیے اور اس کی ترقی کی راہ کا پتا دینے کے لیے یہ ناگزیر ہے کہ ہم سماج کی نبض پر ہاتھہ رکھیں اور اس کے دل کی دھڑکن کو سنیں - یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہم انسانیت کے غم گسار اور ہمدم ہو جائیں - انسان کی روح کو صرف

اسی صورت میں ہم پہچان سکتے ہیں۔ ادب اور انسانیت جب باہم ایک دوسرے کے رفیق ہوجائیں گے تو رہنمایان خلق کو مستقبل کی اصل راہ ملے گی اور پھر وہ سمجھیں گے کہ بیداری کا صور کیا ہے اور زمانہ کس نغمے کو سننے کے لیے بیچین ہے۔ اس وقت انہیں عوام کے جذبات کا علم ہوگا۔ ظاہر ہے کہ عوام سے الگ رہ کر ہم بیگانۂ محض رہ جائیں گے۔ ادیبوں کو انسانوں سے مل جل کر انہیں پہچاننا ہے۔ میری طرح گوشہ نشین رہ کر ان کا کام نہیں چل سکتا۔ زمانۂ دراز تک سماج سے الگ رہ کر اپنی ریاضت میں میں نے جو بہت بڑی غلطی کی ہے۔ اب میں اسے سمجھ گیا ہوں اور یہی وجہ ہے کہ تمہیں یہ نصیحت کر رہا ہوں۔ میرے شعور کا تقاضا ہے کہ انسانیت اور سماج سے محبت کرنا چاہیے۔ اگر ادب، انسانیت سے ہم آہنگ نہ ہوا تو وہ ناکام اور نا مراد رہے گا۔ یہ حقیقت میرے دل میں چراغ حق کی طرح روشن ہے اور کوئی استدلال اسے بجھا نہیں سکتا —

آج ہمارا ملک ایک لق ودق صحرا ہے جس، میں شادابی اور زندگی کا نام ونشان نہیں ہے۔ ملک کا ذرہ ذرہ دکھ کی تصویر بنا ہوا ہے۔ ہمیں اس غم واندوہ کو مٹانا ہے اور از سر نو زندگی کے چمن میں آبیاری کرنا ہے۔ کوئی انجمن یا ادارہ غیر فانی نہیں ہے۔ لیکن جب تک تمہاری یہ مجلس زندہ ہے۔ اس کا فرض ہونا چاہیے کہ ملک میں نئی زندگی کی روح پھونکے، بیداری اور جوش کے گیت گائے، ہر انسان کو امید اور مسرت کا پیغام سنائے اور کسی کو ناامید اور ناکارہ نہ ہونے دے۔ ملک اور قوم کی بہی خواہی کو ذاتی اغراض پر ترجیح دینے کا جذبہ ہر چھوٹے بڑے میں پیدا کرنا اس مجلس کا فرض عین ہونا چاہیے۔ قوم، سماج اور ادب

کی بہبودی کی سوگند جب تک ہر انسان نہ کھائے گا' اس وقت تک دنیا کا مستقبل روشن نہیں ہوسکتا - اگر تم یہ کرنے کے لیے تیار ہو تو تمہیں پہلے اپنی متاع کھلے ہاتھوں لٹانی ہوگی اور پھر کہیں تم اس قابل ہوگے کہ دنیا سے کسی معاوضے کی تمنا کرو - لیکن اپنے کو مٹانے میں جو لطف ہے' اس سے تم محروم نہ رہ جاؤ یہی کہنے میں یہاں آیا ہوں —

یاد رکھو کہ تخلیق ادب بڑے جوکھوں کا کام ہے - حق اور جمال کی تلاش کرنا ہے تو پہلے 'انا' کی کینچلی کو اتارو' اور کلی کی طرح سخت ڈنٹھل سے باہر نکلنے کی منزل طے کرو - پھر دیکھو کہ ہوا کتنی صاف ہے' روشنی کتنی سہانی ہے اور پانی کتنا لطیف ہے " -

ادب کا مستقبل

از دے - لیوس

شروع ہی میں میں یہ واضح کردینا چاہتا ہوں کہ میں زندگی اور ادب کو دو مختلف چیزیں نہیں سمجھتا - ادب چاند کی طرح کوئی مردہ شئے نہیں ہے جو سورج کی کرنیں ادھار لے کر روشن ہوا کرتا ہے - ادب' زندگی کی بدلتی ہوئی شکلوں کو پہچاننے کی سعی ہے - اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ زندگی کس طرح ادب پر اثر ڈال رہی ہے - ان مختلف اثرات میں سے تین پر ہم اس مقالے میں غور کریں گے — سیاست' نفسیات اور سائنس —

میرے خیال میں سیاست ایک ساتھ مل جل کر رہنے کا علم ہے - آپ فوراً سوال کریں گے کہ اس علم کو ادیبوں سے کیا واسطہ جو یا تو

جنگلوں میں منگل مناتے ہیں یا اپنی تاریک کوٹھریوں میں ادب نوازی فرماتے رہتے ہیں - سلطنتوں کے زوال اور سماج کے انحطاط سے ان کا کیا تعلق ؟ لیکن یہ صحیح نہیں ہے - ادیب کوئی جوگی نہیں ہے اور نہ وہ رابنسن کروسو کی طرح کسی جزیرے میں تن تنہا زندگی گزار رہا ہے - کسی حد تک اس کے انفرادیت پسند ہونے میں شک نہیں لیکن ابتدا ہی سے وہ کسی سماجی گروہ کا ترجمان رہا ہے - جب وہ گروہ کسی مصیبت یا ہلاکت میں مبتلا ہو تو اس کے ترجمان کا مضطرب اور مغموم ہونا ایک فطری امر ہے - جب وہ دیکھتا ہے کہ اس کا ماحول مل جل کر رہنے کا ڈھب نہیں جانتا تو وہ مجبوراً سیاست کی طرف رجوع کرتا ہے تاکہ لوگوں کو صحیح رستہ سجھائے —

کہا جاتا ہے کہ یہ سیاست کا جُگ ہے - اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انقلاب فرانس کے بعد کسی دور میں ادیب سیاست کی طرف اس شد و مد سے راغب نہ ہوئے ہوں گے - ان کا خیال ہے کہ سماج کا پرانا نظام زندگی کے نئے مسائل کو حل نہیں کرسکتا - وہ یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ سماج میں جن تبدیلیوں کی ضرورت ہے اسے محض سیاست داں ہی سمجھ سکتے ہیں - بہ ایں ہمہ انہوں نے ڈی - ایچ - لارنس کے تجربے سے بھی سبق حاصل کیا ہے - اس جادو نگار نے جنگ عظیم کی غارتگری سے گھبرا کر ایک گروہ اپنے ہم خیالوں کا بنانا چاہا تھا لیکن وہ کامیاب نہ ہوا - اس سے ثابت ہوا کہ اس زمانے میں ایسا سماجی گروہ کام نہیں کرسکتا جو ایک شخصیت پر منحصر ہے - زمانے کی تگ و دو کا بار ایک شخص نہیں اٹھا سکتا —

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نوجوان ادیب ان دو تحریکوں میں سے ایک

کی حمایت پر اتر آئے ہیں جن کی بنیاد افراد پر نہیں بلکہ عوام پر ہے — یعنی فاشیزم اور کمیونزم - ان تحریکوں کا آغاز سماجی طبقوں کی کشمکش سے ہوا ہے - لہذا ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ سماجی طبقوں کا تضاد جتنا زیادہ بڑھتا جائے گا ادیبوں میں بھی دو گروہ بن جائیں گے اور وہ کھلم کھلا ان دونوں میں سے کسی ایک کی تائید کرنے لگیں گے - ادب کا تعلق عوام سے زیادہ ہو جائے گا اور افراد کے باہمی تعلقات پر اس کی نظر نہ رہے گی - ادب فرائض کی رہبری کرنے لگے گا، صرف ان پر تنقید کرکے چپ نہ رہ جائے گا - ادب ایک معلم ہو جائے گا اور سماج کے جھگڑوں میں اس کی حیثیت تماشائی کی نہیں بلکہ نبرد آزما کی ہو جائے گی - سیاست داں ادیبوں کو پھانس کر کسی نہ کسی پارٹی میں بھرتی کرلیں گے اور پھر تو ادب "پمفلٹ بازی" کی طرف مایل ہوجائے گا —

جو لوگ ادب اور سیاست کے میل کو ناپسند کرتے ہیں انہیں صرف "نفسیات" میں پناہ مل سکتی ہے - جب فرائیڈ (Freud) نے لاشعوری (Unconscious) کی طرف انسانیت کو متوجہ کیا تو گویا اس نے ایسا اہم انکشاف کیا جس کے نتائج امریکہ کے انکشاف اور مشین کی ایجاد سے زیادہ دوررس ہیں - یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ فرائیڈ نے یہ انکشاف اس زمانے میں کیا جب ادیب سماج کے انتشار کی وجہ سے پریشان ہو کر اپنی خودی میں سمٹ رہا تھا - ادب زیادہ داخلی اور تجریدی ہونے لگا تھا اور وہ انسانوں کے تعلقات کی نسبت نفس کی موشگافیوں کی طرف زیادہ توجہ کر رہا تھا - جوایس، پروست، الیٹ کفکا وغیرہ اسی نوعیت کے ادیب تھے جن کی تقلید آج کل کے نوجوان مصنف کر رہے ہیں —

یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ 'فرد' پر بہت زیادہ زور دینے کی

وجہ سے فرائیڈ لبرلزم کا سب سے بڑا پیغمبر بن گیا ہے - کیا عجب کہ ادب اور نفسیات کا اتحاد لبرلزم کو پھر سے زندہ کردے - ایک بات اور یاد رکھنے کی ہے - فرائیڈ کے تجزیے نے ہمارے اقدار کو بالکل بدل دیا ہے - اس نے انسان کے کیرکٹر کو جانچنے کا ایک نیا طریقہ نکالا ہے - ہمارے مقاصد پر اس نے جو روشنی ڈالی ہے وہ توہین آمیز ہوتے ہوئے بھی بہت واضح ہے - علاوہ بریں وہ ہمیں دعوت دے رہا ہے کہ نئی بنیادوں پر اخلاق کی عمارت کھڑی کریں - فرائیڈ کو بذات خود اخلاقیات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے - وہ سائنس کو انسانیت کا مسیحا اور مذہب کو اس کا دشمن سمجھتا ہے ۔ آرٹ کو وہ گوارا تصور کرتا ہے اور کہتا ہے کہ " وہ حقیقت پر حملہ نہیں کرسکتا ' اس لیے مفید اور بے ضرر ہے " - مختصر یہ کہ ادب کو انقلابی تحریک عامہ اور فرائیڈ کے لبرلزم میں سے کسی ایک کو منتخب کرنا ہے —

ایک تیسری چیز چھوٹی جاتی ہے جس نے مسایل کو زیادہ اُلجھا دیا ہے - یہ ہے سائنس - سائنس کی ایجادات کا دایرہ وسیع ہوتا جاتا ہے اور ریڈیو ' ٹیلی ویزن اور سینما ہمارے آگے جو حیرت انگیز مناظر پیش کرتے ہیں ' ادب ان کا تصور بھی نہیں کرسکتا - ممکن ہے کہ وہ زمانہ جلد آجائے ' جب کوئی آلہ ادیب کے جذبات اور خیالات کو رکارڈ میں بھر کر دنیا کو سنادے - یعنی سوال یہ ہے کہ چھپی ہوئی کتابوں میں ایسی کون سی خصوصیت رہ جائے گی جو سائنس کی ایجادوں میں نہ ہو - میرا خیال ہے کہ ادب کو حقیقت نگاری سے منہ موڑنا پڑے گا اور یہ میدان اپنے حریفوں کے سپرد کر دینا پڑے گا - لیکن حقیقت اور حقیقت نگاری میں بڑا فرق ہے - عظیم الشان ادب کا منشا ہمیشہ یہ رہا ہے کہ حقیقت کو رزمیہ داستان

کی صورت میں پیش کرے - شاید ادب کا آیندہ رجحان یہی ہوگا -
لیکن مستقبل کا رزمیہ انسانوں کی باہمی جنگ سے پیدا نہ ہوگا بلکہ
'انسان' اور 'قدرت' کی جنگ سے اسے ترغیب ملے گی - مشہور روسی
فلم 'زمین' اور 'ترک ساب' نے اس کی ابتدا کردی ہے —

میرا خیال ہے کہ ادب کے تمام شعبوں میں سے شاعری اور خیالی
افسانوں کے زندہ رہنے کا امکان سب سے زیادہ ہے - شاعری استعارے اور
موسیقی کا روپ لے کر دماغ کے ایسے کونے میں گھر بنا لے گی کہ عقل وہاں
تک پہنچ ہی نہ سکے گی - حکایت یا خیالی افسانہ اس لیے زندہ رہے گا
کہ وہ تعلیم کا سب سے انوکھا طریقہ ہے - وعظ و نصیحت اور پروپیگنڈے
کا اثر صرف شعور و عقل پر ہوگا - لیکن شاعری اور حکایت کی زندگی
کی ضمانت ان کے 'پھسلنے' کی صلاحیت پر ہے - یعنی وہ عقل کی باڑہ
کے بیچ سے پھسل جایا کرتے ہیں - وہ ایسی کوٹھریوں میں رہتے ہیں جہاں
تعلیمات یا پرچار کے افسر داخل نہیں ہوسکتے - لیکن شاعری اور قصوں
کو سادگی کے ساتھہ پر معنی ہونے کی صلاحیت پیدا کرنی ہوگی کیونکہ
نئی تہذیب کا یہی مقتضا ہے —

ادب کا مستقبل سراسر سماج کے مستقبل پر منحصر ہے - لیکن سماج
کا جو بھی روپ ہو ادب سے ہر حال میں یہی توقع کی جائے گی کہ زندگی
کا رہبر ہو - اخلاقیات اور ادب کی جدائی ختم ہو جائے گی - میرا خیال
ہے کہ عنقریب ادب دو شعبوں میں تقسیم ہو جائے گا - ایک طرف تو
اخلاقی درس ہونگے جو جدید نفسیات کی بنا پر قایم ہونگے اور حکایت'
طنز یا خیالی افسانوں کی شکل اختیار کرلیں گے - دوسری طرف ایسی
عبارت آرائی ہوگی جو موسیقی' شاعری' رنگینی اور معنی خیزی کو

انتہا پر پہنچا دے گی —

لیکن میرا ایمان ہے کہ ایک سماجی انقلاب نسبتاً بہت زیادہ اہم ہے اور اس کے بغیر ادبی انقلاب کی کوئی حقیقت نہیں ہے - ارتقا اگر رقص ہے تو انقلاب اس کی گت ہے —

جرمنی میں ادب کی تباہی

جرمنی میں ہٹلر گردی کے قیام کے بعد ادب پر جیسی تباہی آئی ہے اس کا تھوڑا سا اندازہ ذیل کے اقتباس سے ہوسکتا ہے جو امریکہ کے مشہور جریدہ " لونگ ایج " سے لیا گیا ہے :-

وقتاً فوقتاً نیم سرکاری فہرستوں کے ذریعے اعلان کیا جاتا ہے کہ کن مصنفوں اور کتابوں کا مطالعہ قابل اعتراض ہے - کتب خانوں کی تلاشی آے دن کا واقعہ ہے - ابتداھی میں 'مارکسی' یہودی اور غدار مصنفوں کے بائیکاٹ کا اعلان کردیا گیا تھا - لیکن حال ھی میں ایسے بے شمار شہرۂ آفاق مصنفوں کی کتابوں کی اشاعت ممنوع قرار دی گئی ہے جو نہ مارکسی ھیں نہ یہودی اور نہ غدار - مثلاً گی دموپاساں' بالزاک اور زولا کے نام اس فہرست میں شامل ھیں - ابھی دو تین سال پہلے نازی زولا کے بڑے مداح تھے لیکن جانے کیوں وہ غریب اب پھر معتوب ہے —

دور جدید کے تمام مشہور جرمن ادیب مثلاً ہرمان ھیس' تامس مان' الفریڈ نومان ھینریخ مان' فیوختوانگر' وازرمان' فرانز ورفیل اور ارنیسٹ تولر کی کتابیں نذر آتش کردی گئیں اور ان کا پڑھنا حرام قرار دیا گیا ہے - دنیا کے تقریباً تمام بہترین انشاپرداز مثلاً روماں رولاں آندرے ژید' جیمس جوئز' تھیوڈور ڈریزر' ڈی - ایچ - لارینس اور ایچ

بی - ویلز بھی مورد عتاب ہیں - غیر ملکی مصنفوں کی کتابوں کا داخلہ عام طور پر ممنوع ہے جس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ہٹلر جرمنی کے تمدن کی 'شدھی' کرنا چاہتا ہے - مثلاً ٹیگور اناطول فرانس' پروست' بود لوار' پریندیلو' ژولے رومیں اور ہکسلے جیسے معصوم ادیبوں کی کتابیں بھی ضبط کرلی گئی ہیں —

ہندی کے افسانہ نگار

رسالۂ وشال بھارت میں ہندی کے پرانے اور نئے افسانہ نویسوں کے متعلق ایک مبسوط مضمون شایع ہوا ہے جس کا خلاصہ یہاں درج کیا جاتا ہے :-

" ہندی میں مختصر افسانہ نگاری کی ابتدا بیسویں صدی کے آغاز سے ہوئی ہے - الہ آباد کے رسالے سرسوتی نے سب سے پہلے فسانوں کی اشاعت شروع کی - ابتدائی دور کے لکھنے والوں میں گرجا کمار گھوش کی کہانیاں اس لحاظ سے غنیمت ہیں کہ وہ صحیح معنوں میں "فسانے" کے موجودہ معیار کے قریب آجاتی ہیں —

سنہ ۱۹۱۱ میں بابو جے شنکر پرشاد کی پہلی کہانی شائع ہوئی - ہندی ادب میں پرشاد ایک خاص مرتبہ رکھتے ہیں وہ ہندی کے سب سے اچھے تمثیل نگار اور مشہور شاعر ہیں - وہ بنارس کے رہنے والے ہیں اور بہت ہی دقیق سنسکرت آمیز زبان لکھتے ہیں - ان کے افسانوں کا پس منظر قدیم ہند ہے - ان کے فن کا سب سے بڑا سہارا "تخیل" ہے - انھوں نے جس زندگی کا مشاہدہ کیا ہے وہ بنارس کے کوچوں میں محدود ہے اور اس نقص کو وہ اپنی عبارت آرائی کے پردے میں چھپانا چاہتے

ہیں - اس کا اثر ان کے افسانوں پر بھی پڑا ہے - ان کے کردار ہمیشہ ایک سانچے میں ڈھلے ہوتے ہیں ایک سے کپڑے پہنتے ہیں ، ایک سی زبان بولتے ہیں اور ایک لیک پر گھومتے رہتے ہیں - افسانہ نویس کی حیثیت سے پرشاد ہندی میں زیادہ وقعت نہیں رکھتے —

سنہ ۱۵ سے لے کر سنہ ۲۰ تک ہندی ادب جن افسانہ نگاروں سے متعارف ہوا ان میں پریم چند ، کوشک اور سدرشن خاص طور پر قابل ذکر ہیں —

کوشک کی کہانیاں کسی نہ کسی مقصد کو سامنے رکھہ کر لکھی جاتی ہیں - ان کا تمام لطف گفتگو میں مضمر ہے - وہ اکثر بات چیت سے شروع ہوکر بات چیت پر ہی ختم ہوتی ہیں - کوشک معمولی سے معمولی واقعے کو بھی افسانہ بنا سکتے ہیں البتہ بے جا طوالت ان کا خاص نقص ہے —

پریم چند نے اس زمانے کے ہندی ادب کو بہت متاثر کیا ہے اور ایک عرصے تک یہ اثر باقی رہے گا - وہ موجودہ دور کے سب سے زیادہ مقبول مصنف ہیں - پریم چند بے زبان عوام کے ترجمان ہیں - کسان کے جذبات ، حالات اور خیالات کی اتنی صحیح تصویر ہندوستان کے کسی مصنف نے اب تک نہیں پیش کی —

پریم چند نے تقریباً تین سو کہانیاں اور ایک درجن ناول لکھے ہوں گے لیکن یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کے ناول اتنے کامیاب نہیں ہیں جتنے ان کے افسانے - ان کے فن میں نشیب و فراز بہت ہے جس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ وہ ہر روز کچھہ نہ کچھہ لکھنے کو اپنا فرض منصبی سمجھتے ہیں - یہی وجہ ہے کہ ان کے بعض افسانے اگر آرٹ کی بلندیوں کی خبر لاتے ہیں تو بعض بہت ادنیٰ درجے کے بھی ہیں - ان کے فن کا ارتقا ایک خاص نہج پر ہوا ہے جس سے باہر قدم رکھتے ہی وہ ڈگمگا جاتے ہیں - کسانوں کی زندگی کے

بیان میں وہ جتنے کامیاب ہوئے ہیں نفس انسانی کو سمجھنے میں وہ اتنے ہی ناکام رہے —

ہندستان کے تین سب سے باکمال افسانہ نویس ٹیگور - شرت چندر اور پریم چند - زندگی کے تین مختلف شعبوں کے مالک ہیں - ٹیگور نفس کی ایک ایک باریکی کو بے نقاب کرسکتا ہے - شرت چندر 'گھر' کے ہر پہلو سے آشنا ہے اور اس میدان میں اس کا کوئی ہم سر نہیں - اور جب انسان اپنی شخصیت کو کھو کر گھر سے باہر قدم رکھتا اور بھیڑ میں گھل مل جاتا ہے تو پریم چند کا دائرہ شروع ہوتا ہے —

سدرشن اور پریم چند تقریباً ایک ہی طرز کے آرٹسٹ ہیں - عوام کی زندگی سے سدرشن بھی ترغیب حاصل کرتا ہے - بات کہنے کا اسے بڑا اچھا سلیقہ ہے - معمولی سی بات کو وہ بڑے مزے سے ادا کرتا ہے اور اسی وجہ سے اس کے افسانوں میں قصہ گوئی کا لطف بہرحال باقی رہتا ہے - لیکن پریم چند کا فن اب تک مائل بہ ترقی ہے اور سدرشن ایک عرصے سے خاموش ہوگیا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے آرٹ کا چشمہ بے آب ہوگیا ہے —

نئے افسانہ نگاروں میں جینیندر کمار کو ایک مخصوص مرتبہ حاصل ہے - ہندی افسانہ نگاری میں انہوں نے ایک طرز نو کی بنا ڈالی ہے - غالباً وہ سب سے پہلے فسانہ نویس ہیں جنھوں نے "فن برائے فن" کے نظریے پر سختی سے عمل کیا ہے - ابھی ان کے آرٹ میں ترقی کی بڑی گنجائش ہے - مصیبت یہ ہے کہ وہ بھی روپیوں کے لیے لکھنے پر مجبور ہیں - یہی وجہ ہے کہ انہیں خواہ مخواہ کچھہ نہ کچھہ لکھنا پڑتا ہے اور یہ روش ان کی طبیعت میں عدم اعتمادی اور خود پسندی پیدا کررہی ہے —

وہ اپنے قصوں کو بہت طول دے کر کرداروں میں رنگ آمیزی کرنے لگتے ھیں - وہ حساس نہیں ھیں - سوچ سکتے ھیں محسوس نہیں کرسکتے - یہی وجہ ھے کہ ان کی تحریر میں ھمدردی اور نزاکت کی بہت کمی ھے اور ان کے حالیہ افسانوں میں دلچسپی کا التزام بہت کم ھوتا جاتا ھے —

دوسرا قابل ذکر نوجوان افسانہ نگار واتسیاین ھے - اس میں احساس' طباعی اور ذھانت موجود ھے اور سماج کے مظالم کے خلاف اس کے دل میں بغاوت کی آگ بھری ھوئی ھے - اس کے افسانوں کا پس منظر قربانی مصیبت اور ایثار ھے - لیکن اس میں ایک طرح کی 'خلوت پسندی' ھے جو اس کی تحریروں کو مقبول نہیں ھونے دیتی —

اختر حسین رائے پوری کی ذات سے ھندی ادب کی خاص توقعات وابستہ ھیں - وہ ایک خاص طرز بیان کا موجد ھے - کوتاہ قلمی اس کا سب سے بڑا نقص ھے - لیکن اس نے جتنے بھی افسانے لکھے ھیں' ان میں ایک انقلابی شخصیت موجود ھے - یہ افسانے ایک ایسی طبیعت کے شاھد ھیں جو موجودہ نظام زندگی سے سخت نالاں اور ایک نئی تخلیق کے لیے مضطرب ھیں - یہ امر خاص طور پر قابل اطمینان ھے کہ وہ حسب دلخواہ ماحول پیدا کر لیتا ھے اور اپنے زور قلم سے ناظر کو اپنی طرف متوجہ کرسکتا ھے - اختر کا آرٹ ابھی ابتدائی منازل سے گزر رھا ھے - اپنے انقلابی رجحان سے وہ اپنی تحریروں کو مفید اور وقتی تو بنا لیتا ھے لیکن یہ چیز اس کے آرٹ کے لیے مضر ثابت ھوگی —

بعض خواتین نے بھی ھندی میں کئی اچھے افسانے لکھے ھیں۔ ان میں شری متی کملا دیوی چودھری کا مستقبل سب سے زیادہ روشن ھے - ان کے "سادھنا کا جلون" نامی افسانے کا شمار ھندی زبان کے

بہترین افسانوں میں ہوسکتا ہے —

ہندی کے نئے مصنفوں نے نئے اسلوب اور جدید موضوعات کے باب کھول دیے ہیں اور بلامبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ ملک میں ادبی انقلاب کے بانی قرار پائیں گے —

زمانۂ حال کی مرھٹی شاعری

از پربھاکر ماچوے

مرھٹی شاعری کا مطالعہ کرتے وقت دو تین چیزوں کو ملحوظ رکھنا چاھیے - مرھٹوں کی قومی زندگی کی نوعیت دوسرے ھندوؤں سے بڑی حد تک مختلف رھی ہے - یہی وجہ ہے کہ مرھٹی شاعری میں رزم کا پہلو بہت واضح ہے ' زبان و بیان میں عام فہمی کا لحاظ رکھا گیا ہے اور ھندی یا بنگلہ کی طرح عشق اور تصوف کے موضوع زیادہ مقبول نہیں ھیں - اسکا میدان تنگ ہے اور وہ بڑی حد تک مقامی رنگ لیے ہوئے ہے - لیکن اس مضمون کا مقصد مرھٹی شاعری کی خصوصیات کا تذکرہ نہیں ہے بلکہ یہاں ہم مرھٹی زبان کے ان پانچ شاعروں کا تعارف کراتے ھیں جنھوں نے زمانۂ حال کی شاعری کی رو بدل دی ہے —

(۱) بھاسکر رام چند تامبے گوالیر کے رھنے والے ھیں - مرھٹی میں ان کا وھی مرتبہ ہے جو بنگالی میں ٹیگور کا - موسیقی ' حلاوت اور نزاکت ان کے کلام میں بدرجۂ اتم موجود ہے - 'محبت ' اور 'موت' یہ دو ان کے خاص موضوع ھیں - مرھٹی جیسی کرخت پہاڑی زبان میں ان کے متین اور شیریں گیتوں کا ترنم ' چٹانوں کے نیچے بہنے والے

سبک وسیمیں چشمے کی یاد دلاتا ہے - انھوں نے زیادہ تر چھوٹے چھوٹے گیت لکھے ھیں جن کا مجموعہ دو جلدوں میں " پریتی چاواس" (بوئے محبت) اور " جیون سنگیت " (نغمۂ حیات) کے نام سے شایع ہوا ہے - طوالت کے خوف سے ان کے کلام کا نمونہ پیش نہیں کیا جا سکتا ، صرف ایک بند پر اکتفا کرتا ھوں :—

سلسار ستاری ور تارا تو میٹھی مدن واجو نارا
مدھر گلابی راج تھرتھرے اکال یہ جلو اُشامد بھرے
وایو نبج چلتچلتا وسرے پران بسرلا نبج کارا !

" وقت کے بربط کے تار سراسیمہ ھیں - جب خدائے محبت نغمہ زن ھوتا ہے تو فقط میں اور تورہ جاتے ھیں - شفق تھرتھرانے لگتی ہے ' صبا راہ بھول جاتی ہے اور جان عزیز کی نبض چھوٹنے لگتی ہے " —

(۲) چلدرشیکھر بڑودا کے ملک الشعرا اور قدیم طرز کے علم بردار ھیں - ان کے کلام کا بیشتر حصہ " کانڑ گیتوں " پر مشتمل ہے جس میں دیہات کی زندگی کا بیان دیہاتی کرداروں کی زبان میں کیا گیا ہے - چلدر شیکھر محاکات اور منظر کشی کا استاد ہے - اسے الفاظ اور بحر کے انتخاب میں بڑا ملکہ حاصل ہے - " چلدرکا " اس کی بہترین نظموں کا انتخاب ہے - ان میں بھی " کوتارتی " نامی نظم کا بڑا شہرہ ہے - اس میں شاعری کی دیوی سے خطاب ہے اور یہ گرے کی Ode on the Progress of Poesy کے قسم کی نظم ہے —

(۳) 'بی' (Bee) گلدکری کیشوسلت کا تخلص ہے - یہ حضرت بڑے خلوت نشیں اور کوتاہ قلم ھیں - ساری زندگی میں بہ مشکل تمام تیس

چالیس نظمیں لکھی ھیں جن کا مجموعہ "پھلاچیں اونجل" (پھولوں کا تحفہ) کے نام سے حال ھی میں شایع ھوا ھے - بے نیازی کا یہ حال ھے کہ جب ناشر نے حالات معلوم کرنے کے لیے بارھا تقاضے کیے تو جواب میں ایک دوھا لکھہ بھیجا جس کا مطلب یہ ھے : "اے صاحب ذوق ، نام جاننے کی ضد کیوں کرتا ھے - نام کا جادو تو عامیوں پر چلتا ھے" —

'بی' مرھٹی شاعری کا سب سے بڑا آرتسٹ ھے - بہ ایں ھمہ وہ حیات پرور شاعر ھے اور دنیا کو آزادی اور بیداری کا پیغام سناتا ھے - سوھنی اور دیس کے سروں میں جو سوز ھوتا ھے ، اس کی موسیقی اسی سوز میں ڈوبی ھوئی ھے - اس کی قومی نظمیں خاص و عام کی زبان پر ھیں اور ان میں سے بعض مثلاً "ترنگا" "انقلابی" وغیرہ کو قومی گیتوں کا رتبہ مل گیا ھے —

(۴) مادھو جولین کولھاپور کے ایک کالج میں فارسی کے پروفیسر ھیں - ان کی شاعری بیرن کی مستی اور حافظ شیراز کے وجدان سے متاثر ھے - انھوں نے سب سے پہلے مرھٹی زبان میں 'غزل' لکھنے کا چلن ڈالا ھے - ان غزلوں کا ایک دیوان شایع ھوچکا ھے جو اپنی ندرت کی وجہ سے بہت مقبول ھے - فارسی خیالات کے علاوہ اس نے بکثرت فارسی الفاظ مرھٹی میں رائج کر دیے ھیں - یہی نہیں بلکہ اردو اور فارسی کی بحروں کو بھی اس نے رواج دیا ھے اور ان غزلوں نے مرھٹی شاعری میں ایک نئے باب کا اضافہ کردیا ھے - یہ کہا جاسکتا ھے کہ مرھٹی شاعری کے نئے دور کا بانی 'بی' ھے لیکن اس کا معمار مادھو جولین ھے —

(۵) یشونت بھی ایک نوجوان شاعر ھے اور اس کے سینے میں آگ بھری

ہوئی ہے۔ گو اس کا رجحان رومان کی طرف ہے اور وہ آداب فن کی مہارت کو بہت اہمیت دیتا ہے، تاہم اس کی زیادہ تر نظمیں سماجی پابندیوں کے خلاف بغاوت کی پیامی ہیں۔ دیہاتیوں کے لیے اس نے جو سیدھے سادے قومی گیت لکھے ہیں وہ بھی اپنی جگہ پر انتخاب ہیں۔ مگر اس کا شاہکار "قید خانہ" نامی طویل نظم ہے جس میں قیدیوں کی نفسیات کا بیان کمال کو پہنچ گیا ہے۔ یشونت اپنے ہم عصروں میں سب سے زیادہ آتش بیان شاعر ہے —

کلاسکس کی فہرست

رسالۂ اردو کی پچھلی اشاعت میں ان اعلیٰ تصانیف کی فہرست شایع کی گئی تھی جنھیں اردو میں منتقل کرنے کی اسکیم انجمن ترقیٔ اردو تیار کر رہی ہے۔ اس فہرست میں حسب ذیل کتابیں گھٹا بڑھا دی گئی ہیں:

جو کتابیں نکال دی گئی ہیں :—

۱ - Creative Evolution by Bergson

(دارالترجمہ کی طرف سے یہ کتاب شایع ہورہی ہے) —

۲ - Phedre by Racine

۳ - Cid by Cornaille

(گو قدیم فرانسیسی ادب میں ان ڈراموں کا درجہ بہت بلند ہے لیکن وہ اساطیر سے اس قدر مرکب ہیں کہ ہمارے لیے ان سے لطف اندوز ہونا دشوار ہے) —

۴ - Among Strangers by Gorky

۵ - Three of them by Gorky

(گورکی کی ایک کتاب My childhood اس کے آرٹ کی صحیح ترجمانی کے لیے کافی ہے) —

جو کتابیں بڑھا دی گئی ہیں :-

German :

۱ - Gew Suss by Feuchtwanger

Russian :

۲ - Taras Bulba by Gogol

۳ - Oblomov by Goncharev

French :

۴ - Pierre Gierdot by Balzac

افکار و واقعات

آل انڈیا اُردو کانفرنس

" آل انڈیا اردو کانفرنس جو علی گڑھ میں منعقد ہوئی تھی اس کی مفصل روئداد علحدہ طبع کرکے شایع کی جائے گی - یہاں اس کی مختصر کیفیت جو کانفرنس گزٹ علی گڑھ نے بڑے سلیقے سے شایع کی ہے نقل کی جاتی ہے " -
(اڈیٹر)

کانفرنس گزٹ کے پچھلے پرچے میں ہم نے اُردو کانفرنس کے اجلاس کی اطلاع شائع کی تھی جو علی گڑھ میں منعقد ہونے والا تھا ' چنانچہ یہ اجلاس ۲۴ و ۲۵ - اکتوبر سنہ ۱۹۳۶ع کی سہ پہر کو زیر صدارت جناب راجا صاحب محمود آباد بالقابہ منعقد ہوا ' -

اس جلسۂ شوریٰ یا اُردو کانفرنس کا دعوت نامہ مولوی عبدالحق صاحب بی اے سکرٹری انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن کی طرف سے جاری ہوا تھا ' اور علی گڑھ میں صاحب موصوف کی طرف سے مولوی رشید احمد صاحب صدیقی ایم اے پروفیسر مسلم یونیورسٹی جلسے کے اہتمام و انتظام کے لیے مامور تھے ' -

دعوت نامے میں یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ

" یہ کانفرنس کوئی عام مجمع نہ ہوگا بلکہ صرف ایسے منتخب اصحاب کو زحمت دی گئی ہے جو زبان کے معاملے میں خاص

بصیرت اور تجربہ رکھتے ہیں اور اپنے اپنے صوبے کے نمایندے
ہوسکتے ہیں تاکہ اس تجویز کے ہر پہلو پر اطمینان کے ساتھ
غور و بحث ہوسکے " -

اسی بنا پر سکرٹری صاحب " انجمن ترقی اُردو " نے اس کانفرنس کے متعلق کوئی عام اعلان نہیں کیا تھا ' چنانچہ مختلف مقامات سے صرف وہی اصحاب شریک ہوئے جن کو شرکت کی دعوت دی گئی تھی -

مہمانوں کے قیام کا انتظام " اولڈبوائزلاج ' اور " سلطان جہاں منزل" کی عمارت میں کیا گیا تھا ' نیز صدر دفتر کانفرنس سلطان جہاں منزل کے احاطے میں متعدد خیمے بھی مہمانوں کے لیے نصب کیے گئے تھے ' آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا پورا عملہ اجلاس کے اہتمام میں مصروف و منہمک تھا ' اجلاس کے لیے کانفرنس کا خوبصورت و نفیس ہال تجویز کیا گیا تھا ' جس کا شمار علی گڑھ کی بہترین عمارتوں میں سے ہے ' سید الطاف علی صاحب بی اے ہیڈ اسسٹنٹ دفتر کانفرنس نے اجلاس سے ایک شب پہلے یہ ہال نہایت عمدہ طریقے سے مرتب کرادیا تھا —

صدر اجلاس جناب راجا صاحب محمودآباد بالقابہ رات ہی کو تشریف لے آئے اور جناب نواب صاحب چھتاری کی کوٹھی پر قیام فرمایا ' ۳ بجے سہ پہر کے بعد راجا صاحب جلسہ گاہ میں تشریف لائے دروازے پر معزز اصحاب نے استقبال کیا - اس کے بعد ڈاکٹر ضیاءالدین احمد صاحب پی ' ایچ ' ڈی ' ایم ' ایل ' اے وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی نے جناب راجا صاحب کا خیر مقدم کرتے ہوئے فرمایا کہ میں علیل ہوں اور میرے معالج کی سخت تاکید ہے کہ میں باہر نہ نکلوں اور اس قسم کے جلسوں میں شرکت نہ کروں ' مگر اس موقع کی اہمیت

کی وجہ سے میری طبیعت نے یہ گوارا نہیں کیا کہ اس جلسے میں شرکت نہ کروں ' اس لیے میں نے اپنے معالج کی ہدایات کی خلاف ورزی کی اور یہاں حاضر ہوا تاکہ آپ کو یقین دلاؤں کہ نہ صرف میں بلکہ یونیورسٹی کے تمام اساتذہ اور عہدہ دار اس تحریک میں شریک ہیں اور اس سے پوری دلچسپی رکھتے ہیں -

اس موقع کے لیے بحیثیت صدر استقبالیہ میں نے جو خطبہ لکھا تھا اس کے پڑھنے سے معذور ہوں ' اب میں نواب صدر یار جنگ بہادر سے درخواست کروں گا کہ وہ وائس چانسلر کے قائم مقام ہوکر یہ خطبہ آپ کو سنائیں -

اس مختصر تقریر کے بعد ڈاکٹر صاحب اپنی علالت اور ناتوانی کی وجہ سے تشریف لے گئے ' اور نواب صدر یار جنگ بہادر نے ممدوح کا مختصر و پر مغز خطبہ حاضرین کو پڑھ کر سنایا ' خطبے کے آغاز میں ڈاکٹر صاحب نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی طرف سے جناب راجا صاحب اور جملہ مہمانوں کا خیر مقدم کیا تھا اس کے بعد یہ بتایا تھا کہ کسی درس گاہ کی امتیازی خصوصیت یہ ہوسکتی ہے کہ وہ تنگ نظری سے پاک ہو ' پھر اسی سلسلے میں آپ نے اس امر پر اظہار اطمینان کیا کہ ہم سب اردو کی ترقی کے لیے جمع ہوئے ہیں ' جس نے ہندو مسلمانوں کی صدیوں کی مشترکہ کوشش سے ترقی کی ہے - زبان قوم کی ذہنی ترقی کا خزانہ ہے اور اس کی حفاظت ہر سچے ہندوستانی کا فرض ہے آپ نے اس پر اظہار افسوس کیا کہ لوگ اس متاع قومی کو برباد کرنا چاہتے ہیں —

اس کے بعد آپ نے اردو کے متعلق سر سید کے کارناموں کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ انھوں نے سادہ نثر کی بنیاد رکھی اور علی گڑھ میں مرحوم

کا سب سے پہلا کارنامہ "سائنٹفک سوسائٹی" کا قائم کرنا ہے' جس کا مقصد یہ تھا کہ مختلف علوم کی کتابیں اُردو میں ترجمہ کی جائیں' آپ نے بتایا کہ اس کام میں سرسید کے دوست راجا جےکسن داس بھی شریک تھے' آپ نے صراحت کے ساتھہ یہ بھی بتایا کہ اردو کی ترقی کے لیے کوشش کرنا کوئی فرقہ وارانہ تحریک نہیں ہے' اس کو تمام ملک میں رائج ہونا چاہیے' آخر میں آپ نے فرمایا کہ راجا صاحب محمود آباد ایک بڑے باپ کے بیٹے ہیں اور اس تحریک میں آپ کی شرکت ایک نیک فال ہے —

خطبے کے بعد جناب راجا صاحب صدارت کی کرسی پر تشریف لائے ور س منصب جلیل کے عطا کیے جانے پر شکریہ ادا کیا' اس کے بعد صدارت کی طرف سے مشہور افسانہ نگار منشی پریم چند اور مولوی نورالحسن صاحب نیر کی رحلت پر اظہار و ملال کا رزولیوشن پیش ہوا جو حاضرین نے احتراماً استادہ ہوکر پاس کیا —

اس کے بعد جناب صدر نے اپنا مختصر خطبہ جو سلیس و شستہ اردو میں تھا بلند آواز اور خطیبانہ انداز سے پڑھ کر سنایا جو حاضرین نے پوری توجہ سے سنا اور خاص خاص فقروں پر صدائے تحسین سے 'پنی پسندیدگی کا اظہار کیا —

راجا صاحب نے خطبے کے آغاز میں اس امر پر اظہار مسرت کیا کہ اس جلسے میں ہر مذہب و ملت کے اصحاب دوش بدوش موجود ہیں اس یک جہتی کی جس قدر قدر کی جائے وہ کم ہے' اس کے بعد آپ نے یہ فرمایا کہ اردو کا ادب ہندوستان کی مختلف قوموں کی متحدہ کوشش کا ثمرہ ہے چنانچہ آپ نے اس سلسلے میں مثلاً پنڈت رتن ناتھہ سرشار اور جناب کیفی دہلوی وغیرہ کی ان خدمات کی طرف اشارہ کیا جو

ان صاحبوں نے اردو ادب کے متعلق انجام دی ہیں' آپ نے اسی سلسلے میں یہ بتایا کہ کسی قوم کی ترقی کا اندازہ اس کے ادب کی خوبی و مقدار سے بھی کیا جاتا ہے مگر اردو کی کس مپرسی کی یہ حالت ہے کہ اگرچہ اس زبان کی خدمت کرنے والی ایسی ہستیاں ہیں کہ دوسری زبان ان پر فخر و ناز کرتی مگر ہمارے یہاں یہ حالت ہے کہ میر و سودا کی تصنیفات تک نہایت غلط اور بری چھپی ہیں —

اس کے بعد آپ نے زبان کے متعلق سر سید کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ انہوں نے اردو کے پودے کو سینچ سینچ کر بڑھایا اور شاداب کیا' پھر اسی سلسلے میں آپ نے انجمن ترقیء اُردو اور اس کے قابل سکریٹری مولوی عبدالحق صاحب کی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ انجمن نے پرانی کتابیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر حاصل کیں اور چھاپیں اس کے علاوہ انجمن دو نہایت عمدہ رسالے شایع کرتی ہے لیکن باوجود ان قابل قدر کارناموں کے ابھی یہ ضرورت ہے کہ عام دلچسپی کی کتابیں' چھپائی کی خوبصورتی اور صحت و صفائی کے ساتھ چھاپی جائیں' جس کے لیے ایک مستقل چھاپہ خانے اور اشاعت خانے کی ضرورت ہے —

ایک زمانہ تھا کہ ان سنگی مطبعوں نے کام دیا اور خوب کام دیا مگر اب ایسے خوش نویس نہیں ہیں روز بروز فن خطاطی کا تنزل ہوتا جاتا ہے' آج کل کی خطاطی کے نمونے بعض دفعہ دہلی اور میونسپلٹی کے اعلانوں میں نظر آتے ہیں' آرٹ اسکولوں کو اس طرف توجہ کرنی چاہیے کہ یہ فن زندہ رہے نستعلیق ٹائپ ڈھالنے کی جو کوششیں ہوئیں وہ ناکامیاب رہیں' ٹائپ کی ضرورت سے حرفوں کی شکلیں کم و بیش بدلنی پڑی ہیں جس کو عام لوگ پسند نہیں کرتے' نستعلیق ٹائپ بنانے کے لیے

اچھے خطاط حاصل کیے جائیں اور کار آمد ٹائپ بنایا جائے' اس کے بعد وسیع پیمانے پر اشاعت خانہ قائم کرنے کی کوشش کی جائے' یہ سب کام محنت اور روپیہ چاہتے ہیں' ہماری قوم میں نہ محنت کرنے والوں کی کمی ہے اور نہ روپے کی' صرف اتفاق و اتحاد اور مستقل مزاجی کی ضرورت ہے —

اس کے بعد آپ نے پنجاب کا ذکر کیا کہ وہ کس قدر خدمت اردو زبان کی کر رہا ہے' اردو کے جتنے اخبار اور رسالے پنجاب سے شایع ہوتے ہیں دوسرے صوبوں سے شایع نہیں ہوتے۔

پنجاب کی خدمات کا تذکرہ کرنے کے بعد آپ نے یہ بتایا کہ اردو ہندوستان کے مختلف صوبوں میں رائج ہے اور اسے کم از کم ۱۴ کروڑ آدمی بولتے ہیں' اس کو اور زیادہ وسعت دینے کی ضرورت ہے لیکن بعض مصنف سلاست عبارت کے معنی غلط سمجھے ہوئے ہیں وہ کتابوں اور رسالوں میں زبان میں اس قدر تکلف برتا کرتے ہیں کہ لفظوں کی زیادتی اور معنوں کی کمی رہ جاتی ہے' اس وجہ سے بچے اور عورتیں کم لطف اٹھا سکتے ہیں' اس لیے ضرورت ہے کہ سہل اردو کے نمونے شایع کیے جائیں —

آخر میں جناب صدر نے ہز اگزالٹیڈ ہائنس اعلیٰ حضرت نظام کا شکریہ ادا کیا کہ حضور ممدوح نے جامعۂ عثمانیہ قائم کی جو اردو زبان میں ہر قسم کے علوم کی تعلیم دیتی ہے اور دارالترجمہ قائم کیا جہاں جملہ علوم و فنون کی کتابیں اردو میں ترجمہ کی جاتی ہیں' یہ ایسا احسان ہے جس کے شکریے سے ہم عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔

خطبے کے بعد مولوی عبدالحق صاحب سکرٹری انجمن ترقی اردو نے

انجمن کے متعلق ایک مختصر رپوٹ پڑھی جس میں سب سے پہلے راجا صاحب اور حاضرین کا ان کی تشریف آووی پر شکریہ ادا کیا، آپ نے فرمایا کہ اگر الیکشن کے سودے کی گرم بازاری نہ ہوتی تو اور بھی ایسی صورتیں یہاں نظر آتیں جن کے ہم متوقع تھے' اس کے بعد آپ نے اس کانفرنس کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ابھی یہ کانفرنس ہونے بھی نہیں پائی تھی کہ لوگوں نے طرح طرح کی بدگمانیاں اس کے متعلق کیں' حالانکہ ہمارا کسی سے لڑائی جھگڑا نہیں ہے' اور نہ ہم کسی سے جھگڑا کرنا چاہتے ہیں' انجمن ترقی اردو کسی خاص فرقے کی انجمن نہیں ہے' مسلمان' ہندو' عیسائی' سب اس میں شریک ہوسکتے ہیں' ہر صوبے کی زبان کو ترقی کا حق حاصل ہے لیکن کسی کو یہ حق نہیں کہ دوسری زبان کو مضرت پہنچانے کی کوشش کرے' زبان کا کوئی مذہب نہیں ہوتا جو اسے بولتا ہے اسی کی زبان ہے' اردو یا ہندوستانی کا خمیر صلح کل کے جامن سے بنا ہے۔

اس کے بعد آپ نے انجمن کی کارگزاری کا ذکر کیا کہ اس نے کس قدر انقلاب پیدا کیا اور اردو کی کس قدر مفید و نایاب کتابیں تالیف یا ترجمہ کرائیں' جن کی تعداد ۹۵ تک پہنچ چکی ہے' اس کے علاوہ اردو انگریزی لغت کی ترتیب و تدوین کا کام بھی انجمن کر رہی ہے لیکن ملک کی بڑھتی ہوئی ضروریات کے لیے یہ کام کافی نہیں علم و حکمت اور ادب کی دنیا بدل چکی ہے' اب عام معلومات کی کتابیں کثرت سے شائع کرنے کی ضرورت ہے اس کے علاوہ اشاعت زبان کا کام بھی کرنا ہے'۔

اسی سلسلے میں آپ نے یہ ضرورت ظاہر کی کہ تمام علمی و ادبی اداروں کو ایک سلسلے میں منسلک ہونا چاہیے۔ آپ نے بتایا کہ اردو کی ترقی و اشاعت کا کام کرنے کے لیے معقول و کافی سرمایے کی ضرورت ہے'

اب قال مقول کا وقت نہیں بہت کچھ وقت گزر گیا ہے یا تو ہمیں کام کرنا چاہیے یا ہمیشہ کے لیے دست بردار ہونا چاہیے، اردو زبان کا قصور نہیں ہے اب تک ہم نے غفلت برتی ہے؛ اگر آیندہ بھی یہی حالت رہی تو زبان کا باقی رہنا بھی مشکل ہے —

اس کے بعد آپ نے اس کانفرنس کا مقصد بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ آج کل ہماری مجلسیں بزم مشاعرہ ہو کر رہ جاتی ہیں، قصیدہ خوانی ہوتی ہے - بھاری بھر کم رزولیوشن پیش کیے جاتے ہیں، مہمان میزبانوں کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور میزبان، مہمانوں کا، حسب ضرورت ہاتھ اٹھاکر تائید کی جاتی ہے، ہم لوگ بالطبع ہنگامہ پسند واقع ہوئے ہیں، ہم بہت سے رزولیوشن سن چکے ہیں، اب نہ طلاقت لسانی کی ضرورت ہے نہ وقت شماری کی، ایک آدھ کام کی بات بھی ہونی چاہیے، اب یہ معمولی مسئلہ نہیں رہا بلکہ روز بروز پیچیدہ ہوتا جاتا ہے، اس لیے اسے سرسری نہیں سمجھنا چاہیے، اس پر غور کرنا چاہیے اور یہ سمجھ کر غور کرنا چاہیے کہ اس پر عمل کرنا ہے —

آپ نے سلسلۂ تقریر میں یہ بھی ظاہر کیا کہ جو تجویزیں یہاں پیش ہوں گی وہ سب متفقہ ہوں گی اگر کسی تجویز پر سب متفق نہیں ہوں گے تو یہ سمجھا جائے گا کہ وہ غیر ضروری ہے، زبان کا بنانا بگاڑنا ہمارے ہاتھ میں ہے تجویزیں پیش کرنا آسان ہے اور عمل مشکل، جب کوئی تجویز منظور ہو تو اس کے متعلق جد و جہد میں دریغ نہ کرنا چاہیے، —

اب یہ بات کہ کیا ہو اور کیونکر ہو اس کا فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے -

رپورٹ ختم کرنے کے بعد مولوی عبدالحق صاحب نے ان اصحاب کے چند پیغامات سنائے جو کانفرنس میں شریک نہیں ہوسکے، مثلاً ہز ایکسلینسی

مہاراجا کشن پرشاد صدر اعظم باب حکومت کا پیغام جس میں آپ نے عدم شرکت پر افسوس ظاہر کرتے ہوئے یہ لکھا تھا کہ اردو زبان ہندو مسلم اتحاد کی یادگار ہے جس قدر اس کو فروغ ہوگا اتحاد بڑھے گا —

اسی طرح سرمحمد اقبال، سر تیج بہادر سپرو اور سندر لال ورما وغیرہ کے پیغامات سنائے گئے اس کے بعد مولوی عبدالحق صاحب نے حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ یہ کانفرنس خالص کام کی ہے اس میں عملی تجویزیں پیش کی جائیں گی، بڑے مجمع میں کام کم ہوتا ہے اس لیے یہ طے کیا گیا ہے کہ ان تجاویز پر غور کرنے کے لیے مختلف کمیٹیاں بنائی جائیں، اور ان میں ایسے لوگ شریک ہوں جن کو اُردو سے خاص دلچسپی اور اس کام کے متعلق تجربہ ہے، اس مقصد کے لیے کل مخصوص اصحاب کا ایک جلسہ ساڑھے آٹھ بجے سے ایک بجے تک ہوگا جس میں مختلف کمیٹیاں بنائی جائیں گی، مثلاً ایک کمیٹی "اصلاح زبان" کے متعلق ہوگی، ایک "ادبی کمیٹی" ہوگی، ایک کمیٹی طبع و اشاعت کے متعلق مشورہ دینے کی ہوگی لہذا ہمیں اجازت دی جائے کہ کل ہم ان کمیٹیوں کا انعقاد ایک مقام پر کریں اور پورے طور پر بحث و غور کرنے کے بعد ان کمیٹیوں کے واسطے نام تجویز کریں، اس کے بعد کل کے اجلاس میں ان کمیٹیوں کے تقرر کی کیفیت، تجاویز، اور ان کے ممبروں کے نام آپ کے سامنے منظوری کے لیے پیش کیے جائیں گے، اس کے بعد مولوی عبدالحق صاحب نے مختلف کمیٹیوں کی ممبری کے لیے چند ناموں کا اعلان کیا جو سرسری طور پر تجویز کر لیے گئے تھے، اور اُن سے درخواست کی کہ وہ کل ساڑھے آٹھ بجے صبح مشورے کے لیے اولڈبوائز لاج میں جمع ہوجائیں —

اس کارروائی کے بعد سب کے آخر میں جناب راجا صاحب محمودآباد

نے یہ اعلان کیا کہ میں کل ۲۵ اکتوبر کے اجلاس کے لیے نواب مہدی یار جنگ بہادر صدرالمہام سیاسیات حیدرآباد دکن کا نام تجویز کرتا ہوں اس اعلان کے بعد اجلاس برخاست ہوا —

اجلاس کے بعد سب مہمان مع راجا صاحب محمود آباد اس پر تکلف ٹی پارٹی میں شریک ہوئے جو سلطان جہاں منزل کے "چمن" میں انجمن اردوئے معلیٰ (مسلم یونیورسٹی) کی طرف سے دی گئی تھی، پارٹی کا انتظام نہایت خوبی و خوش اسلوبی اور سلیقے سے کیا گیا تھا، اکل و شرب کا سلسلہ نماز مغرب کے قریب تک جاری رہا - اس کے بعد اکثر مہمانوں نے کالج کی مسجد میں نماز مغرب ادا کی اور نماز کے بعد "حامدیونین ہال" میں تشریف لے گئے، جہاں پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی نے اردو زبان کے متعلق اپنا ایک پر مغز مقالہ پڑھا جس کا عنوان تھا "اردو ہماری زبان" یہ مقالہ دلچسپی سے سنا گیا، اس کے بعد سر سید ہال کی طرف سے اسٹریچی ہال میں ڈنر دیا گیا، جس میں جملہ مہمان شریک تھے، ڈنر کے بعد ۲۴ - اکتوبر کا پروگرام ختم ہوا، —

اردو کانفرنس کا اجلاس نمبر ۲

کانفرنس گزٹ کے پچھلے پرچے میں ہم اُردو کانفرنس کے پہلے روز کے حالات شائع کرچکے ہیں، دوسرے روز ۹ بجے صبح کو مخصوص اصحاب کا ایک جلسہ "اولڈ بوائز لاج" میں منعقد ہوا تاکہ جو مختلف کمیٹیاں تجویز کی گئی ہیں اُن کے لیے ممبروں کا انتخاب کیا جائے نیز دوسرے ضروری امور طے کیے جائیں، یہ جلسہ زیر صدارت ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی منعقد ہوا، اور کافی بحث کے بعد مختلف کمیٹیاں اور ان کے

ممبروں کے نام تجویز کیے گئے —

یہ کمیٹیاں حسب ذیل تھیں (۱) اصلاح زبان کی کمیٹی (۲) ادبی کمیٹی (۳) اشاعت خانہ کی کمیٹی '

اصلاح زبان کی کمیٹی میں حسب ذیل اصحاب بطور ممبر منتخب کیے گئے۔

۱ - مولانا سید سلیمان صاحب ندوی '

۲ - مولوی رشید احمد صاحب صدیقی '

۳ - مولوی عبدالماجد صاحب دریا بادی '

۴ - ڈاکٹر عابد حسین صاحب (جامعہ ملیہ) '

۵ - قاضی عبدالودود صاحب بیرسٹر (بہار) '

۶ - پنڈت منوہر لال زتشی '

۷ - پنڈت دتاتریہ کیفی '

۸ - سید مسعود حسن صاحب رضوی '

۹ - میاں بشیر احمد صاحب (ہمایوں لاہور) '

۱۰- ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی '

۱۱- ڈاکٹر محی الدین صاحب قادری '

کمیٹی کو یہ بھی اختیار دیا گیا کہ وہ چار ناموں کا اور اضافہ کرسکتی ہے '

اصلاحی کمیٹی کا یہ مقصد قرار دیا گیا کہ وہ زبان کے اختلافی مسائل کے متعلق ملک کے سربرآوردہ ادیبوں اور شاعروں کی رائیں حاصل کرکے اُن رایوں کی بنا پر کوئی فیصلہ صادر کرے ' اور اُن کی ترویج و اشاعت کی کوشش کرے ' نیز یہ کہ اُن تمام تجویزوں پر غور کرے اور اُن کا فیصلہ صادر کرے جو اُردو رسم الخط سے تعلق رکھتی ہوں ' اور

اُردو کے طریقۂ طباعت پر بھی غور کرے ' یعنی رسم الخط کی اصلاح اور طباعت کی سہولت کے وسائل بہم پہنچائے '

اس کے بعد ادبی کمیٹی کے لیے حسب ذیل اصحاب کے نام ممبری کے لیے تجویز کیے گئے '

(۱) مولانا سید سلیمان صاحب ندوی '

(۲) ڈاکٹر عابد حسین صاحب '

(۳) مولوی عبدالماجد صاحب دریا بادی '

(۴) سرتیج بہادر سپرو '

(۵) نواب صدر یار جنگ بہادر۔

(۶) پنڈت منوہر لال زتشی '

(۷) سید مسعود حسن صاحب رضوی '

(۸) پنڈت کشن پرشاد کول '

(۹) ڈاکٹر تارا چند '

(۱۰) قاضی عبدالودود صاحب '

(۱۱) پنڈت دتاتریہ کیفی '

(۱۲) خواجہ غلام السیدین صاحب پرنسپل ٹریننگ کالج

(۱۳) بشیر احمد صاحب بارایٹ لا - لاہور '

(۱۴) زور صاحب حیدر آباد دکن '

(۱۵) حافظ محمود شیرانی صاحب '

(۱۶) پروفیسر الیاس برنی صاحب '

(۱۷) ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب شیخ الجامعہ '

(۱۸) حسرت موہانی صاحب '

(۱۹) ہاشمی صاحب فرید آبادی '

(۲۰) خان بہادر رضا علی وحشت '

(۲۱) مولوی ظفر علی خاں صاحب '

(۲۲) ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی '

(۲۳) افضل العلماء مولوی عبدالحق صاحب مدارس '

(۲۴) نواب مہدی یار جنگ بہادر '

(۲۵) راجا صاحب محمود آباد بالقابہ '

یہ بھی طے پایا کہ کمیٹی کو اختیار ہوگا کہ وہ دس ناموں کا اور اضافہ کرے —

اس کمیٹی کے حسب ذیل مقاصد قرار دیے گئے '

۱ - ادبی و علمی کتابیں اور رسالے شائع کرنا '

۲ - مناسب کتابوں کے ترجمے کے لیے یا تالیف و تصنیف کے لیے انتخاب اور اس کے لیے مولفین و مصنفین تجویز کرنا —

۳ - ضروری مسائل پر کتابیں اور رسالے لکھوانا '

۴ - اشاعت کے لیے کمیاب کتابیں منتخب کرنا '

مندرجہ بالا مقاصد جو غور و بحث کے بعد طے پائے ہم نے اجمالاً عرض کردیے ہیں '

اس کے بعد اشاعت خانے کی کمیٹی کے لیے نام تجویز کیے گئے ' یہ کمیٹی عارضی ہوگی ' اس کا کام یہ ہوگا کہ وہ "اُردو اشاعت خانہ" کے متعلق ایک اسکیم تیار کرے ' تاکہ کتابیں تجارتی اصول پر عمدہ طریقے سے شائع ہوسکیں '

اس کمیٹی کے لیے حسب ذیل اصحاب ممبر منتخب ہوئے '

۱ - عبداللطیف خاں صاحب منیجر جامعہ پریس '
۲ - مولوی مسعود علی صاحب ندوی منیجر دارالمصنفین اعظم گڑھ '
۳ - حامد علی خاں صاحب منیجر جامعہ ملیہ بک ڈپو '
۴ - سید امتیاز علی صاحب تاج لاهور '
۵ - ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی '
۶ - پروفیسر الیاس برنی صاحب '
۷ - مولوی ظفرالملک صاحب علوی اڈیٹر الناظر '
۸ - مولوی نظامی صاحب اڈیٹر ذوالقرنین و مالک نظامی پریس بدایوں '
۹ - عبدالرحمن صاحب صدیقی کلکتہ '

مندرجہ بالا کمیٹیوں کے ممبر منتخب هو جانے کے بعد مولوی عبدالحق صاحب سکرٹری انجمن ترقی اردو نے یہ تجویز پیش کی کہ انجمن کا مستقر کسی مرکزی مقام پر هو ' اور وهاں اس کے دفتر ' کتب خانے اور دارالاشاعت وغیرہ کے لیے عمارتیں تعمیر کی جائیں '

مولوی عبدالحق صاحب نے اس تجویز کو پیش کرتے هوئے یہ خیال ظاهر کیا کہ اس مقصد کے لیے دهلی بہترین جگہ هے جو حکومت هند کا مرکز بھی هے ' چنانچہ بالاتفاق یہ طے هوا کہ " انجمن ترقی اردو " کا مرکز دهلی قرار دیا جائے ' اس کے ساتھہ یہ بھی قرار پایا کہ جس قدر جلد ممکن هو انجمن کے دفاتر وغیرہ دهلی میں منتقل کر دیے جائیں ' نیز یہ بھی طے پایا کہ اردو کی کتابوں کا ایک وسیع " کتب خانہ " اور اشاعت خانہ بھی قایم کیا جائے -

انجمن کے مرکز کا معاملہ طے هوجانے کے بعد یہ تجویز هوا کہ انجمن کی کمیٹیاں هر صوبے میں قائم کی جائیں جو اپنے صوبے کے اضلاع میں اردو

کی توسیع و ترقی کے متعلق کام کریں' بعض صوبوں میں ان کی وسعت یا ضرورت کے لحاظ سے دو تین حلقے بنادیے گئے' ہر کمیٹی اپنے حلقے میں کام کرے گی' یہ بھی طے پایا کہ ہندوستانی ریاستوں میں بھی انجمن ترقی اردو کی شاخیں قائم کی جائیں —

یہ سب شاخیں مرکزی انجمن کے مشورے سے اردو کی ترقی و اشاعت کا کام کریں گی' کام کی نوعیت حسب ذیل ہوگی —

۱ - اردو کے مکاتب قائم کرنا —

۲ - بالغ العمر اور پیشہ ور لوگوں کے لیے مدارس شبینہ قائم کرنا —

۳ - اردو کی توسیع و اشاعت کے لیے صوبے میں دورہ کرنا —

۴ - ادبی جلسے منعقد کرنا —

۵ - سرکاری مدارس اور عدالتوں میں اردو کے قائم رکھنے اور رواج دینے کے لیے کوشش کرنا —

یہ جلسہ جو مندرجہ بالا اغراض کے لیے منعقد ہوا تھا تقریباً ایک بجے ختم ہوا' اور اس کے بعد جملہ مہمان نواب صدر یار جنگ بہادر کی کوٹھی حبیب منزل پر تشریف لے گئے' جہاں سب کے لیے وسیع پیمانے پر دعوت کا اہتمام کیا گیا تھا' دو بجے کے قریب سب مہمان کوٹھی سے رخصت ہوئے تاکہ اردو کانفرنس کے دوسرے اجلاس میں شرکت کریں جو ۳ بجے سہ پہر کو منعقد ہونے والا تھا —

۳ بجے سہ پہر کے بعد اردو کانفرنس کا دوسرا اجلاس حسب اعلان سابق زیر صدارت نواب مہدی یار جنگ بہادر صدرالمہام سیاسیات آصفیہ منعقد ہوا -

جناب صدر نے حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ گزشتہ روز کی

تجویز کے مطابق جو کمیٹیاں بنائی گئی ہیں ان کے ممبروں کے نام، نیز جو تجاویز پیش ہوئی ہیں ان کی تفصیل مولوی عبدالحق صاحب پڑھ کر سنائیں گے -

جناب صدر کے اس اعلان کے بعد مولوی عبدالحق صاحب نے مختصر لفاظ میں ہر کمیٹی کے مقاصد اور اس کے ممبروں کے نام حاضرین کے سامنے پیش کیے، نیز مختلف صوبوں میں شاخیں قائم کرنے کی جو تجویز منظور ہوئی تھی اس کی تفصیلات بیان کیں اور یہ بتایا کہ کس کس صوبے اور دیسی ریاست میں انجمن کی شاخیں قائم کی جائیں گی، بعض بعض صوبوں کی کمیٹیوں کے لیے عہدہ داروں کے کچھ نام تجویز کر لیے گئے تھے، یہ نام بھی سنائے گئے، اسی سلسلے میں آپ نے یہ بھی بیان کیا کہ سر سید راس مسعود بحیثیت مستقل صدر انجمن ترقی اردو نیز انجمن کے سکرٹری بحیثیت عہدہ ہر کمیٹی میں شریک سمجھے جائیں گے -

اس موقع پر سید الطاف علی صاحب ہیڈ اسسٹنٹ دفتر کانفرنس نے سکرٹری انجمن ترقی اردو کو اس فروگزاشت کی طرف توجہ دلائی کہ مختلف کمیٹیوں کے لیے جو ممبر منتخب کیے گئے ہیں ان کے لیے کوئی مدت نہیں تجویز کی گئی ہے، آیا وہ ساری عمر کے لیے ممبر رہیں گے یا کسی معین مدت کے لیے، اس پر کسی قدر بحث ہوئی اور آخر کار جناب صدر اور حاضرین کے اتفاق رائے سے تین برس کی مدت ممبروں کے لیے تجویز کی گئی، اس کے بعد بعض حاضرین نے صوبہ وار شاخوں کا کام کرنے کے لیے چند جدید نام پیش کیے جو منظور ہوئے اور یہ بھی طے پایا کہ انجمن کی شاخیں جہاں جہاں ہوں گی سب کا ایک ہی نام ہوگا یعنی "انجمن ترقی اردو"

اس کے بعد جناب صدر نے اجلاس کے اختتام کا اعلان کرتے ہوئے ایک مختصر تقریر کی —

آپ نے فرمایا کہ الحمدللہ یہ جلسہ بہت کامیاب رہا، آپ نے ایسا بہت کم دیکھا ہوگا کہ کسی جلسے میں ایسی عملی تجاویز بالاتفاق منظور ہوں، صرف خفیف ترمیمات پیش کی گئیں مثلاً کمیٹی کے ممبروں کی مدت کا تعین اور کوئی اہم اعتراض کسی کارروائی پر نہیں ہوا، اب ہمارے لیے جو بات باقی رہ گئی ہے وہ ان تجاویز کو عملی جامہ پہنانا ہے -

اس انجمن کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ محض ایک علمی کام کرنے والی جماعت ہے، اس کو کسی دوسری زبان سے رقابت نہیں ہے، یہ انجمن اردو کی ترقی کے لیے کوشش کرتی ہے جس کو ۱۴ کروڑ انسان بولتے اور سمجھتے ہیں، ان علاقوں میں جہاں مرہٹی یا گجراتی وغیرہ بولی جاتی ہے، اردو کے سمجھنے والے موجود ہیں، یہاں تک کہ ہندوستان کے باہر ماریشس وغیرہ میں لوگ اُردو بولتے ہیں، ہندوستان کی اور کوئی زبان ایسی نہیں ہے جس کو ہندوستان کے باہر لوگ بولتے ہوں -

سلسلۂ تقریر میں آپ نے یہ بھی فرمایا کہ اردو میں اگر بے ضرورت دوسری زبان کے الفاظ داخل کیے جائیں گے خواہ وہ عربی ہوں یا سنسکرت تو اس سے اردو کو نقصان پہنچے گا کیونکہ یہ ہندو مسلمانوں کی مشترکہ زبان ہے، لہذا یہ کوئی دانشمندی نہیں ہے کہ ہم اس کو ۱۴ کروڑ سے علحدہ کرکے مخصوص کردیں، اتحاد و اتفاق کا بڑا عنصر اتحاد زبان بھی ہے یہ قائم رہنا چاہیے البتہ ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اردو کس خط میں

لکھی جائے اس کا جواب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص یہ چاہتا ہے کہ جلد لکھا جائے اور جگہ تھوڑی گھرے تو وہ فارسی رسم الخط میں لکھے برخلاف اس کے اگر کوئی یہ چاہتا ہے کہ زیادہ جگہ گھرے اور جیسی آواز ہو ویسا ہی لکھہ دے تو وہ ناگری میں لکھے —

اردو کے متعلق ایک غلط فہمی یہ بھی ہے کہ وہ درباری زبان ہے اور مسلمانوں کے ساتھہ مخصوص ہے' حالانکہ یہ صحیح نہیں' جن لوگوں نے اردو کے نشو ونما کی تاریخ پڑھی ہے اور پرانی تحریروں کو دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ اردو کب پیدا ہوئی اور اس نے کس طرح ترقی کی ؟ اردو میں ترقی کی حیرت انگیز استعداد ہے اور وہ علمی زبان بن سکتی ہے چنانچہ حیدر آباد میں ریاضی اور کیمیا کی کتابیں نہ صرف اردو میں ترجمہ کی گئی ہیں بلکہ پڑھایا بھی اردو میں جاتا ہے' اردو میں اس قدر وسعت پیدا ہو گئی ہے کہ کوئی خیال خواہ وہ کیسا ہی مشکل ہو' بے تکلف ادا ہو سکتا ہے' اور یہ زبان ایک علمی زبان اور ذریعۂ تعلیم بن سکتی ہے' اب تک یورپ کو یہ خیال ہے کہ ہندوستانیوں کے پاس کوئی ایسی زبان نہیں ہے جس کے ذریعے سے علوم کی تعلیم دی جاسکے لیکن "جامعہ عثمانیہ" نے اس خیال کو غلط ثابت کردیا ہے' حیدر آباد میں ثانوی تعلیم بھی اسی زبان میں دی جاتی ہے' یہ زبان سارے ملک کی زبان ہے اور ہونی چاہیے —

نواب مہدی یار جنگ بہادر نے سلسلۂ تقریر میں یہ بھی فرمایا کہ ہماری جامعہ کا معیار کسی جامعہ سے کم نہیں بلکہ بہت سی جامعات سے زیادہ بلند ہے' اور باہر کے ممتحنوں ہماری جامعہ کے طلبہ کے جوابات کو پسند کرتے ہیں' اور جو طلبہ یورپ کی جامعات میں جاتے ہیں وہ امتیاز کے

ساتھ کامیاب ہوتے ہیں' —

اسی سلسلے میں جناب صدر نے دارالترجمہ کا ذکر بھی فرمایا جو سائنس' ریاضی اور دوسرے علمی مضامین کی کتابیں اردو زبان میں شایع کرتا ہے' آخر میں آپ نے اس تجویز پر اظہار پسندیدگی فرمایا کہ انجمن ترقی اردو کا دفتر اور کاروبار دہلی میں منتقل کردیا جائے جو ہندوستان میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے' اس کے بعد آپ نے مولوی عبدالحق صاحب کے اس شغف کا تذکرہ کیا جو آپ کو اردو کے ساتھ ہے' اور انجمن کی کامیابی کے لیے دعا فرمائی —

جناب صدر کی تقریر کے بعد نواب صدر یار جنگ بہادر نے ممدوح کی اس زحمت فرمائی کا شکریہ ادا کیا کہ وہ حیدرآباد سے طویل سفر کر کے یہاں تشریف لائے اور اس موقع پر ایک پر مغز و معنی خیز تقریر فرمائی -

آپ نے فرمایا کہ نواب مہدی یار جنگ بہادر ایک بڑے نامور اور فخر قوم و ملک بزرگ' نواب عمادالملک مرحوم کے بیٹے ہیں' مرحوم کو علم و ادب کے ساتھ ایک خاص شغف تھا' مجھے حیدرآباد کی بارہ برس کی حاضری میں مرحوم کی خدمت میں حاضر ہونے اور ان کے علمی ذوق کو دیکھنے کا بہت موقع ملا' میں ایک واقعہ ان کے شوق کا سناؤں' کانفرنس کے ایک اجلاس میں قدیم و نادر علمی کتابوں کے فراہم کرنے کی ایک تحریک منظور ہوئی' پھر اس کے متعلق ایک اپیل شائع کی گئی اس کی ایک کاپی نواب عمادالملک مرحوم کی خدمت میں بھی بھیجی گئی جس کو پڑھ کر وہ بے حد متاثر ہوئے' اور لکھا کہ اپیل میرے سامنے ہے اور میں رو رہا ہوں اور شرمندگی کے ساتھ ایک ہزار کا چک بھیجتا ہوں کیونکہ اس وقت زیادہ مدد کرنے سے مجبور ہوں —

نواب مہدی یار جنگ بہادر اسی نامور باپ کے بیٹے ہیں اور ان کو بھی اپنے نامور باپ کی طرح علوم مشرقیہ کا شوق ہے اگرچہ انہیں دوسرے مشاغل کی وجہ سے عربی علوم کی تکمیل کا موقع نہیں ملا لیکن وہ مشکل سے مشکل مسائل حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں' اور علوم قدیمہ کی ترقی سے انہیں دلی خوشی ہوتی ہے' یہ اسی شوق کا نتیجہ ہے کہ وہ یہاں تشریف لائے اور اجلاس کی صدارت فرمائی' ان کی دلچسپی اس اجلاس تک ختم نہیں ہوگی —

میں نواب صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ وہ صحت و عافیت کے ساتھہ ملک و ملت کی خدمت میں مصروف رہیں -

نواب صدر یار جنگ بہادر کی تقریر کے بعد مولوی عبدالحق صاحب سکرٹری انجمن ترقی اردو نے ایک مختصر اختتامی تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ جب میں نے اردو کانفرنس کے لیے تحریک کی تو احباب نے یہ مشورہ دیا کہ کانفرنس کی جوبلی کے زمانے میں یہ جلسہ ہونا چاہیے' لیکن میں نے یہ پسند نہیں کیا' اس صورت میں ہمیں ہرگز یہ اندازہ نہ ہوتا کہ خاص اردو کانفرنس میں شریک ہونے کے لیے کتنے لوگ آئے؟ اس کے بعد آپ نے اس امر پر اظہار مسرت کیا کہ اس کانفرنس میں تقریباً ہر صوبے کے نمایندے موجود ہیں' پھر آپ نے نواب صدر یار جنگ بہادر اور نواب مسعود جنگ بہادر کا ذکر کیا کہ انہوں نے کس قدر حوصلہ افزائی کی' اس کے بعد نواب مہدی یار جنگ بہادر کے ذوق ادب کا تذکرہ کیا کہ جب میں نے ممدوح سے اردو کانفرنس کی تجویز کا ذکر کیا تو انہوں نے فرمایا کہ میں خود چلتا ہوں' چنانچہ اسی وقت اعلحضرت کی خدمت میں عرض داشت لکھی اور یہاں آنے کی

اجازت حاصل کی، اس کے بعد راجا صاحب محمود آباد کا شکریہ ادا کیا کہ وہ ایک دوسری جگہ صدارت قبول کرچکے تھے لیکن جب اردو کانفرنس کی صدارت کے لیے ممدوح سے درخواست کی گئی تو آپ نے اس کو منسوخ کردیا اور یہاں کی صدارت قبول فرمائی یہ ایک نیک شگون ہے -

مولوی عبدالحق صاحب کی تقریر کے بعد اجلاس ختم ہوا اور سب مہمانوں نے مع راجا صاحب محمود آباد اُس پرتکلف اور باسلیقہ ٹی پارٹی میں شرکت فرمائی جو " انجمن تاریخ اسلام " مسلم یونیورسٹی کی طرف سے سومانگ باتھ ٹینس لان پر دی گئی تھی ' نماز مغرب کے بعد یونین ہال میں انجمن تاریخ اسلام کے افتتاح کا ایک شاندار جلسہ ہوا جس میں مولانا سید سلیمان ندوی نے ایک معرکۃ الآرا تقریر فرمائی اس کے بعد سب مہمانوں نے اس ڈنر میں شرکت فرمائی جو وقارالملک ہال کی طرف سے دیا گیا تھا —

مختلف ارباب علم اور بعض مشاہیر کی شرکت کے لحاظ سے اُردو کانفرنس کا یہ اجلاس کامیاب رہا ' خصوصاً یہ پہلو قابل لحاظ ہے کہ متعدد ہندو اصحاب مثلاً پنڈت دتاتریہ کیفی اور ساحر دہلوی وغیرہ نے بھی اس میں فراخدلی سے شرکت کی —

ادب

نام کتاب	صفحہ
غالب	۷۰۱
ضرب کلیم	۷۰۵
میدان عمل	۷۰۹
نقش و نگار	۷۱۳
مزامیر	۷۱۷
(۱) ظاھرباطن - (۲) نئی روشنی دوڈرامے	۷۱۸

تاریخ و سیر

نام کتاب	صفحہ
میری کہانی	۷۱۹

متفرقات

نام کتاب	صفحہ
فلسفۂ برگساں	۷۲۲

خاص نم

نام کتاب	صفحہ
ساقی	۷۲۳
شاھجہاں	۷۲۴
مشورہ	۷۲۵

اُردو کے جدید ے

نام کتاب	صفحہ
آئینۂ ادب	۷۲۶
شمیم	۷۲۶

غالب

(تالیف مولانا غلام رسول مہر بی ۔ اے ' مدیر روز نامۂ
انقلاب لاہور - صفحات ۳۸۰)

مولانا حالی کی " یادگار غالب " اردو ادب کی اُن چند کتابوں میں سے ہے جن کی تازگی کبھی کم نہ ہوگی اور اردو ادب و زبان کے شیدائی اُسے ہمیشہ پڑھیں گے اور حظ حاصل کریں گے - مولانا نے مرزا غالب کی سیرت کے خط و خال اس خوبی اور جامعیت کے ساتھہ کھینچے ہیں کہ مرزا جیتے جاگتے ' چلتے پھرتے ' بولتے چالتے ' کھاتے پیتے ' ہنسی دل لگی کرتے نظر آتے ہیں اور یہ معلوم ہوتا ہے گویا ہم اُن کی صحبت میں بیٹھے ان کی باتوں اور اُن کے کلام کا مزہ لے رہے ہیں - اور اس سے بڑھ کر اُن کے کلام کے حسن و کمال کو ایسے دلاویز طریقے سے بیان کیا ہے کہ عام و خاص دونوں پر اُس کی اصلی قدر و قیمت آشکارا ہوجاتی

ہے - یہ اسی کتاب کا طفیل ہے کہ اس کے بعد سے سیلکڑوں مضامین ' بیسیوں رسالے اور شرحیں مرزا غالب کے کلام پر لکھی گئیں اور اردو دیوان کے بیسیوں طرح طرح کے اڈیشن طبع ہوئے اور ہورہے ہیں چنانچہ جو ہردلعزیزی اس وقت غالب کو حاصل ہے وہ اردو کے کسی شاعر کو نہیں - یہ کتاب مولانا نے اس وقت لکھی جب کہ مقدمۂ شعر و شاعری اور ترتیب دیوان تریب ختم تھی - اور حیات جاوید کے لکھنے کا ڈول ڈال چکے تھے - یادگار کے مقدمے میں یہ جو لکھا ہے کہ " باوجودیکہ میں ایک نہایت اہم اور ضروری کام میں مصروف تھا ' دوستوں کے تقاضے نے یہاں تک مجبور کیا کہ اُس ضروری کام کو چند روز کے لیے ملتوی کرنا پڑا " ایک حقیقی واقعہ ہے اور یہ اسی طرف اشارہ ہے - مجھے خوب یاد ہے کہ جب میں علی گڑہ میں پڑھتا تھا (غالباً سنہ ۱۸۹۳ ع کا ذکر ہے) مولانا ' یونین کے پاس جو بنگلیا ہے اس میں آکر مقیم ہوئے تھے - ایک روز شام کو جو میں اُن کی خدمت میں حاضر ہوا تو گفتگو کے اثنا میں مرزا غالب پر کتاب لکھنے کا تذکرہ کیا - میں نے کہا " ضرور لکھنی چاہیے ' غالب بہت بڑا شخص گزرا ہے " یہ سن کر اپنے خاص انداز میں فرمانے لگے " بڑا شخص ! ایک ہی تھا " یادگار غالب پڑھنے کے بعد معلوم ہوا کہ بیشک وہ ایک ہی تھا —

مولانا اپنے دیباچے میں تحریر فرماتے ہیں کہ " میں اوپر لکھہ چکا ہوں کہ مرزا کی لائف میں کوئی ملوہ بالشان واقعہ ان کی شاعری و انشا پردازی کے سوا نظر نہیں آتا ' لہذا جس قدر واقعات اُن کی لائف کے متعلق اس کتاب میں مذکور ہیں اُن کو ضمنی اور استطرادی سمجھنا چاہیے اصل مقصود اس کتاب کے لکھنے سے شاعری کے اس عجیب و غریب ملکہ

کا لوگوں پر ظاہر کرنا ہے جو خداے تعالیٰ نے مرزا کی فطرت میں ودیعت کیا تھا "

اس سے صاف ظاہر ہے کہ مولانا کا اصل مقصد مرزا کی سیرت اور شاعری پر لکھنا تھا۔ حالات کا بیان ضمنی ہے۔ مہر صاحب نے اپنی کتاب میں نہ صرف اس کی تکمیل کی ہے بلکہ سنین وغیرہ میں جو غلطیاں پائی جاتی ہیں ان کی بھی تصحیح کردی ہے اور بعض غلط فہمیوں کا ازالہ بھی کردیا ہے۔ مہر صاحب نے مرزا صاحب کے تمام کلام کا جو اس وقت دستیاب ہوسکتا ہے یا جو کمیاب ہے بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے اور ہر چیز کو نظر غائر سے دیکھا ہے اور خود مرزا صاحب ہی کی زبانی یا ان کے کلام سے ان کے سوانح مرتب کردیے ہیں۔ بلکہ جہاں خود مرزا صاحب سے بھی سہو ہوگیا ہے اس کی بھی صحت کردی ہے۔ یہ بڑی محنت اور تحقیق کا کام تھا جو فاضل مولف نے بڑے سلیقے اور کد و کاوش کے ساتھ انجام دیا ہے۔ اور متفرق اور پریشان اجزا کو اِدھر ادھر سے ڈھونڈ کر اس طرح مرتب کردیا ہے کہ ہر دعوے کے لیے استدلال اور ہر بیان کے لیے ثبوت موجود ہے۔ مرزا کی زندگی کے تمام واقعات اور ان کی تصانیف کی پوری تفصیل جہاں تک کہ ان کا ملنا ممکن تھا اس کتاب میں ترتیب کے ساتھ ایک جا جمع ہوگئی ہے۔ اس کتاب کے پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کے رقعات اور ان کے کلام میں ضمنی طور پر اور نامعلوم طرح سے ان کی زندگی کے چھوٹے بڑے حالات کس قدر چھپے پڑے ہیں جن پر کسی کی نظر نہیں پڑی تھی۔ یہ سعادت مہر صاحب کے حصے میں تھی —

اس کتاب پر مکمل اور صحیح تبصرہ وہی کرسکتا ہے جس نے مرزا کے کلام کو اسی غور و تحقیق سے پڑھا ہو جیسا مہر صاحب نے پڑھا ہے۔

البتہ دوران مطالعہ میں مجھے یہ معلوم ہوا کہ مہر صاحب کو مرزا کے فارسی کلیات کے پہلے اڈیشن کے متعلق صحیح اطلاع نہیں ملی - کلیات پہلی بار مطبع نولکشور میں نہیں چھپا بلکہ اس سے قبل طبع ہوچکا تھا - اس کا ایک نسخہ میرے پاس موجود ہے - یہ دلی میں چھپا تھا - اس کے سرورق کی عبارت یہ ہے —

"دیوان فارسیء افصح الفصحاء ابلغ البلغاء مہر سپہر بلاغت سپہر مہر فصاحت سحبان زماں حسان دوراں جناب مستطاب میرزا اسداللہ خاں بہادر المتخلص بغالب بتصحیح و ترتیب نواب والا جناب معلی القاب قبلۂ ارباب ہمم کعبۂ اصحاب کرم ضیاءالدین احمد خاں بہادر نیر تخلص خلف الصدق فخرالدولہ دلاورالملک نواب احمد بخش خاں بہادر رستم جنگ مبرور و مغفور کہ ارشد و اعظم تلامذۂ خان عالیشان موصوف و ملجملۂ اساتذۂ روزگار اند بہ اہتمام عبدالاقل عنایت حسین بانیء مطبع دارالسلام واقع حوض قاضی گذر الہ آباد من محلات دارالخلافۂ شاہجہاں آباد زیب انطباع یافت" —

نواب ضیاءالدین احمد خاں نیر نے تاریخ طبع کی دو تاریخیں کہیں، ایک رباعی اور ایک قطعہ (دو بیت کا) ایک میں تخرجہ ہے اور دوسری تعمیہ، جن سے سنہ ۱۲۶۱ ھ (مطابق سنہ ۱۸۴۵ ع) نکلتا ہے - وہ دونوں شعر جن سے تاریخ نکلتی ہے یہ ہیں :-

بردار سر حسود و سال طبعش   اے نیر یادگار غالب بنویس

ہمایوں سروش از تہ دل سرود   کہ دیوان مطبوع غالب بگوے

مہر صاحب نے پہلے اڈیشن کا سال طبع سنہ ۱۸۶۳ ع (جو سال ہجری

کے لحاظ سے ۱۲۸۰ ہوتا ہے) بتایا ہے جو نول کشور پریس میں چھپا تھا -
اس کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ انہیں دھلی والے کلیات کی اطلاع
نہیں تھی - اگرچہ اس کے عنوان میں دیوان فارسی لکھا ہے لیکن اس میں
قطعات ' تاریخیں ' مثنویات (سرمۂ بینش ' درد و داغ ' چراغ دیر ' رنگ و بو '
باد مخالف) فاتحہ ' نوحے ' ترکیب بند اور قصائد بھی درج ہیں - اس
میں شک نہیں کہ نول کشور والے اڈیشن کے مقابلے میں کلام کم ہے اور
ہونا بھی چاہیے کیونکہ یہ تقریباً انیس بیس برس پہلے کا چھپا ہوا ہے -
دونوں کلیاتوں کے مقابلے سے کلام ' نیز بعض ضمنی واقعات کا انکشاف ممکن ہے -

" قادر نامہ " کے متعلق مہر صاحب نے شبہ ظاہر کیا ہے اور انہیں اس
میں کلام ہے کہ یہ مرزا صاحب کی تصنیف ہے - لیکن میں نے میرن صاحب
سے سنا تھا کہ یہ مرزا صاحب نے عارف کے بچوں کے لیے لکھا تھا --

مہر صاحب کی یہ تالیف بہت قابل قدر ہے ' اور ان کی جستجو اور
سعی لایق شکریہ - جسے غالب کے کلام و سیرت سے لطف اٹھانا مقصود ہو وہ
یادگار غالب پڑھے اور جسے مرزا کے حالات اور کلام کی تفصیل کے متعلق
تحقیق مطلوب ہو وہ " غالب " کا مطالعہ کرے - اور سچ پوچھیے تو دونوں
کا پڑھنا ضروری ہے --

ضرب کلیم -- (تصنیف حضرت اقبال)

سچا ادیب یا شاعر جب مشاق اور پختہ کار ہوجاتا ہے تو اس کا
بیان سادہ اور معانی بلند ہوجاتے ہیں اور اس کی بول چال کی زبان
کے قریب آجاتی ہے - گو ظاہری ٹھاٹھ اور ہنگامہ زیادہ نہیں ہوتا مگر

باطلی شان اور شورش بڑھ جاتی ہے - اس قول کی تصدیق حضرت اقبال کی تازہ تصنیف " ضرب کلیم " سے پوری پوری ہوتی ہے - بے شک اس میں وہ گرج اور ولولہ انگیز قوت نہیں جو " بانگ درا " میں ہے اور اس میں بھی شک نہیں کہ ضرب کلیم کی ضرب دھیمی ہے مگر زیادہ کاری ہے - وہ (قدیم) نظمیں براہ راست دلوں پر دھاوا کرتی تھیں اور یہ دماغ کے واسطہ سے دلوں کو ٹٹولتی ہیں - ان میں شاعر کے خیالات کا نچوڑ ہے جو اس کے غائر مشاہدے اور غور و فکر کا نتیجہ ہیں - اس میں جابجا حکمت کے موتی بکھرے ہوے نظر اتے ہیں اور بعض اوقات یہ معلوم ہوتا ہے کہ رومی اور سنائی اقبال کی زبان سے بول رہے ہیں ' مگر نئے انداز میں جو زمانۂ حال کا ترجمان ہے —

اس کتاب میں کئی باب ہیں جن میں سے خاص کر ادبیات فنون لطیفہ ' سیاسیات مشرق و مغرب اور محراب گل افغاں کے افکار پڑھنے اور غور کرنے کے قابل ہیں - شاعر خود اپنی نسبت کہتا ہے اور بجا کہتا ہے —

فردوس میں رومی سے یہ کہتا تھا سنائی
مشرق میں ابھی تک ہے وہی کاسہ وہی آش
حلاج کی لیکن یہ روایت ہے کہ آخر
اک مرد قلندر نے کیا راز خودی فاش

اورحقیقت یہ ہے کہ اقبال کا سارا فلسفہ اورتعلیم "راز خودی" میں پنہاں ہے —

فنون لطیفہ پر کیا اچھی چھوٹی سی نظم لکھی ہے - ادیبوں اور شاعروں کو اس سے سبق حاصل کرنا چاہیے —

اے اہل نظر ذوق نظر خوب ہے لیکن جوشے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا !

مقصود ہنر سوز حیات ابدی ہے　　یہ ایک نفس یا دو نفس مثل شرر کیا !
جس سے دل دریا متلاطم نہیں ہوتا　　اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا !
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو　　جس سے چمن افسردہ ہو وہ باد سحر کیا !
بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں　　جو ضرب کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا !

اسی بنا پر وہ اپنے شعر سے خطاب کرتے ہیں —

شعلہ سے ٹوٹ کے مثل شرر آوارہ نہ رہ
کر کسی سینۂ پرسوز میں خلوت کی تلاش

اس کے شعر کی تعریف سنیے —

میں شعر کے اسرار سے محرم نہیں لیکن
یہ نکتہ ہے تاریخ امم جس کی ہے تفصیل
وہ شعر کہ پیغام حیات ابدی ہے
یا نغمۂ جبریل ہے یا بانگ سرافیل !

" نگاہ " پر جو چند شعر لکھے ہیں اُن کی ادبیت اور خوبی پر نظر ڈالیے —

بہار و قافلۂ لالہ ہائے صحرائی
شباب و مستی و ذوق و سرور و رعنائی
اندھیری رات میں یہ چشمکیں ستاروں کی
یہ بحر' یہ فلک نیلگوں کی پہنائی !
سفر عروس قمر کا عماریٔ شب میں
طلوع مہر و سکوت سپہر مینائی !
نگاہ ہو تو بہائے نظارہ کچھ بھی نہیں
کہ بیچتی نہیں فطرت جمال و زیبائی !

طالب علم سے خطاب ہے —

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کردے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں
تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو
کتاب خواں ہے مگر صاحب کتاب نہیں

" شعاع امید میں " ہند کی تاریک فضا پر کیا اچھا بند لکھا ہے -

اک شوخ کرن ' شوخ مثال نگہ حور
آرام سے فارغ صفت جوہر سیماب
بولی کہ مجھے رخصت تنویر عطا ہو
جب تک نہ ہو مشرق کا ہر اک ذرہ جہاں تاب
چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو
جب تک نہ اٹھیں خواب سے مردان گراں خواب
خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز
اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب
چشم مہ و پروین ہے اسی خاک سے روشن
یہ خاک کہ ہے جس کا خزف ریزہ در ناب
اس خاک سے اٹھے ہیں وہ غواص معانی
جن کے لیے ہر بحر پر آشوب ہے پایاب
جس ساز کے نغموں سے حرارت تھی دلوں میں
محفل کا وہی ساز ہے بیگانۂ مضراب
بت خانے کے دروازے پہ سوتا ہے برہمن
تقدیر کو روتا ہے مسلماں تہ محراب
مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

اقبال تہذیب فرنگ اور غلامانہ طبیعت کا سب سے بڑا دشمن ہے اور ان کے متعلق اس صحیفے میں طرح طرح کے نکتے موجود ہیں جن میں حقیقت بھی ہے تعلیم بھی ہے اور طعن بھی ہے -

آخری باب محراب گل افغاں کے افکار پر ہے - افکار غالباً اس کے ہوں گے لیکن بیان سراسر اقبال کا ہے جس میں خود اس نے اپنا رنگ بھر دیا ہے اور اس لیے یہ زیادہ دلکش اور پر اثر ہوگئے ہیں —

میدان عمل -

(از پریم چند - مطبوعہ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی -

کتابت وطباعت عمدہ - مجلد قیمت دو روپے آٹھ آنے)

ہندی میں یہ ناول کئی سال پہلے "کرم بھومی" کے نام سے چھپ چکا تھا لیکن اردو میں چھپنے کی نوبت اب آئی - جب سے پریم چند ہندی کی طرف مائل ہوئے وہ پہلے سب کچھ اسی زبان میں لکھتے تھے اور بوقت فرصت اسے اردو میں منتقل کر لیا کرتے تھے - یہی وجہ ہے کہ ان کی اردو تحریر میں اب پہلے کی سی بے ساختگی اور شگفتگی نہیں رہی تھی -

ہندوستانی ادب پر پریم چند کے بڑے احسانات ہیں - انہوں نے ادب کو زندگی کا ترجمان بنایا - زندگی کو شہر کے تنگ گلی کوچوں میں نہیں بلکہ دیہات کے لہلہاتے ہوئے کھیتوں میں جا کر دیکھا - انہوں نے بے زبانوں کو زبان دی اور ان کی بولی میں بولنے کی کوشش کی - اس ناول میں ایک جگہ اپنے آرٹ کی تشریح ان معنی خیز الفاظ میں کرتے ہیں: "عیش و آرام' سیر تماشے سے روح کو اسی طرح اطمینان نہیں

ہوتا جیسے کوئی چٹنی اور اچار کھا کر سیر نہیں ہوسکتا - زندگی کسی حقیقت پر ہی اٹک سکتی ہے" (ص ۲۶) —

پریم چند کے نزدیک آرٹ ایک کھونٹی تھی حقیقت کو لٹکانے کے لیے - سماج کو وہ بہتر اور برتر بنانا چاہتے تھے اور عدم تعاون کی تحریک کے بعد یہ ان کی زندگی کا مشن ہوگیا تھا - انہیں عوام کی پاک نفسی پر ایمان راسخ تھا مگر اس خام خیالی میں مبتلا تھے کہ اونچے طبقے سے ایسے لوگ نکلیں گے جو مظلوموں کے حق میں سماج کی کایا پلٹ کردیں گے - ان کا مقصد اتنا بلند تھا اور ان کا نفس اتنا بے ریا اور پاک، کہ ان کی ادبی خامیوں کو نظر انداز کرنے کو جی چاہتا ہے - لیکن بسا اوقات وہ کچھ اس طرح سامنے آ جاتی ہیں کہ نہ الگ ہٹنے کا موقع ملتا ہے نہ آنکھیں ڈھنک لینے کا —

پریم چند کے آرٹ کے سماجی پہلو کو لیجیے تو ایک مشترک خصوصیت آنکھوں کو کھٹکتی ہے - امیروں کے جبر و ظلم کی تصویر کھینچنے کے بعد بھی وہ سمجھتے ہیں کہ امیر زادے غریبوں کے لیے قربانی کے واسطے آمادہ ہوسکتے ہیں :

"امیر نے پوچھا — کیا تم اسے تسلیم نہیں کرتے کہ دنیا کا نظام حق اور انصاف پر قایم ہے - اور ہر انسان کے دل کی گہرائیوں میں وہ تار موجود ہے جو قربانیوں سے جھنکار اٹھتا ہے -

سلیم بولا — میں اسے باور نہیں کرتا - دنیا کا نظارہ خود غرضی اور جبر پر قایم ہے - اور ایسے بہت کم انسان ہیں جن کے دل کی گہرائیوں میں وہ تار موجود ہے" - (ص ۲۵۰) —

پریم چند استثنا کو کلیہ سمجھتے تھے - نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غریب

پورے نظام کے بنیادی ظلم کو چند امیروں کی خیرات اور ایثار کی وجہ سے معاف کردیتے ھیں - پریم چند جس دور کے ادیب تھے اس میں اصل نزاع ظلم اور انقلاب کے درمیان نہیں بلکہ اصلاح اور انقلاب کے درمیان تھی - ظلم اصلاح کا بھروپ بھر کر آیا تھا اور پریم چند اس کا دم بھرنے لگے تھے-

ادبی پہلو پر نظر ڈالیے تو کئی چیزیں ناظر کو متوجہ کرتی ھیں :

'میدان عمل' کے تمام کردار غیر مستقل مزاج اور کمزور ھیں —

توجہ کا مرکز مرد نہیں بلکہ عورت ھے - مرد غیر دلچسپ ھے مگر عورت اپنی شخصیت رکھتی ھے - تحریک کو ترغیب عورت سے ملتی ھے اور وہ اپنی شخصیت سے مرد کو متاثر کرتی ھے —

طاقت مرد میں نہیں بلکہ انبوہ میں ھے - گھریلو زندگی کے سین کم رنگ خطوں سے بنائے گئے ھیں لیکن جب قصہ گھر سے نکل کر دیہات اور میدان کی کھلی فضا میں پہنچتا ھے تو اس میں تازگی پیدا ھوجاتی ھے اور نئی جان آنے لگتی ھے —

پریم چند جب فکر کی دنیا میں پہنچتے ھیں تو غوطہ کھا جاتے ھیں - سوچ بچار ان کا میدان نہیں ھے - عمل اور وہ بھی کسی مقصد کی خاطر - یہ ان کا حصن حصین ھے - وھاں ان کا قلم پورے زور کے ساتھ چلتا ھے اور ان کا آرٹ اپنے کمال پر ھوتا ھے - لیکن جب مرد اپنے باطن میں آتا ھے تو پریم چند اسے نہیں سمجھ سکتے مثلاً امر کانت کے کردار کو لیجیے- وہ سکھدا کا شوھر ھے لیکن سکینہ سے محبت کرنے لگتا ھے اور افشائے راز کے بعد گھر تج کر دیہات کی راہ لیتا ھے - وھاں منی کی محبت اس کے دل میں جگہ کرنے لگتی ھے - ادیب نے بڑی سخت گتھی ڈال دی ھے اور اسے سلجھانے میں بری طرح ناکام رھا - سکھدا کو اس نے امرکانت کا

ہم خیال بنا کر دونوں کو ہم نفس کردیا یہاں تک تو ٹھیک ہے - مگر بی سکینہ کا عشق چار چھ ماہ بعد سرد پڑنے لگتا ہے اور وہ میاں سلیم سے نامہ و پیام کا سلسلہ شروع کردیتی ہیں۔ مُنّی کی محبت کو ادیب اظہار کا موقع بھی نہیں دیتا اور آخر میں وہ امر کے گھر بہن کی طرح رہنے لگتی ہے - نینا اور شانتی سروپ میں پریم کی پینگ بڑھتے بڑھتے یکایک رک جاتی ہے - امر کانت کا سکینہ کے گھر پہنچ کر بے دھڑک پریم کہانی سنانا اور سکینہ کا بھی دوبدو اقرار کرنا طبع نازک پر گراں سا گزرتا ہے - یہ کسے نہیں معلوم کہ محبت بے زبان ہوتی ہے اور پہلی ملاقات میں عورت تو عورت مرد کی گویائی بھی خاموشی پر ختم ہوجاتی ہے۔

پریم چند فوٹوگرافر تھے' مصور نہ تھے - فوٹو گرافر کا کام جب ختم ہوجاتا ہے تب مصور کا کام شروع ہوتا ہے۔ پریم چند کا دایرہ اس وقت شروع ہوتا ہے جب فرد اپنی انفرادیت کو چھوڑ کر بھیڑ میں مل جاتا ہے - تجزیۂ نفس ان کا میدان نہ تھا اور وہ خود اس حقیقت کو سمجھتے تھے اسی لیے ان کے ناولوں میں مسلسل حرکت اور ہل چل ہوتی ہے - شور و غوغا اتنا زیادہ ہے کہ انسان کو کسی کونے میں بیٹھ کر اپنے دل کے اندر جھانکنے کا موقع ہی نہیں ملتا —

اس کے باوجود دنیائے ادب میں پریم چند ایک نمایاں رتبے کے مستحق ہیں - ان کا آرٹ ایسا جزرس نہ تھا کہ ایک چھوٹے سے نقطے کو بہت بڑے کینواس پر پھیلا دیتا - انہیں ایک پوری چھپ چاہیے تھی لیکن اس کی عکاسی کے لیے چھوٹے افسانے کافی تھے - وہ فسانوں کے بادشاہ تھے اور ان کے بل پر ان کی حیثیت دایم اور مسلم ہے - ناول ان کے لیے مکڑی کے جالے کی طرح تھا جس میں پھنس کر وہ نکل ہی نہ سکتے تھے -

اور اگر نکلتے تھے تو اس کے تاروں کو توڑ کر —

پریم چند ھمارے ادب کے سرتاجوں میں تھے - وقتی مسائل کی اھمیت کو انہوں نے اس شدت کے ساتھہ محسوس کیا کہ فن کے معیار کو اس پر قربان کردیا - افسانہ نگاری میں ان کا وھی مرتبہ ھے جو شاعری میں حالی کا - دونوں پیش رو تھے' دونوں پیغمبر تھے' دونوں بیداری کے نقیب تھے - شخصی حیثیت سے بھی دونوں ایک دوسرے کے قریب تھے — سادگی کے رسیا اور اخلاص کے پجاری - انہوں نے زندگی کی کامرانی کا پیغام سنایا' اسی راہ میں عمر گزاری' سختیاں جھیلیں اور شہادت کے درجے کو پہنچے —

پریم چند کا یہ ناول دماغی عیاشی کو حقارت سے دیکھتا ھے اور جمالیاتی موشگافیوں پر چیں بجبیں ھے - اپنی خامیوں کے باوجود وہ ایک نئے دور کا صور ھے —— ایسا دور جس میں زندہ درگور مظلوم کروٹ بدلتا سماج کے منہ زور گھوڑے کی لگام اپنے ھاتھہ میں لیتا ھے اور اسے ایسی راہ لگاتا ھے جو اخوت مساوات اور آزادی کی طرف جاتی ھے —

" ناخدا " -

نقش و نگار -

مجموعۂ کلام جوش ملیح آبادی

(کاغذ و طباعت دیدہ زیب - مجلد قیمت ۲ روپے - مطبوعۂ جامعۂ ملیہ دھلی) —

جناب جوش کے کلیات کا یہ پہلا حصہ ھے - اس میں زیادتر ایسی نظمیں ھیں جو تجزیۂ نفسی کی اصطلاح میں " اصول عیش (Pleasure-Principle)

سے تعلق رکھتی ہیں - پورے مجموعے میں ایسی کوئی نظم نہ ملے گی جسے پڑھ کر ہم جوش صاحب کو شاعر انقلاب کہہ سکیں - یہاں وہ ایک نئے روپ میں نظر آتے ہیں - وہ آتش زبانی سرد پڑ گئی ہے، تلوار نیام میں چھپی ہوئی ہے، سرفروشی کے ولولے غائب ہوگئے ہیں - یہاں وہ اپنی مخصوص وضع میں جلوہ فرما ہیں - "مخمور، مست، خندہ بلب جھومتے ہوئے" - یہ شاعر شاعر شباب کا بانا ہو تو ہو، انقلابی کے لیے ایسے چونچلے کچھ زیادہ مستحسن نہیں ہیں —

اصول پرستی کی تعبیر تجزیۂ نفسی کے نزدیک یہ ہے کہ ہیجانات کا مرکز شہوانی جذبے سے منتقل ہوکر کسی خیال کی طرف آنے لگتا ہے - اس روش کا اصطلاحی نام (Displacement) ہے - رفتہ رفتہ انسان کے شہوانی جذبات کی کیفیت بدل جاتی ہے - وہ اس خیال سے عشق کرنے لگتے ہیں - اور ارتفاع جنسی (Sex-Sublimation) کی حد کو پہنچ جاتے ہیں - جو لوگ کسی اصول کے پرستار ہوتے ہیں ان میں شخصی محبت کا مادہ کم ہوتا جاتا ہے اور سارا جذبۂ محبت کسی غیر شخصی مقصد کی طرف مائل ہوجاتا ہے - سیدھے سادے الفاظ میں یوں سمجھیے کہ یہ شہوانی بھوک اور محبت کا فرق ہے - محبت محبوب کے لیے ہر امکانی قربانی کر سکتی ہے لیکن شہوت کا مطالبہ خود پرستی اور خود نمائی ہے —

نقش و نگار کا شاعر اب تک اپنے ہیجانات کی تہذیب نہیں کرسکا ہے - وہ کسی اصول یا خیال کا مدعی نہیں ہے - وہ ایک عورت چاہتا ہے —— جوان حسین اور برہنہ - عورت سے وہ اور کسی قسم کے حظ کی توقع نہیں رکھتا - جامن والی ہو (ص ۲۹) یا مہترانی (ص ۴۲) اس کا آغوش سب کے لیے کھلا ہوا ہے - جوش صاحب کی زبان میں یہ

سب ' اُبلتی عورتیں ' ہیں - اس 'اُبال' کا اثر بعض اچھی نظموں
میں اس تلذذ سے نمایاں ہوتا ہے کہ طبیعت مالش کرنے لگتی ہے- مثلاً
گھٹا چھائی تو کیا ' (ص ۱۷۹) کا یہ آخری شعر ملاحظہ ہو —

جوش کے پہلو میں جب تم ہی مچل سکتے نہیں
پھر گھٹا کے دامنوں میں برق لہرائی تو کیا

' یار پری چہرہ ' کی رنگینی کو یہ آخری شعر یوں مجروح کررہا
ہے گویا حوض کوثر میں بڑا سا مینڈک کود پڑا ہو —

اللہ کرے وہ صنم دشمن ایماں
مچلے کسی شب جوش کے پہلو میں دوبارا

تھوڑا سا ضبط نفس ایسی بدعنوانیوں کا اعادہ نہ ہونے دیتا —

جوش اردو شاعری کا 'بائرن' ہے - بائیرن میں شیلے کی عالی
ظرفی اور کیٹس کی نازک طبعی نہ تھی - وہ اس آدمی کا ترجمان تھا
جو دیوانیت کے دور سے گزرنا چاہتا ہے لیکن انسانیت کے مطالبات اس
قدر سخت ہیں کہ مکر' ظلم اور جبر کے الزام لگاکر انہیں ٹھکرا دیتا
ہے اور اس بے قیدی کے برتے ایک بہتر اخلاق کا مدعی بن بیٹھتا ہے —

فنی حیثیت سے جوش کا مرتبہ شاید بلند ہے - زبان پر اسے بڑی
قدرت ہے - وہ ایک منظر کو سو سو طرح بیان کرسکتا ہے اور حسن کہیں
زائل نہیں ہوتا - الفاظ کے انتخاب میں بھی وہ بڑے سلیقے اور موزونیت
سے کام لیتا ہے - اس کا تخیل دور رس بھی ہے اور جزرس بھی - وہ
محاکات کا بادشاہ ہے اور اس کی تصویروں میں کمال سرمستی اور
بیخودی ہوتی ہے - اس کی تشبیہیں اور استعارے اچھوتے ہوتے ہیں اور
یہ کہا جاسکتا ہے کہ ' فارم ' کے اعتبار سے وہ اس وقت اردو کا سب سے

اچھا شاعر ہے —

اس کے یہ معنی نہیں کہ اس کا تخیل اور مشاہدہ بالکل بے عیب ہے - پہلی نظم (یہ کون اٹھا ہے شرماتا) کو دیکھیے - دوسرے بند میں کہا ہے " رخ پہ سرخی " لیکن نویں بند میں بتلایا ہے کہ " چہرہ پھیکا نیند کے مارے " ظاہر ہے کہ نیند کے بعد چہرے پر پھیکے پن کا ہونا زیادہ فطری ہے - یہ تضاد بھلا نہیں لگتا - پھر پوری نظم کی سبکی اور نزاکت کو " دھوم مچاتا " کا ٹکڑا کھلی مار رہا ہے —

' حسن بیمار کا ' پہلا شعر غور طلب ہے :

کیا غضب ہے حسن کے بیمار ہونے کی ادا
جیسے کچی نیند سے بیدار ہونے کی ادا

کچی نیند سے جاگنے پر چڑچڑا پن اور غصے کی کیفیت طاری ہوجاتی ہے - آنکھوں میں کچھہ سرخی ہوتی ہے اور چہرے پر خشکی - لیکن حسین بیمار کے چہرے پر یہ آثار نہیں ہوتے —

' جوانی کا تقاضا ' نامی نظم میں ایک مہترانی کا ذکر ہے جو ' منہ اندھیرے تاروں کی چھاؤں ' میں چلی جا رہی ہے - ظاہر کہ اس وقت اتنا اندھیرا ہوگا کہ اس کے خط و خال کو کوئی راہ چلتا نہیں دیکھہ سکتا - مگر شاعر کا بیان ہے کہ وہ اس کی انکھڑیوں کی ادا اور پیشانی کی شکنوں کو دیکھہ سکتا تھا —

ایک جگہہ لکھا ہے " کوکتا ہے پپیہا " کوکنا صرف کویل کے لیے آتا ہے - کہیں ' بغاوت کی نظر ' چھپ گیا ہے - شاید کاتب کی غلطی ہے — ایسی غلطیاں خال خال ہی ہیں —

اگر ہمارے شعراء کلیات کی بجائے انتخاب کے قائل ہوجائیں تو

اچھا ہو - بڑے سے بڑے شاعر کے کلام میں نشیب و فراز کا ہونا لازمی ہے یہی حال اس مجموعے کا ہے - اس کی بعض نظمیں بہت اعلی ہیں مثلاً ' جنگل کی شہزادی ' ' جوانی ' ' چلد جرعے ' وغیرہ - لیکن تاثرات کے ذیل کی اکثر نظمیں معمولی اور سطحی ہیں - اس ضمن میں بعض ایسی نظمیں بھی آگئی ہیں جو شاعر کے خاندانی حالات سے تعلق رکھتی ہیں - ان کی اشاعت " شاعر انقلاب " کے شایان شان نہ تھی —

آخر میں ہم یہ ضرور کہیں گے کہ ان نظموں کو پڑھنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ شاعر میں ایک قسم کی شکم سیری (Satiety) کا جذبہ پیدا ہو رہا ہے - خدا کرے ایسا نہ ہو کیونکہ جوش کی ذات سے اردو شاعری کی بہت سی توقعات وابستہ ہیں —

" ناخدا "

مزامیر -

(مجموعۂ کلام) از سید احمد اللہ صاحب قادری - قیمت ۱۵ آنے - مطبوعۂ احمدیہ پریس - چار مینار حیدرآباد دکن) —

کتاب کا سرورق انگریزی میں ہے جسے دیکھ کر ناظر پر رعب پڑتا ہے کہ شاید انگریزی میں طبع آزمائی فرمائی ہے - لیکن ورق الٹنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ غریب اردو کو نوازا ہے —

مجموعے کی شان یہ ہے کہ اس میں آدھی نظمیں ہیں اور آدھے قصیدے - ملکی غیر ملکی سبھی کی شان میں قصیدے لکھے ہیں اور اس صنف سخن

میں خوب بال و پر نکالے ہیں - اپنے تبصرے میں عبداللہ عمادی صاحب نے خوب داد سخن دی ہے کہ قادری صاحب "فی الواقع فرزند شمس ہیں" -

کتاب کی قیمت اکلی کم ایک روپیہ رکھنا بھی ایک شاعرانہ جدت ہے - یہ ترکیب ناشر نے باتا صاحب سے سیکھی ہوگی جن کے جوتے چار روپے ۱۵ آنے میں بکا کرتے ہیں —

" نا خد "

(۱) ظاہرباطن - (۲) نئی روشنی - (دو ڈرامے) -

(از فضل الرحمن صاحب - قیمت ڈیڑھ روپیہ -
مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس - چار مینار حیدرآباد دکن) -

انگریزی کے مشہور ڈراما نگار شیریڈن کی دو تمثیلوں کو اردو کا جامہ پہنایا ہے، اس حسن و خوبی کے ساتھ کہ نقل اور اصل میں کوئی فرق نہیں رہا - اردو تحریر بہت صاف و سلیس اور ساتھ ساتھ شوخ بھی ہے - ڈراموں کا موضوع سماجی ہے اور مسائل حاضرہ سے تعلق رکھتا ہے - اس لیے ان کا لطف دو بالا ہوگیا ہے - اسٹیج کی ضروریات کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے حالانکہ پانچ ایکٹوں کی تقسیم اور کرداروں کی زیادتی سے تھوڑی سی دقت پیدا ہونے کا اندیشہ ہے - ہماری زبان میں اچھے ڈراموں کی بہت کمی ہے اور ان میں پیش نظر تمثیلوں کو نمایاں جگہ ملے گی -

" نا خدا " -

تاریخ وسیر

میری کہانی -

(از پنڈت جواہر لال نہرو - صفحات ایک ہزار - مجلد
اور مصور - قیمت چار روپے - ملنے کا پتا مکتبۂ جامعہ ملیہ دہلی)

پنڈت جواہر لال نہرو کی آپ بیتی کا ترجمہ ہے - اصل کتاب چند ماہ پہلے انگلینڈ میں شائع ہوئی اور اُسے اپنے پرائے سب نے سراہا تھا - ہندوستانی زبانوں میں اس کی اشاعت میں مکتبۂ جامعہ نے پہل کی اور اس مستعدی کے لیے اس کا ادارہ لایق تحسین ہے —

پنڈت نہرو کی رام کہانی دراصل گزشتہ بیس سال کی ہندوستانی سیاست کی داستان ہے - وہ ان لوگوں میں نہیں ہیں جو گھر کے اندر اور گھر کے باہر دو مختلف زندگیاں بسر کرتے ہیں - یہی وجہ ہے کہ ایک شخص کی سوانح ہونے کے باوجود ' ہندوستان کی حالیہ سیاست پر اس سے بہتر کتاب نہیں مل سکتی —

اس آپ بیتی کا مصنف دنیا کی آفرین و نفرین سے بے نیاز ہے - اپنے ناظرین کو وہ کسی عامیانہ بے تکلفی کی اجازت نہیں دیتا اور نہ وہ کسی ذاتی صواب و خطا کا کھاتا لکھنے بیٹھتا ہے - اس کتاب میں صرف مصنف کا ہی نہیں ' بلکہ اس کے دور کا بھی چہرہ نظر آتا ہے - یہاں ہم ہندوستان کی اصل تصویر دیکھتے ہیں - ایک طرف وہ ہندوستان ہے جو لڑتے ہوئے

آگے بڑھ رہا ہے ' دوسری طرف وہ ہندوستان ہے جو ایک جگہ اچل اور اٹل کھڑا ہوا سڑ رہا ہے - یہ آپ بیتی واقعتاً دیس بیتی ہے - اور جب کبھی مصنف اپنے دل کی گہرائیوں میں جھانکتا ہے تو اس میں بھی ہم اپنے بے کس اور بے بس ملک کی مسخ شکل دیکھتے ہیں —

پنڈت جی کے ذہنی ارتقاء کے تین دور قرار دیے جاسکتے ہیں - پہلا عدم تعاون کی تحریک کے لگ بھگ شروع ہوکر اس کے ساتھہ ساتھہ ختم ہوجاتا ہے - دوسرا دور سیاحت یورپ کے دوران میں شروع ہوتا ہے اور سول نافرمانی کے ساتھہ ختم ہوجاتا ہے - تیسرا دھرہ دون جیل سے نکل کر شروع ہوتا ہے اور اب تک قائم ہے - پہلے دور میں پنڈت جی ایک اصلاح پرور ہیں اور ان کے نزدیک ملک کی آزادی کی نوعیت اخلاقی مطالبے سے زیادہ نہیں ہے - دوسرے دور میں اصلاح اور انقلاب کی کشاکش شروع ہوتی ہے - پنڈت جی کا دماغ انہیں اشتراکیت کی طرف اور قلب گاندھی جی کی طرف کھینچ رہا ہے - آخر دماغ دل پر غالب آتا ہے اور وہ اس ملک میں اشتراکیت اور انقلاب کا پرچار کرنے لگتے ہیں —

اس کتاب کو پڑھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ پنڈت جی طبعیتاً مفکر ہیں' یہ دوسری بات ہے کہ واقعات نے انہیں سپاہی بھی بنادیا ہے - ان میں فوری فیصلہ کرنے کی صلاحیت نہیں ہے اور عوام کی قیادت کے جوہر کمیاب ہیں - وہ اپنی منزل تک پہنچنے کے لیے سیدھا راستہ چاہتے ہیں اور کسی حکمت عملی یا ترکیب کے متحمل نہیں ہوسکتے - ان کی صاف گوئی اور خلوص مسلم الثبوت ہیں لیکن موجودہ زمانے میں صرف یہی صفات کسی تحریک کی کامیابی کی ضامن نہیں ہوسکتیں —

کتاب میں تحریک آزادی کے سبھی مخالفوں کا قلع قمع کیا گیا ہے - حاکموں سے زیادہ لبرلوں اور فرقہ پرستوں کی خبر لی گئی ہے اور یہ ٹھیک بھی تھا کیونکہ ہر بدیسی راج کسی نہ کسی دیسی طبقے کے سہارے ہی زندہ رہتا ہے - کبھی کبھی ان کی گرم کلامی تلخی کی حد کو پہنچ جاتی ہے اور غالباً ان بزرگوں کو اس کی ضرورت بھی ہے —

جہاں کہیں پنڈت جی نے اپنے مصائب کا ذکر کیا ہے وہاں نہایت ضبط اور تحمل سے کام لیا ہے - یہیں ان کی ذہنی تہذیب کا اندازہ ہوتا ہے - دوستوں کی بیجا تعریف یا دشمنوں کے بیجا شکوہ سے حد درجہ پرہیز کیا ہے - البتہ گاندھی جی کی پیروی میں زرا غلو سے کام لیا ہے اور سبھاش بوس کے ذکر سے کچھہ احتراز کیا گیا ہے - رومن رسم خط کی تائید بہت دبی زبان سے کی گئی ہے - ہمیں اس کتاب میں ایک عیب یہ نظر آیا کہ بعض دعووں کا ثبوت نہ دے کر کہہ دیا ہے کہ جیل میں ضروری اسناد نہیں مل سکتے - مگر جیل کے باہر آسانی سے انہیں مہیا کیا جاسکتا تھا —

آزادیء ملک کے لیے سامراج شکن تحریک کی ناگزیریت پر بحث کرتے ہوے پنڈت جی اس بنیادی مسئلے کو بھول گئے ہیں کہ اس تحریک کی قیادت کس طبقے کے ہاتھہ میں ہوگی - کیونکہ ایک مارکسی کا نقطۂ نظر یہی ہوسکتا ہے کہ سامراج شکن تحریک اورقیام اشتراکیت کی تحریک مسلسل اور باہم وابستہ ہیں - سامراج کے مٹانے میں وہ طبقہ پیش پیش ہوگا جو اشتراکیت کا معمار ہے - مگر پنڈت جی نے اس مسئلے پر غور کرنے کی زحمت نہیں کی - ہمارے خیال میں یہ بڑی غلطی ہے کیونکہ اگر اس لڑائی کا پیشوا متوسط طبقہ ہوگیا تو اس کا انجام فاسطیت کی

شکل میں نمودار ہوگا - جس میں یہ تماشا ہوچکا ہے -

کتاب بہت دلچسپ پیرایے میں لکھی گئی ہے اور اردو ترجمے میں اصل انگریزی کی تمام خوبیوں کا لحاظ رکھا گیا ہے - خشک اور نزاعی مسائل کو بھی اتنے دلکش طریقے سے سلجھا کر لکھا ہے کہ جی نہیں اچٹتا - جو لوگ حال اور مستقبل کے ہندوستان کو سمجھنا چاہتے ہیں انہیں اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں مل سکتی - ہزار صفحے کی مصور اور مجلد کتاب کے دام صرف چار روپے رکھے گئے ہیں جو بہت کم ہیں -

" ناخدا "

متفرقات

فلسفۂ برگساں -

(از مہر حسن الدین صاحب بی - اے ایل ایل بی - قیمت ایک روپیہ ۴ آنے - ملنے کا پتا مکتبہ ابراہیمیہ - حیدرآباد دکن)

اقبال کی شاعری سے جسے تھوڑا سا بھی مس ہے اس نے برگساں کا نام ضرور سنا ہوگا - برگساں زمانۂ حاضر کا بہت بڑا مفکر ہے - اس کا فلسفہ ایک طرف برطانوی میکانیت اور دوسری طرف فرانسیسی مادیت کا رد عمل ہے - وہ تخلیقی ارتقاء کا قائل ہے لیکن اس کے عقب میں کسی قوت حیات (Elan Vital) کا ہاتھ دیکھتا ہے اور ارتقا کا کوئی نصب العین قرار دیتا ہے - وہ ظاہر کے خلاف باطن اور عقل کے خلاف وجدان اور جبلت کا علم بردار ہے - وہ مطلق العنان اور قادر مطلق " انا " کا حامی ہے - اگر اس کی تعلیم کو تھوڑا سا کھرچا جائے تو وہ نتشے کا ہمدوش نظر آتا ہے اور

'قوت حیات' کے نام پر زورآور کی حکومت اور کمزور کی فنا کا مدعی بن جاتا ہے —

بہر حال برگساں کی تعلیم اپنے اثرات کے لحاظ سے اہم ہے اور زیر نظر رسالہ بہت صفائی کے ساتھ اس کی تشریح کرتا ہے —

"ناخدا" -

خاص نمبر

ساقی -

(جہلم نمبر) بابت اکتوبر سنہ ۳۶ ع قیمت ۱۲ آنے -

ملنے کا پتا منیجر ساقی، کھاری باولی دہلی) -

رسالۂ ساقی اپنی جدت آفرینیوں کے لحاظ سے اس وقت اردو ماہناموں میں سب سے پیش پیش ہے - غالباً اس کے خاص نمبروں کی تعداد عام نمبروں سے زیادہ ہوتی ہے - اس کے باوجود ہر نمبر میں کوئی نئی بات ضرور ہوتی ہے —

پیش نظر نمبر اٹلی کے شاعر اعظم 'دانتے' کی جاوداں تصنیف (Divine Comedy) کے ترجمے کے لیے وقف ہے - ترجمے کے متعلق صرف یہ کہہ دینا کافی ہے کہ وہ مولوی عنایت اللہ صاحب کا کیا ہوا ہے - انگریزی زبان میں دانتے کے شاہکار کے کئی ترجمے ہیں جن میں (Cary) کا منظوم ترجمہ سب سے زیادہ مستند سمجھا جاتا ہے - عنایت اللہ صاحب نے اسے اردو میں منتقل کیا ہے اور اس کی مدد سے ضروری مقامات پر حاشیے بھی دیے ہیں —

اسی نظم کے بل پر دانتے کا شمار دنیا کے چھے سب سے بڑے ادیبوں میں ہوتا ہے - دانتے مسرت کا پیامی نہیں ہے - بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ انسان کو نیک و بد کی تمیز سمجھائے اور انہیں بتائے کہ بدی کی سزا کیا ہے - کہتے ہیں کہ دانتے نے جہنم کا تخیل اسپین کے مشہور عرب فلاسفر شیخ اکبر سے لیا تھا اور اس دعوے کے ثبوت میں زمانۂ حال میں کئی کتابیں بھی لکھی گئی ہیں - بعد میں متعدد ادیبوں نے دانتے سے استفادہ کیا - ان میں ملٹن کی 'پیریڈائیزلاسٹ' اقبال کا 'جاوید نامہ' اور مائیکل مدھو سودن دت کا 'میگھہ ناد ودہ' قابل ذکر ہیں --

رسالۂ ساقی نے اردو داں طبقے کو اس عظیم الشان کارنامے سے روشناس کرا کے اسے اپنا احسان مند کر لیا ہے --

"ناخدا"

شاہ جہاں -

(ترقی پسند نمبر) بابت اگست سنہ ۳۶ ع - قیمت ۴ آنے -

ملنے کا پتا - منیجر شاہجہاں دہلی) -

کچھہ عرصے سے 'انجمن ترقی پسند مصنفین' نامی ادبی مجلس کی داغ بیل پڑی ہے - اس کا مقصد یہ ہے کہ ادب میں حقیقت پسندی کے رجحان کو عام کرے اور حقیقت کو ترقی پسندی کا مفہوم دے - ملک میں کئی جگہ اس کی شاخیں کام کر رہی ہیں - ان میں دلی کی شاخ نے بہت نمایاں کام کیا ہے - یہ خاص نمبر ان مضامین پر مشتمل ہے جو اس کے جلسوں میں وقتاً فوقتاً پڑھے گئے تھے - یہ مجموعہ اس

دعوے کا ثبوت ہے کہ ہمارے ملک میں ایک نئی روح کروٹ لینے لگی ہے - منشی پریم چند آنجہانی اور ممتاز حسین صاحب کے مضامین اور انصار ناصری کے ڈرامے خاص طور پر قابل توجہ ہیں - جو لوگ اردو ادب کی نئی تحریک سے روشناس ہونا چاہتے ہیں انھیں یہ پرچہ ضرور دیکھنا چاہیے -

"ناخدا" -

مشورہ -

(اڈیٹر صبا اکبرآبادی - پروپرائٹر رعنا اکبرآبادی) -

اس رسالے نے جولائی سنہ حال میں آگرہ نمبر شایع کیا ہے جو بہت ضخیم ہے اور اس میں آگرے کے متعلق بہت سے مضامین پر از معلومات درج ہیں - یہ رسالہ درحقیقت جفت سازی اور جفت فروشی کی تجارت سے تعلق رکھتا ہے - اس کے پہلے حصے میں اگرچہ بعض مضامین آگرے کی تاریخ وغیرہ پر ہیں لیکن دوسرے مضامین تقریباً سب کے سب چمڑے کی تجارت جفت سازی و جفت فروشی اور اس کے متعلقات پر ہیں - یہ سب مضامین تین سو صفحے پر آئے ہیں - دوسرا حصہ آگرے کی ادبی تاریخ پر ہے - جسے نو دور پر تقسیم کیا گیا ہے - اور ہر دور کے شعرا کے حالات اور ان کے کلام کا انتخاب دیا گیا ہے - 'میر' سے لے کر بعد تک کے اکثر شعرا کے فوٹو بھی ہیں - یہ نہ معلوم ہوا کہ میر' نظیر' حاتم علی مہر کی تصویریں کہاں سے دستیاب ہوئیں اور وہ مستند بھی ہیں یا نہیں - مرزا غالب کی جوانی کی تصویر ہے' اس کے متعلق بھی کچھہ نہیں لکھا کہ کہاں سے ملی - تذکرے سرسری ہیں مگر دلچسپ ہیں' محققانہ نہیں -

اردو کے جدید رسالے

آئینۂ ادب -

(اڈیٹر سرنس احمد صاحب - عام قیمت سالانہ چار روپے - حیدرآباد دکن)

یہ حیدرآباد کا نیا ماہنامہ ہے اس میں ہر قسم کے ادبی ' علمی تاریخی مضامین شایع ہوتے ہیں - غزلیں بھی کافی تعداد میں ہوتی ہیں - ادبی دلچسپی کا اچھا مجموعہ ہے - تحقیقی مضامین عام رسالوں کی طرح بہت کم ہوتے ہیں —

شمیم -

(اڈیٹر علی اطہر صاحب بی - اے (علیگ) و یحیی نقوی بی - اے
پٹنہ - سالانہ چندہ تین روپے)

یہ ادبی ماہنامہ دو تعلیم یافتہ نوجوانوں کی ادارت میں پٹنے سے شایع ہوتا ہے - علاوہ ادبی مضامین کے بعض سیاسی امور پر بھی بحث ہوتی ہے - نظم اور فسانے اور ڈرامے سے بھی لطف ادب کا سامان مہیا کیا جاتا ہے - رسالہ احتیاط اور سلیقے سے مرتب کیا جاتا ہے - ہر رسالے میں کچھہ نہ کچھہ ایسے مضامین ہوتے ہیں جنھیں پڑھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں نے کچھہ حاصل نہیں کیا - بہار کو ایسے رسالوں کی ضرورت ہے اور ہمیں امید ہے کہ اہل بہار خاص کر اس کی قدر کریں گے —

اردو

فہرستِ مضامین

سولھویں جلد ـــــ سنہ ۱۹۳۶ ع

مقالے

نظم

ادبی معلومات

افکار و واقعات

تاریخ و سیر

مذہب و اخلاق

متفرقات

معاشیا

اردو کے جدید رسالے

خاص نمبر اور سالنامے

سائنس

انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ

جس کا مقصد یہ ہے کہ سائنس کے مسائل اور خیالات کو اردو دانوں میں مقبول کیا جائے، دنیا میں سائنس کے متعلق جو نئی بحثیں یا ایجادیں اور اختراعیں ہو رہی ہیں یا جو جدید انکشافات وقتاً فوقتاً ہوں گے ان کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے۔ ان تمام مسائل کو حتی الامکان صاف اور سلیس زبان میں بیان کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس سے اردو زبان کی ترقی اور اہل وطن کے خیالات میں روشنی اور وسعت پیدا کرنا مقصود ہے —

رسالے میں متعدد بلاک بھی شایع ہوتے ہیں —

سالانہ چندہ سات روپے سکۂ انگریزی (آٹھ روپے سکۂ عثمانیہ) نمونے کی قیمت ایک روپیہ بارہ آنے سکۂ انگریزی (یا دو روپے سکۂ عثمانیہ)۔

طلباء کے ساتھ یہ رعایت کی جاتی ہے کہ یہ رسالہ بہ تصدیق پرنسپل صاحب (یا ہیڈ ماسٹر صاحب) انہیں پانچ روپے چار آنے سکۂ انگریزی (چھ روپے سکۂ عثمانیہ) سالانہ چندے میں دیا جاتا ہے —

اُمید ہے کہ اُردو زبان کے بہی خواہ اور علم کے شائق اس کی سرپرستی فرمائیں گے —

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن

VOL. 16 OCTOBER 1936 No. 64

Urdu

The Quarterly Journal

OF

The Anjuman-i-Taraqqi-e-Urdu

EDITED BY

Abdul Haq, B. A., (Alig.)

HONORARY SECRETARY

Anjuman-i-Taraqqi-e-Urdu, Aurangabad, (Deccan).